بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطباتِ مفکرِ اسلام

﴿حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی﴾

(جلد اول)

جمع و ترتیب

محمد کاظم ندوی

ملنے کا پتہ

مکتبہ ایوب کاکوری۔ لکھنؤ

۲۲۷۱۰۷

بار اول

جنوری ۲۰۰۰ء

نام کتاب [illegible] اسلام

کمپوٹر کمپوزنگ [illegible] مسرور احمد ندوی

طباعت ——— آفسٹ انڈیا لکھنئو

قیمت ——— Rs. 120/=

باہتمام

محمد کاظم ندوی

ملنے کے دیگر پتے

☆ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام [illegible] ندوۃ العلماء لکھنئو

☆ مکتبہ حرمین مرکز والی مسجد کچہری روڈ لکھنئو

☆ مکتبہ ندویہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنئو

☆ مکتبہ الفرقان نظیر آباد لکھنئو

☆ مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنئو

☆ مکتبہ [illegible] کاکوری، لکھنئو

☆ مکتبہ [illegible] دیوبند، سہارنپور

فہرست مضامین

لا إلٰه إلاَّ اللّٰه

خودی کا سرِّ نہاں لا إلٰه إلاَّ اللّٰه
خودی ہے تیغ فساں لا إلٰه إلاَّ اللّٰه
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا إلٰه إلاَّ اللّٰه
کیاہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود وزیاں لا إلٰه إلاَّ اللّٰه
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ وپیوند
بتانِ وہم و گماں لا إلٰه إلاَّ اللّٰه
خرد ہوئی ہے زمان ومکاں کی زناری
نہ ہے زمین ومکاں لا إلٰه إلاَّ اللّٰه
یہ نغمہ فصلِ گل ولالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا إلٰه إلاَّ اللّٰه
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا إلٰه إلاَّ اللّٰه

(اقبالؔ)

ہمارا اظہارِ عقیدت

محمد کاظم ندوی

ہمارا [illegible]
سراپا ابرِ رحمت [illegible] ناز کرتی رہتی ہے
جس رخِ پُرنور [illegible] تجلی [illegible] ناز کرتی ہے
جمال [illegible] لالہ و گل [illegible] ناز [illegible] ہے
[illegible] مسرت ناز [illegible] ہے
وہی ہمارا صدیق اکبر ہیں جو یارِ غار کہلائے
انہیں کی ذاتِ اقدس پہ رفاقت ناز کرتی ہے
عمرؓ ہمارا [illegible] زریں [illegible] سبھی کو یاد ہے اب تک
[illegible] کے قول [illegible] فیصل [illegible] عدالت [illegible] ناز کرتی ہے
وہی ہمارا عثمانؓ غنی ہمارا جو ہیں [illegible] شہید [illegible] ملت بیضاء
غنیؓ کے [illegible] خلافت ناز کرتی ہے
علیؓ مرتضیٰ ہمارا ہمارا شیرِ خدا [illegible] داماد [illegible] پیغمبر
[illegible] علیؓ [illegible] ولایت ناز کرتی ہے
ہمارا حسینؓ [illegible] ابن علیؓ [illegible] حمزہؓ [illegible] جناب [illegible] سید الشہداء
شہیدانِ صحابہؓ پر شہادت ناز کرتی ہے
درِ اقدس کی جانب [illegible] کھنچا جاتا ہے اے کاظم
مرے اس جذبِ صادق پر عقیدت ناز کرتی ہے

عرضِ ناشر

"دار القلم" ایک تصنیفی واشاعتی ادارہ ہے، جس کے قیام کا مقصد ہی ہندو بیرون ہند کے علماء، فضلاء، اور مفکرین ومصنفین کی تصانیف وتالیفات کو زیور طبع سے آراستہ کرنا ہے۔

"دار القلم" اب تک متعدد کار آمد اور مفید کتابیں شائع کر چکا ہے۔ ارباب حل وعقد اور علوم وفنون [illegible] گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے والوں نے "دار القلم" کی مطبو[illegible] تعریف [illegible] تحسین فرمائی ہے۔ اور اہل ذوق ان کتب سے بھر پور استفادہ کر ر[illegible]

"دار القلم" اس وقت مخدومی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی أدام الله بقاءه طولَ حیاتی کی تازہ ترین کتاب "خطباتِ مفکر اسلام" مئولفہ جناب محمد کاظم صاحب ندوی کی پہلی جلد قارئین اور اہلِ علم کی خدمت میں پیش کر رہا ہے، اسکے بعد ہی اسکی دیگر جلدیں منظر عام پر وقتاً فوقتاً آتی رہیں گی،

"دار القلم" کے خدام نے اس کتاب کو خوب سے خوب تر بنانے کی سعی اور کوشش کی ہے، پھر بھی کتابت وطباعت کی غلطیوں کا امکان باقی رہتا ہے، اگر اس قسم کی کوئی خامی یا غلطی نظر آئے تو ادارہ کے خدام کو مطلع کرنے کی زحمت گوارہ فرمائیں گے، تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اسکی صحت کی طرف توجہ کی جاسکے۔

خدا کرے یہ کتاب علمی حلقوں میں قبولیت کی لازوال دولت سے مالامال ہو۔ اور مصنف کے لئے ذخیرۂ آخرت ثابت ہو۔

والسلام

محمد عاصم

منیجر دار القلم ڈھاکہ

مورخہ ۹/ ۸/ ۱۹۹۹ء

مطابق

۲۷/ ۹/ ۱۴۲۰ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مؤلف

اللہ رب العزت کا کرم اور اسکا احسان عظیم ہے کہ اس نے اس ناچیز قلم کار کو مفکر اسلام، استاذ الاساتذہ، حضرت مخدوم مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی ندوی دام مجدہ کے نصف صدی پر پھیلے ہوئے خطبات کو جمع کرنے اور اسکو ترتیب دینے کی سعادت اور توفیق عطا کی ورنہ ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیم صبح تیری مہربانی

مفکر اسلام حضرت مولانا مدظلہ العالی کے خطبات کی جمع وترتیب کے دوران اس امر کو قصداً نظر انداز کردیا گیاہے کہ اسکی تیار شدہ علٰحدہ علٰحدہ جلدیں، ایک ہی قسم کے مضامین پر مشتمل ہوں۔ بلکہ "ہر گلے را رنگے" کے پیش نظر ہر جلد میں مختلف عنوانات پر مختلف مضامین شامل کئے گئے ہیں، تاکہ صاحبانِ مطالعہ کے ذوق وشوق میں کمی اور طبیعتوں میں اکتاہٹ کا احساس نہ ہو، اور وہ ہر جلد میں نئے نئے عنوانات پر مضامین کا مطالعہ کرتے رہیں۔۔۔ یہ بات اس جگہ اس لئے ذکر کردی گئی تاکہ ارباب حل وعقد اور علم وادب کا کوئی خوشہ چیں یہ نہ کہہ سکے، کہ خطبات کی الگ الگ جلدیں ایک ایک قسم کے مضامین پر مشتمل ہونی چاہئے تھی۔

یہ خیال ایک حد تک صحیح بھی ہے اور مناسب بھی، اور اس طرح کی چیزیں منظر عام پر آئی بھی ہیں، مگر انکی نقالی اور انکے تتبع سے قصداً گریز کیا گیا ہے،

خدا کرے مفکر اسلام مدظلہ العالی کے خطبات کی جلد اول کی جمع و ترتیب قارئین اور علم دوست حضرات کو پسند آئے، اور وہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیکر اگلی جلدوں کو منظر عام پر لانے میں مؤلف اور ناشر کی ہر طرح سے ہمت افزائی کریں۔

میں صمیم قلب سے شکر گزار ہوں صاحبِ خطبات، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی الحسنی ندوی ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء کا جنہوں نے اس کتاب کی جمع و ترتیب کو سراہا، اور اس کے لئے اپنا قیمتی پیغام عنایت فرمایا جو اس کتاب کے لئے کلمۂ افتتاح ہے، اسی طرح میں دل کی گہرائی سے ممنون و مشکور ہوں اپنے استاذ گرامی حضرت مولانا محمد رابع حسنی صاحب ندوی، مہتمم و نائب ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء کا، جنہوں نے میرے اس کام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، میری ہمت افزائی کی، اور اس کتاب کے لئے ایک گرانقدر تحریر عنایت فرمائی، جو "پیش لفظ" کے عنوان سے اس کتاب کی زینت ہے۔ اللہ تعالیٰ دونوں بزرگوں کی عمر میں برکت عطا کرے اور ان کے فیوض و برکات سے تمام امت مسلمہ کو مستفید فرمائے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیغام

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ العالی

عزیزی مولانا محمد کاظم ندوی نے میرے خطبات کو جن کی مجھکو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف موقعوں اور مختلف مقاصد سے توفیق ملی، جمع کر کے شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ میں نے اپنے خطبات اور تقریروں میں برابر ملت کی ضرورت کے تقاضوں اور اصلاح ودعوت کا لحاظ رکھنے کو پیش نظر رکھا ہے، ان تقریروں اور خطبات میں اگر افادیت تھی، تو سابق کی طرح وہ اب بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس طرح مجھے امید ہے کہ ان کی اشاعت دعوت واصلاح کے مقصد کے لئے معاون اور مفید ہوگی۔

میں عزیزی مولانا محمد کاظم صاحب ندوی کے اس کام کو سراہتا ہوں، اور دعاء کرتا ہوں کہ یہ مفید ہو، اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے۔ آمین

ابوالحسن علی ندوی

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

۱۲/۱۱/۱۹۹۹ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

از قلم

حضرت مولانا محمد رابع صاحب ندوی

(مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنئو)

خطابت کا عمل بہت پرانا ہے، خطبات میں افکار اور احساسات دونوں کا حصہ ہوتا ہے، اسی لئے اہل علم اور عوام دونوں میں اس کو کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔

خطابت، خطاب کے اختیار کرنے والے کی دینی وادبی مشق اور فکری صلاحیت کی مقدار کے لحاظ سے اثر کرالیتی ہے۔

زوردار خطابت اپنے سامعین کے جذبات اور ذہنی کیفیات میں اضطراب بلکہ تغیر پیدا کردیتی ہے، اس کے ذریعہ قائدین اور رہنماؤں، حاکموں اور سماجی کام کرنے والوں نے ہر دور میں بہت فائدہ اٹھایا ہے، اور وقتاً فوقتاً ذہنی اور جذباتی انقلاب کا باعث بنی ہے، اس کی تاریخ طویل ہے، یہاں اس کی تفصیل اور مثالوں کا موقع نہیں ہے۔

یہاں اس مجموعۂ علمی وادبی کے متعلق چند الفاظ میں کچھ عرض کرنا ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صرف ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ پورے عالم اسلام میں اپنی فکری، دعوتی اور ادبی کاموں اور ان کی اثر پزیری میں شہرت رکھتے ہیں، انہوں نے قلم اور زبان دونوں سے اپنے مخاطبین پر اثر ڈالا ہے، ان کے قلم کے اثرات تو ان کی تصنیفات میں بآسانی دیکھے جاسکتے ہیں، البتہ ان کی زبان کے اثرات جو ان کے خطبات کے ذریعہ پیدا ہوتے، خطبات کے عام طور پر قلمبند نہ ہونے سے زیادہ محفوظ نہیں ہوسکے تھے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے عزیز مکرم مولانا محمد کاظم ندوی کو کہ ان کو اس کام کا احساس ہوا، اور انہوں نے حضرت مولانا مدظلہ العالی کے خطبات جمع کیے، اور اب ان کو شائع کر رہے ہیں، اس طرح حضرت مولانا کے ان خطبات کے اثرات تادیر کام کرسکیں گے، یہ ایک مفید علمی وادبی کام تھا، جس کی عزیز مکرم مولانا محمد کاظم ندوی کو توفیق مل رہی ہے۔

مولانا محمد کاظم صاحب ندوی صرف مدرس واستاذ ہی نہیں ہیں، بلکہ بڑے صاحب علم اور صاحب قلم ہیں، مختلف موضوعات پر ان کی مفید اور کارآمد تصنیفات ہیں، انہوں نے عام طور پر طلبہ اور نوخیز اہل علم کی دینی وعلمی تربیت کے مقصد کو سامنے رکھا ہے، اور عام مسلمانوں کے فائدے کی فکر کی ہے، اس طرح ان کی تصنیفات علمی وتربیتی مقصد کے لئے بہت مفید ہیں، ان کی علمی کاوشوں میں ان کی یہ کاوش کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے خطبات کو جمع کرکے شائع کر رہے ہیں، بہت ہی مفید اور کارآمد عمل ہے، خاص طور پر اس لئے بھی کہ حضرت مولانا مدظلہ کی علمی وادبی شخصیت متنوع پہلوؤں کی حامل ہے،

اس میں دعوتی و اصلاحی پہلو بھی پوری طرح کار فرما ہے، اور علمی و فکری پہلو بھی پوری طرح نمایاں ہے، اور تعلیمی و تربیتی انداز بھی پوری طرح پایا جاتا ہے، اس طرح ان کی تقریریں و تحریریں دونوں کاوشیں امت کے لئے بہت مفید اور بہت اثر کی حامل ہیں،

اللہ تعالیٰ مولانا محمد کاظم صاحب ندوی کے اس عمل کو قبول فرمائے، اور زیادہ سے زیادہ مفید بنائے، آمین

محمد رابع حسنی ندوی
۲۳ رشعبان ۱۴۲۰ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبات اور صاحبِ خطبات

﴿از قلم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مؤلف﴾

"خطبہ" عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی تقریر اور اسپیچ کے ہیں، اسکی جمع "خطبات" اور خطب ہے،

تقریر کی تقریباً ہر زمانہ میں اہمیت رہی ہے، جس کا کوئی بھی منصف مزاج فرد انکار نہیں کر سکتا، اگر چہ اس کے مقاصد اور تقاضوں میں کچھ فرق رہا ہے،

استاذ گرامی حضرت مولانا محمد رابع صاحب ندوی اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں،

" عربوں کے عہد جاہلی کے ادب میں شاعری کے بعد دوسری نمایاں قسم خطابت تھی، جو عام طور پر مجمع کو متاثر کرنے کے لئے یا سفارت پر بھیجے جانے والے افراد کے لئے تھی، اور اسکا استعمال عام طور پر افراد قبیلہ کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لئے یا دوسرے قبائل میں اپنے قبائل کی عظمت ظاہر و ثابت کرنے

کے لئے تھا، اسی لئے عام طور پر ہر قبیلہ میں ایک شاعر کے ساتھ ایک خطیب بھی ہوتا تھا۔عہد جاہلیت کے مشہور خطیبوں میں عمرو بن معد یکرب، قس بن ساعدہ الایادی، اور عہد اموی کے سحبان بن وائل قابل ذکر ہیں"۔(جزیرۃ العرب ص۔۔۔۔۔۔۱۹۲)

تقریر اور خطابت کا ملکہ خداداد ہوتا ہے، اس میں کسب کو بہت کم دخل ہوتا ہے، لیکن اسکا ہر گز ہر گز یہ مطلب نہیں کہ مشق و تمرین بالکل ہی مہمل اور بے کار چیزیں ہیں. بلکہ حقیقت تو یہی ہے کہ اکثر و بیشتر چیزیں مشق و تمرین کی رہینِ منت ہیں، تاریخ میں ایسے بہت سے مقررین کے نام محفوظ اور ثبت ہیں جنہوں نے اپنی سعی مسلسل اور بلیغ کوشش و جدو جہد سے مقررین کی فہرست میں اپنانام درج کرالیا، اور دنیا میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کیا، "ابراہیم لنکن" کا نام آپ نے سنا ہوگا، وہ سمندر کے کنارے کھڑا ہو کر سمندر کی موجوں کو اپنی تقریر سنایا کرتا تھا، اور وہ کہا کرتا تھا کہ یا تو میری آواز سمندر کی موجوں کی آواز پر غالب آجائے یا اسکی آواز میری آواز پر غلبہ پا جائے، بالآخر اسے کامیابی حاصل ہوئی، اور وہ دنیا کے سامنے ایک عظیم مقرر بن کر جلوہ افروز ہوا، اور اسکی محنت، لگن، جدوجہد اور بلیغ سعی نے اسکو امریکہ کا صدر بنا کر "وہائٹ ہاؤس" تک پہنچادیا،

تقریر کرنے والے اور اپنی خطابت کا جوہر دکھانے والے تقریباً ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں، اور انہوں نے اپنی جودتِ طبع، فصاحت وبلاغت، متانتِ اسلوب، حلاوتِ لفظ، زورِ بیان اور قوتِ تاثیر کا لوگوں کے دلوں پر سکہ جمایا، اور اپنی ٹھوس صلاحیتوں، علمی لیاقتوں اور فاضلانہ قابلیتوں سے لوگوں کے

دل جیت لئے،

زمانۂ جاہلیت میں خطابت کا بہت زیادہ چرچہ اور شہرہ تھا، عرب بچپن ہی سے اپنے بچوں میں خطابت و تقریر کا ملکہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے،

حسن زیات لکھتے ہیں،

"انکی (عربوں کی) دلی خواہش تھی کہ ہر قبیلہ میں ایک مقرر اور ایک شاعر ہو، جو انکی تقویت کا باعث اور انکے ذکر بلند کرنے کا سبب ہو، چنانچہ کبھی کبھی یہ صفات ایک شخص میں بھی جمع ہو جاتی تھیں، اپنی تقریروں میں وہ دل نشیں اسلوب، سحر بیانی، سلیس عبارت، خوشنما الفاظ، صاف صاف باتیں، چھوٹے چھوٹے ہم وزن مسجع جملے، اور زیادہ ضرب الأمثال استعمال کرتے تھے، مضمون ذہن نشیں کرانے اور ہر دل عزیز بنانے کے لئے تقریروں میں اختصار کو مد نظر رکھتے تھے، عربوں میں دستور تھا کہ مقرر اونچی جگہ کھڑے ہو کر یا سواری پر بیٹھ کر تقریر کرتا، اثناءِ تقریر ہاتھ ہلاتا، مناسب اشاروں سے مفہوم کو واضح کرتا، ہاتھ میں عصا یا نیزہ اور تلوار کا سہارا لیتا یا ان سے اشارہ کرنا بھی انکے یہاں رائج تھا"

مزید لکھتے ہیں کہ۔

"وہ مقرر ان میں درجہ قبولیت حاصل کر لیتا تھا جو خوش وضع اور خوش شکل ہونے کے ساتھ بلند آواز، خوش بیان، دلیر اور بے باک ہوتا، زمانۂ جاہلیت میں انکے مشہور قابل

ذکر مقررین قس بن ساعدہ الساعدی ، عمرو بن کلثوم التغلبی، اکثم بن صیفی تمیمی، حارث بن عباد الیکری، قیس بن زهیر العبسی ، عمر و بن معد یکرب الزهیدی ہیں"(تاریخ ادب عربی ص۔۔۔۔۲۲)

اسلام آیا تو اس نے فنِ خطابت کو اوجِ کمال پر پہنچادیا، اس دَور میں فن خطابت نے بہت زبر دست ترقی کی، خود سرورِ کائنات ﷺ سب سے بڑے خطیب ومقرر تھے، آپؐ کے بعد خلافت کا دَور شروع ہوا، تو خلفائے اربعہ میں حضرت ابو بکرؓ صدیق، حضرت عمر فاروق، اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے خطابت کے جوہر دکھائے، خلافت راشدہ کے بعد بنی امیہ کی خلافت کا زمانہ آیا، تو اس دور میں سحبان بن وائل، زیاد بن ابیہ، حجاج بن یوسف ثقفی اور قطری بن فجاءہؒ نے تقاریر کے وہ نادر نمونے پیش کئے جو دوسروں کے لئے مشعلِ راہ ہیں،

تاریخ ادب عربی میں سحبان بن وائل کا ایک عجیب و غریب واقعہ مرقوم ہے جو اس کی قوت وجرأت، وسعت معلومات اور ندرت خطابت پر دلیل ہے۔ واقعہ کی تفصیلات اس طرح ہیں،

"خراسان سے ایک وفد حضرت امیر معاویہؓ کے پاس آیا، تو انہوں نے سحبان کو بلوایا، وہ اپنے گھر میں نہ تھا، فوراً ہی اُسے تلاش کے بعد حاضر کیا گیا، جب وہ آیا تو حضرت معاویہؓ نے کہا کہ " تقریر کرو" اسنے کہا، "میرے لئے عصا لاؤ" لوگوں نے کہا "امیر المؤمنین کی موجودگی میں عصا سے کیا کروگے ؟" اس نے جواب دیا "وہی جو موسیٰ اپنے رب سے باتیں کرتے وقت کیا کرتے تھے، حضرت معاویہؓ ہنسے اور اسکے لئے عصا لانے کا حکم دیا، جب عصا آیا تو اسنے ناپسند کیا اور لات ماردی،

چنانچہ لوگوں نے اُسے اس کا عصا لا کر دیا، پھر اسنے یعنی سحبان نے ظہر سے عصر تک تقریر کی، اس دوران نہ تو کھنکارا، نہ کھانسا، نہ کہیں کچھ سوچنے کے لئے رُکا، نہ کسی موضوع کو تشنہ وناکمل چھوڑ کر آگے بڑھا، اسکی یہ حالت دیکھ کر حاضرین حیرت میں رہ گئے، پھر حضرت امیر معاویہ نے اُسے ہاتھ سے تقریر ختم کرنے کا اشارہ کیا، سحبان نے اشارہ سے کہا، کہ "مجھے نہ روکئے" معاویہؓ نے کہا، "نماز کا وقت ہو گیا" اس نے کہا "نماز میں دیر ہے، حمد و صلوٰۃ اور وعد و عید میں مشغول ہیں، معاویہؓ نے کہا، "واقعی تو عرب کے سب سے بڑے خطیب ہو"۔ سحبان نے کہا، "نہ صرف عرب کا بلکہ عجم کا اور جن وانس کا بھی"

خلافتِ بنی امیہ کے بعد بنو عباس کا دورِ خلافت آیا اس دور کے آغاز میں خطابت کو بڑی منزلت اور لوگوں کے دلوں پر اس کو بڑا اقتدار حاصل تھا، پہلے خلفاء اور انکا پروپگنڈہ کرنے والوں مثلاً منصور، مہدی، رشید مامون، داؤد بن علی، خالد بن صفوان اور شبیب بن شیبہ میں اس فن کی بڑی اہمیت اور اسکا بڑا ملکہ موجود تھا،

لیکن جب حکومت وسلطنت کی باگ ڈور پوری طرح بنو عباس کے ہاتھ میں آگئی، حکومت کی سیاست اور لشکر کی قیادت کا انتظام موالیوں نے سنبھالا، نیزوں اور زبانوں سے مقابلہ بازی میں کمی ہوئی، تو فنِ خطابت پر دستگاہ نہ حاصل ہونے اور اسکی ضرورت باقی نہ رہنے کی وجہ سے یہ فن زوال پزیر ہونے لگا، انہوں نے بڑے بڑے معاملات طے کرنے، آپس کی عداوتیں دور کرنے کے لئے مکاتبت اور شاہی فرامین نے تقریروں کی جگہ لے لی، خطبات صرف جمعہ وعیدین اور نکاح کے موقعوں تک محدود رہ گئے، تاہم خلیفہ راضی کے زمانہ تک خلفاء

بذاتِ خود تقریریں کرتے اور نمازیں پڑھاتے رہے، لیکن جب خاندان بویہ نے اپنے غلبہ کے بعد ان کے ہاتھ جکڑ کر انہیں انکے گھروں میں نظر بند کردیا، تو خطابت وامامت کا منصب بھی انہوں نے قابل اور ہوشیار علماء کے سپرد کردیا چنانچہ اس دور کے آخر میں مقرروں اور ادیبوں کی ایک جماعت خطیب بغدادی اور خطیب تبریزی جیسے حضرات پر مشتمل تیار ہوگئی تھی۔

تاریخ ادب عربی میں ایک باب وہ بھی ہے جسے "دور جدید" کہا جاتا ہے۔ اس دور میں بھی عربی زبان وادب میں بھی چند مقرروں کے نام لئے جاتے ہیں، جنہوں نے اپنی خطابت اور زورِ بیان سے لوگوں کے دلوں پر حکومت کی ہے۔ ان مقررین اور خطباء میں عبد اللہ ندیم، سعد زغلول، اور مصطفیٰ کامل کے نام تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں،

ہندوستان میں بھی ایک سے ایک خطیب اور مقرر پیدا ہوئے، جنہوں نے اس فن میں کمال حاصل کیا، علماء اور فضلاء میں مولانا ابو الکلام آزاد، عطاء اللہ شاہ بخاری، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسین احمد مدنی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا ابو الوفا شاہجہاں پوری، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا منت اللہ رحمانی اور مولانا محمد منظور نعمانی صاحبان وغیرہم مشہور ومعروف ہیں، اسی طرح ہندوستان کے سلاطین اور حکمرانوں میں سلطنت مغلیہ کا بانی "بابر" اور اسی سلطنت کا ایک عظیم حکمراں شیر شاہ سوری کا ذکر بھی باکمال مقررین کی فہرست میں درج ہے۔ ہندوستان کے دیگر فرماں رواؤں میں مہارانی لکشمی بائی، اور پنڈت جواہر لال نہرو اور مفکرین، دانشوروں اور رہنماؤں میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

کے بانی سر سید احمد خاں مرحوم بھی اپنی خطابت میں آپ اپنی مثال تھے،

آج مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی دام مجدہ جن کی جامع، متنوع، ہمہ گیر، علمی وتحقیقی اور شاندار وشاہکار نیز فکر انگیز تقریریں آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے، عالمی سطح پر آسمانِ خطابت کے ایسے نیر تاباں ہیں، جن کی پر نور اور ضیاء بار شعاعوں سے ساری دنیا فیضیاب ہو رہی ہے۔

صاحبِ خطبات

صاحبِ خطبات مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی میاں ندوی اَطَا لَ اللہُ بقاءَ ہ کے مختصر حالاتِ زندگی ہم اگلے صفحات میں قلمبند کرنے کی سعی اور کوشش کریں گے۔ مگر اس سے پہلے ایک اسکالر ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی کی چند سطریں حضرت مولانا کی شخصیت کے بارے میں ملاحظہ فرمالیں۔ تاکہ اسی بنیاد پر کچھ آگے لکھا جاسکے۔

جناب ڈاکٹر صاحب مجلّہ "الشارق" کے ایک ادارتی کالم میں رقمطراز ہیں،

"حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کو آسمان علم ومعرفت کی اس کہکشاں میں بلا شبہ کوکبِ تاباں کی حیثیت حاصل ہے، جامعیت، تنوع، اور ہمہ گیری میں انکی نظیر معاصرین میں کم یاب ہے، انکا اہم ترین کارنامہ یہ ہے، کہ انہوں نے علم وتحقیق کو ایک مقصدیت عطا کی ہے، ان کی ہر تقریر وتحریر اور ہر نشاط وحرکت کا محور، محض دعوت وتبلیغ اسلام ہے ایمان وعقیدہ کی پختگی، زہد وتقویٰ کی پاکیزگی اور سیرت وکردار کی بلندی حضرت اقدس مدظلہ کی کتاب شخصیت

کے روشن عنوانات ہیں، جن کے جلوے ہر جگہ نظر افروز ہوتے ہیں“

مزید تحریر فرماتے ہیں۔

” آج حضرت اقدس مولانا علی میاں مدظلہ کی شخصیت اپنے گوناگوں اور متنوع کمالات اور ہمہ جہت علمی ودعوتی خدمات کے باعث تمام جغرافیائی حدود سے ماوراء ہوکر عرصۂ عالم پر محیط ہو چکی ہے۔ انکی بلند پایہ تصانیف کی بوئے عنبریں سے آج مشام عالم معطر ہو رہا ہے، خانہ کعبہ کی کلید برداری کا شرف تو بلاشبہ ان کی کلاہِ افتخار کا در ثمین ہے، لیکن تمام دنیاوی اعزازات سے ان کی عظیم شخصیت ارفع واعلیٰ ہو چکی ہے، خواہ وہ فیصل ایوارڈ ہو یا ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند، عالم اسلام کے مختلف اداروں کی حیاتی رکنیت ہو یا عالمی تحریکوں کی سربراہی، ان تمام اعزازات نے حضرت اقدس مدظلہ کی شخصیت کے بجائے خود اپنی عظمت او رقدر وقیمت میں اضافہ کیا ہے، ۷ جنوری ۹۹ء کی شب میں حکومت دبئی نے حضرت اقدس کی خدمت میں ۹۸ء کی اسلامی شخصیت، کا ایوارڈ تفویض کرکے اپنی بصیرت اور مردم شناسی کا ثبوت دیا ہے“

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی اس خانوادہ کے چشم وچراغ ہیں، جس کے بزرگوں نے علم ومعرفت کی شمعیں فروزاں کی ہیں، اور جس

کے مجاہدوں نے انگریزوں کے خلاف علَم جہاد بلند کر کے شہادت کی لازوال دولت حاصل کی ہے شاہ علم اللہ حسنی، سید احمد شہید، علامہ عبدالحی حسنی، ڈاکٹر عبدالعلی، خیر النساء بہتر، اور امتہ اللہ تسنیم کی ذوات عالیہ سے کون ناواقف ہے۔

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الندوی کے حالات زندگی

رفیق گرامی جناب مولانا ابو سحبان ندوی نے اپنے ایک عربی مضمون "العلامہ الشریف السید عبد الحی بن فخر الدین رائے بریلوی" (۱۲۸۶ء۔۱۳۴۱ھ) کے عنوان کے تحت مختصر روشنی ڈالی ہے۔ جو دار العلوم ندوۃ العلماء کے عربی مستند رسالہ ماھنامہ "البعث الاسلامی" کے فروری ۱۹۹۹ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے، اسی مضمون کو سامنے رکھ کر اور اس میں کچھ ترمیم و تخفیف اور حذف و اضافہ کر کے اردو میں اسی جگہ پیش کر رہا ہوں۔ تاکہ حضرت مولانا دام مجدہ کے حالاتِ زندگی کے کچھ اہم پہلو سامنے آجائیں۔

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی الندویؒ اپنے بھائی بہنوں میں عمر کے لحاظ سے سب سے چھوٹے تھے، مگر اپنے علم و فضل کے اعتبار سے ان میں سب سے بڑے تھے، آپ کے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے بھائی بزرگ عالم دین اور ماہر طبیب وڈاکٹر حضرت گرامی سید عبدالعلی بن عبدالحیؒ بن فخر الدین بن عبدالعلی الحسنی لکھنوی تھے، جو ایک عرصہ تک دار العلوم ندوۃ العلماء کے ناظم بھی رہے، قدرت نے انکو دینی اور عصری علوم و فنون میں دسترس عطا فرمایا تھا، اور طبابت و حکمت میں دستِ شفا کی دولت لازوال سے مالامال کیا تھا، آپ کی دونوں بہنوں میں ایک حضرت "اَمۃُ العزیز" تھیں، جو اپنے

تقویٰ وطہارت، علم و فضل، عبادت وریاضت، اور جود سخا میں یکتائے روزگار تھیں، دوسری بہن ممتاز قلم کار، ادیبہ وشاعرہ حضرت "اَمۃ اللہ تسنیم" تھیں، جو اپنے خاندان میں "عائشہ بی" کے عرفی نام سے مشہور تھیں، انکی شاہکار اور مشہور زمانہ کتابیں "بچوں کی قصص الانبیاء" اور خاص طور سے اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت پر ہمارے حضورؐ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں اہل علم اور ارباب حل وعقد سے خراج تحسین حاصل کررہی ہیں، امت مسلمہ کے بچے، بوڑھے، جوان سب ہی ان کتب سے فیضیاب ہورہے ہیں، امام نووی کی مشہور زمانہ اور شہرۂ آفاق کتاب "ریاض الصالحین" کا انہوں نے ترجمہ کیا، یہ ترجمہ بھی "زادِ سفر" کے نام سے مرجع خلائق ہے۔ اللہ رب العزت نے اس کتاب کو سندِ قبولیت عطا کی ہے۔ اللھم زد فزد۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۶ محرم الحرام ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء کو رائے بریلی میں پیدا ہوئے وہیں پرورش وپرداخت ہوئی، اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں وہیں پڑھیں، اور کچھ لکھنا بھی سیکھا۔ اس دوران رائے بریلی اور لکھنؤ آتے جاتے رہے، اکثر وبیشتر قیام لکھنؤ ہی میں رہا، جہاں آپ کے والد ماجد حضرت مولانا عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ طبابت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی نظامت کے فرائض کی ادائیگی اور کارہائے مفوضہ کی انجام دہی میں شب وروز مصروف ومشغول تھے۔

جب حضرت مولانا کی عمر آٹھ سال کی ہوئی، تو ۱۵ جمادی الآخر ۱۳۴۱ھ مطابق ۲ فروری ۱۹۲۳ء میں آپ کے والد ماجد نے اس دار فانی کو خیر باد کہا، اور دار بقا کی راہ لی، اب آپ اپنی والدہ ماجدہ حضرت خیر النساء بہتؔر کے ساتھ رائے بریلی اپنے وطن لوٹ گئے، اور وہیں اپنی والدہ کے زیر سایہ اور انکے دامن

تربیت میں رہ کر اپنی ابتدائی تعلیم جاری رکھی۔ اردو کی تکمیل کی، اور فارسی میں بھی مہارت تامہ حاصل کی، پھر لکھنؤ تشریف لائے۔ اور اپنے بڑے بھائی حضرت گرامی جناب ڈاکٹر عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کفالت اور نگرانی میں پلے بڑھے، جوان ہوئے، اور علوم وفنون کی ارتقائی منزلوں کو طے کیا، انگریزی کی بھی تعلیم حاصل کی، فارسی زبان میں اتنی مزید صلاحیت پیدا کرلی کہ فارسی زبان کے کتب خانوں کو کھنگالنا اور براہ راست فارسی زبان میں موجود سیر وتراجم اور حقائق ومعارف کی تمام کتابوں کا مطالعہ کرنا آپ کے لئے آسان اور ممکن ہوگیا۔

عربی زبان وادب کی شروعات اپنے فاضل استاذ شیخ خلیل بن محمد حسین بن محسن الانصاری سے کی، اور آپ ایک مدت تک اپنے استاذ کے ساتھ رہے، ابتدائی مرحلہ میں شیخ آپ کے لئے علم صرف کے کچھ قواعد وغیرہ ایک کاپی پر لکھ دیتے، جن کو حضرت مولانا زبانی ازبر یاد کرلیتے، پھر آپ نے اپنے استاذ حضرت شیخ خلیل عرب سے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں، اور ان سے بھرپور استفادہ کیا۔

"مدارج القراۃ" تین حصے، "الطریقة المبتکرۃ" چار حصے اور عبداللہ بن مقفع کی مایہ ناز کتاب "کلیلہ دمنہ" اور مجموعة النظم والنشر للحفظ والتسمیع" فن نحو میں علامہ ابوالحسن جزری کی کتاب "جزری" عربی زبان وادب میں شریف رضی کی جانب منسوب کتاب "نهج البلاغة" علامہ ابوالقاسم الحریری کی مشہور ترین کتاب "مقامات حریری" اور علامہ کی "دلائل الاعجاز" اسی طرح "عشر قصائد" بھی۔

حضرت خواجہ عبدالحئی فاروقی جو اس زمانہ میں جامعہ ملیہ دہلی میں تفسیر کے استاذ تھے، وہ حضرت مولانا کے والد کے دوستوں میں تھے، انکی لکھنؤ آمد پر

حضرت مولانا نے ان سے قرآن پاک کے آخری پارے کی چند سورتوں کی تفسیر پڑھی، اور اپنے پھوپھا حضرت سید طلحہ بن محمد صاحب سے عربی زبان وادب کے قواعد کا علم حاصل کیا، اور ان سے بھرپور استفادہ کیا،

حضرت مولانا مدظلہ العالی اگست ۱۹۲۷ء میں عصری علوم کی مستند درسگاہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ مشرقیہ کے درجۂ فاضل ادب عربی میں داخل ہو کر اپریل ۱۹۲۸ء کے امتحان میں شریک ہوئے، مگر بدقسمتی سے اس امتحان میں ناکام رہے، پھر اپریل ۱۹۲۹ء میں دوبارہ اسی درجہ کے امتحان میں شرکت کی اور امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کی، اور یونیورسٹی کی جانب سے انعامات اور گولڈ مڈل سے سرفراز کئے گئے، پھر آپ نے اسی ادارہ سے درجہ فضیلت حدیث میں داخل ہو کر امتیازی نمبرات سے کامیابی وکامرانی حاصل کی۔ پھر اپنی پھوپی سیدہ شمس النساء بنت سید فخر الدین خیالؔی کے تقاضہ اور اصرار پر آپ نے لاہور (پاکستان) کا سفر کیا، جہاں آپ کے پھوپا حضرت سید طلحہ صاحب "کلیۂ شرقیہ" میں عربی کے استاذ اور لکچرر تھے، اس سفر میں حضرت مولانا ممدوح نے کبارِ اعیان واعلام اور مشاہیر شعراء سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، علماء اور فضلاء میں مشہور مفسر قرآن حضرت شیخ احمد علی لاہوری اور شعراء میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؔ اور شاہنامہ اسلام کے خالق جناب حفیظؔ جالندھری قابل ذکر ہیں،

لاہور کے سفر سے واپسی پر جولائی ہی میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں فقیہ ومحدث کبیر شیخ حیدر حسن خاں افغانی جو علامہ محدث حسین بن محسن الانصاری یمنی اور محدث جلیل شیخ نذیر حسن بہاری دہلوی کے شاگرد رشید تھے، ان کے درس حدیث میں شریک ہوئے، آپ نے شیخ حیدر حسن خاں صاحب

سے ''صحیح بخاری''، ''صحیح مسلم''، ''سنن ابو داؤد اور ترمذی شریف حرفاً حرفاً پڑھا۔ اور کچھ تفسیر بیضاوی بھی پڑھی۔ اور منطق کے کچھ اسباق بھی پڑھے۔ پھر آپ علامہ ڈاکٹر محمد تقی الدین بن عبدالقادر ہلالی مراکشی کی صحبت میں رہے اور انکی علمی مجلسوں اور ان کے فیوض وبرکات سے بہرہ ور ہوئے، اور ان کے علوم وفنون سے بھر پور استفادہ کیا، اور ان سے نابغہ ذبیانی کا دیوان پڑھا پھر دوبارہ مفسّر قرآن حضرت شیخ احمد لاہوری سے استفادہ کے لئے لاہور کا سفر کیا، اور اس سفر میں شیخ سے سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر پڑھی، آپ کو شیخ کی تفسیر کا درس اتنا پسند آیا کہ آپ نے ۱۹۳۱ء میں تیسری مرتبہ پھر لاہور کا سفر کیا، اور اس مرتبہ آپ نے شیخ سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی معرکۃ الآرا کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کا درس لیا۔ اور واپس آگئے، پھر آپ نے اسی سال آخری مرتبہ لاہور کا سفر کیا۔ اس دفعہ آپ نے مدرسہ ''قاسم العلوم'' میں قیام کیا۔ یہ مدرسہ دیگر مدارس عربیہ دینیہ کے فضلا اور فارغین کے لئے ایک طرح سے ٹریننگ سنٹر تھا، جہاں شعبان کے اخیر سے تعلیم شروع ہوتی، اور ذیقعدہ کے درمیان تک تعلیم ختم ہو جاتی تھی۔ مولانا موصوف نے ڈھائی تین ماہ کی مدتِ تعلیم پوری کی، اسکے بعد امتحان ہوا، حضرت مولانا نے اس امتحان میں امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کی، اور محدث جلیل حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ سے سند حاصل کی، اور وطن واپس آگئے، پھر اسی سال آپ نے دارالعلوم دیوبند کا سفر کیا، اور یہاں بھی حضرت مدنی کے درس میں شریک ہوئے، اور بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس لیا۔

حضرت مولانا دام مجدہ اب جملہ علوم وفنون کی دولت سے مالامال ہو چکے

تھے، اب وقت آیا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کو اپنے علوم و معارف کے باراں سے سیراب کریں، چنانچہ جولائی ۱۹۳۴ء میں ایک استاذ کی حیثیت سے دارالعلوم میں آپ کا تقرر ہوا۔ اور آپ ادب و تفسیر کے تشنگان کو اپنے بارانِ علوم وفنون سے سیراب کرنے لگے۔

اسی سال نومبر میں آپ کی شادی خانہ آبادی آپکے ماموں سید احمد سعید کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اور ۱۹۸۹ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ رحمۃ اللہ علیہا رحمۃً واسعۃ.

اب مولانا محترم نے درس و تدریس اور تصنیف تالیف کی جانب پوری توجہ کی۔ اور عربی زبان وادب کی معیاری تعلیم کے لئے جس کی عرصہ دراز سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ ایک معیاری نصاب تعلیم وضع کیا۔ اور عربی زبان میں "قصص النبیین للأطفال"، "القرآۃ الواشدہ" اور "مختارات من ادب العرب" لکھ کر عربی زبان وادب کی بے بہا خدمات انجام دیں۔

حضرت مولانا درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں ہمہ تن مصروف رہے۔ ۱۹۴۳ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک چار سال کی مدت میں "ماذا خسر العالم با نحطاط المسلمین" عربی زبان میں تحریر فرمائی، جو مصر میں ۱۹۵۰ء میں چھپی اور اس کتاب نے اطراف و اکنافِ عالم میں دھوم مچادی۔ اس کتاب کا اردو ایڈیشن "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" بھی اردو داں طبقہ کے لئے ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا محترم نے ۱۹۴۷ء میں اپنی والدہ ماجدہ، اپنی بہن حضرت امۃ اللہ تسنیم صاحبہ اور اپنے بھانجہ حضرت محمد ثانی حسنی وغیرہم کے ساتھ حج کا سفر کیا،

اور آپ سرزمین حجاز میں تقریباً چھ مہینے دعوت و تبلیغ اور کبائر علماء و مشائخ سے ملاقات اور انکی زیارت میں مصروف رہے۔ پھر دوبارہ ۱۹۵۰ء میں اپنے رفقاء، ساتھیوں اور دوستوں کی ایک جماعت کے ساتھ دوبارہ حج کیا، اور سرزمین حجاز میں متعدد تقریریں کیں، ۱۹۵۱ء میں آپ نے مصر اور مشرق وسطیٰ کا سفر کیا، اور وہاں آپ نے فکر اسلامی کے قائدین اور بڑے بڑے علماء، ادباء اور مصنفین و مؤلفین سے ملاقاتیں کیں، اس سفر میں آپ نے بہت سی علمی اور فکری تقریریں بھی کیں، پھر ۱۹۵۶ء میں جامعہ دمشق کے "کلیۂ شرعیہ" کی دعوت پر دمشق تشریف لے گئے۔ اور وہاں مختلف عنوانات کے تحت آٹھ علمی تقریریں پیش کیں۔

۱۹۵۹ء میں لکھنئو ہی میں آپ نے "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ کی بنیاد رکھی، جو آج اپنی اردو، ہندی، عربی اور انگریزی کی گراں قدر مطبوعات کی کثرت کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اسکی ایک شاندار عمارت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ کے اندر ہی ہے۔ یہ ادارہ ہر آن ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ ۱۹۶۰ء میں آپ نے برما کا سفر کیا، اور وہاں ایک ماہ سے زائد قیام فرمایا، اور وہاں دسیوں تقریریں کیں، ۷ مئی ۱۹۶۱ء کو آپ کے برادرِ کبیر ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کا انتقال ہو گیا، اسکے بعد ہی ۱۸ جون ۱۹۶۱ء کو جلسہ انتظامیہ نے بحیثیت ناظم ندوۃ العلماء آپ کا انتخاب کیا، اور عملی طور پر آپ ناظم ہو گئے۔ ۲۴ جنوری ۱۹۶۲ء کو آپ نے اپنے رفقاء حضرت مولانا معین اللہ صاحب ندوی، اور حضرت مولانا محمد رابع صاحب ندوی کے ساتھ ندوۃ العلماء کے تعارف اور مالی امداد کی فراہمی کے لئے کویت کا سفر کیا، اللہ کے فضل و کرم سے

آپ کا یہ سفر مجموعی اعتبار سے بہت کامیاب رہا، اور مقصد میں کامیابی بھی ہوئی۔ اسی سال مارچ کے اخیر میں آپ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس مشاورت کی ممبر شپ سے سر فراز ہوئے، اور اسکے پہلے جلسۂ مشاورت میں شریک ہوئے، اسی سال آپ کو رابطۂ عالمی اسلامی مکہ مکرمہ کا بھی ممبر نامزد کیا گیا، پھر ۱۱ر مارچ ۱۹۶۳ء کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے نائب صدر کی دعوت پر آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے، اور وہاں آپ نے "النُّبوۃُ وَ الأنبیاءُ فی ضوءِ القرآن" کے عنوان پر آٹھ خطبے دیئے، اسی سال آپ نے ۱۹ ستمبر کو پہلی مرتبہ یورپ کا سفر کیا، یہ سفر نومبر تک جاری رہا، اس سفر میں آپ کے ایک دیرینہ رفیق جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب ساتھ تھے۔ اس سفر میں آپ نے یوروپ اور اسپین کے بہت سے شہروں کو دیکھا، اور مغرب کے بہت سے فضلاء اور مستشرقین سے ملاقاتیں کیں، اور مختلف مواقع پر کچھ تقریریں بھی کیں، اس کے بعد آپ یوروپ، امریکہ، ممالک عربیہ، مغرب اقصیٰ، مشرق وسطیٰ اور خلیج عرب کا مسلسل سفر فرماتے رہے، اللہ رب العزت نے حضرت مولانا کو اپنے خصوصی فضل وکرم سے نوازا ہے۔ جسکا اثر ہے کہ حضرت مولانا کے لئے مذکورہ بالا ممالک اور مقامات کا سفر کرنا ایسا ہی ہو گیا ہے جیسے کسی ملک کا باشندہ اپنے ملک کے شہروں کا سفر کرتا ہے۔

اب وقت آ گیا کہ ندوۃ العلماء اور دار العلوم ندوۃ العلماء اپنے موقر علم دوست اور علم پرور ناظم کی پُر وقار نظامت کے دور میں اپنی ۸۵ سالہ خدمات کا تعارف کرائے، اور دنیا کو اپنے فضلاء اور انکی کارکردگی سے متعارف کرائے، چنانچہ ۳۱ر اکتوبر تا ۳ر نومبر ۱۹۷۵ء کو دار العلوم کے وسیع ترین میدان میں ایک جشن تعلیمی کا انعقاد عمل میں آیا۔ جس میں مفکر اسلام حضرت مولانا مدظلہ العالی کی

جدوجہد اور آپ کی دعوت پر ہندوبیرون ہند خصوصیت کے ساتھ ممالک عربیہ اور مصر کے فضلاء، ماہرین تعلیم، جامعات کے ذمہ دار، اہل فکر و نظر، ارباب قلم اور مختلف حکومتوں کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے عہدیدار دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اس اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لائے، اس جشن تعلیمی کی صدارت کے لئے جامعہ ازہر کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کو دعوت دی گئی، وہ بھی تشریف لائے، اور انہوں نے اس اجلاس کی صدارت فرمائی۔ ہندوستان کے مدارس عربیہ کے فضلاء اور ذمہ دار نیز مادرِ علمی کے منتسبین اور فارغین بھی چاروں طرف سے آکر اس جشن میں شریک ہوئے۔ اور اجلاس کو کامیابی وکامرانی کے بامِ عروج تک پہنچایا۔

۱۷/۱۸/ اپریل ۱۹۸۱ء کو مفکر اسلام نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ادب اسلامی کا ایک علمی سیمنار منعقد کیا، جس میں ہندوبیرون ہند کے باذوق فضلاء اور ریسرچ اسکالر شریک ہوئے، ۲۹/ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو حضرت مولانا دام مجدہ کو ایک علمی اعزاز سے بایں طور سرفراز کیا گیا کہ کشمیر یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

۱۹۸۰ء میں "خدمت اسلام" کے سلسلہ میں حضرت مولانا دام مجدہ شاہ فیصل ایوارڈ سے سرفراز کئے گئے، اور حال ہی میں حکومتِ دوبئی نے آپ کو ۱۹۹۸ء کی اسلامی شخصیت کے موقر ایوارڈ سے سرفراز فرمایا ہے۔ اسی طرح حکومت برونائی نے بھی ایک اہم ایوارڈ سے نوازا ہے۔ ان ایوارڈوں کی رقم لاکھوں روپئے ہے۔ جسکو حضرت مولانا نے دینی خدمات کے لئے لِوجہ اللہ صرف فرمادیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے، اور آپ کو اس کا اجر دارین میں

عطا فرمائے۔

آپ کی تصنیفات و تالیفات عربی، اردو، ہندی انگریزی اور دیگر زبانوں میں بہت زیادہ ہیں، جن کی تفصیلات کے لئے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی تازہ ترین فہرست دیکھی جاسکتی ہے۔ آپ کی اردو موقر کتابوں میں تاریخ دعوت وعزیمت، ارکان اربعہ، نقوش اقبال، سیرت سید احمد شہید، نبی رحمت، حیات عبدالحیٔ، کاروان مدینہ، المرتضیٰ، قادیانیت، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، دستور حیات، منصب نبوت اور اسکے عالی مقام حاملین، ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں، مطالعہ قرآن اور اسکے اصول ومبادی، سوانح حضرت عبدالقادر رائے پوری، سوانح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب، حیات مولانا حکیم عبدالحیٔ، پرانے چراغ، کاروانِ ایمان وعزیمت، اور آپکی خود نوشت سوانح "کاروانِ زندگی" قابل ذکر ہیں۔

اس باب کو ختم کرتے ہوئے اس امر کا اظہار کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مفکر اسلام حضرت مولانا مدظلہ العالی کی ذات گرامی کی زندگی کا موقف کیا ہے؟ اپنی زندگی کے موقف کو اجاگر کرتے ہوئے خود حضرت مولانا محترم نے اپنے ایک اصلاحی مقالہ "نیا طوفان اور اسکا مقابلہ" میں تحریر فرمایا ہے کہ

"میں اپنے بارے میں صراحت کے ساتھ بتادینا چاہتا ہوں، کہ زندگی کے کسی لمحے اور کسی وقفے میں بھی اُن لوگوں میں نہیں رہا ہوں، جو دین اور سیاست کی تفریق کے قائل ہیں، نہ میں ان لوگوں میں ہوں جو دین کی ایسی تعبیر کرتے ہیں، جس سے وہ زندگی کے ہر نظام اور حالات کے ہر سانچے

میں (خواہ وہ اسلام سے کتنا ہی ہٹا ہوا ہو)۔۔۔۔۔ فِٹ ہو جائے، اور ہر رنگ کی سوسائٹی میں مجڑ جائے، اور نہ میرا تعلق کبھی اس گروہ سے رہا ہے، جو سیاست کو قرآن کے شجرِ ملعونہ...الشجرة الملعونة فی القرآن...کا مصداق سمجھتا ہے، میں ان لوگوں کی اگلی صف میں ہوں، جو مسلمان قوموں میں صحیح سیاسی شعور کے داعی ہیں، اور ہر اسلامی ملک میں صالح قیادت کو بروئے کار دیکھنا چاہتے ہیں، میں ان لوگوں میں ہوں، جن کا اعتقاد ہے کہ دینی معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا، جب تک دین کو اقتدار حاصل نہ ہو، اور حکومت کا نظام اسلامی بنیادوں پر استوار نہ ہو، میں اسکا داعی ہوں، اور زندگی کی آخری سانس تک رہوں گا" (نیا طوفان اور اسکا مقابلہ ص۔۔۔۲۹)

اخیر میں دعا ہے کہ اللہ رب العزت صاحبِ خطبات حضرت گرامی مولانا محترم کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے، تاکہ دنیائے انسانیت انکی صلاحیتوں، قابلیتوں ،لیاقتوں اور انکی صالح دینی، اخلاقی اور روحانی فیوض سے فیضیاب ہوتی رہے۔ اور بس۔

این دعا از من واز جملہ جہاں

۱۰/ اکتوبر ۱۹۹۹ء — خادم علم وادب

مطابق — **محمد کاظم ندوی**

۲۹/ جمادی الثانی ۱۴۲۰ھ — استاذ دار العلوم فاروقیہ کاکوری لکھنئو

قرآن کا مطالبہ

مکمل اطاعت و سپردگی

یہ تقریر جدہ کی مشہور مسجد "مسجدِ جوہرہ" میں ۲۷/ نومبر ۱۹۸۸ء کو کی گئی تھی، حاضرین میں ہندوستانی و پاکستانی احباب کی بڑی تعداد موجود تھی۔

بسم الله الرحمن الرحیم

قرآن کا مطالبہ
مکمل اطاعت وسپردگی

حمد وصلوٰۃ کے بعد :-

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیم ط یآیھا الذینَ آمنُوا ادْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَافۃ، وَلاَ تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّیطن ط اِنَّہ لَکُم عَدوٌ مُّبین فَاِنْ زَلَلْتُم مِنْ بَعدِ مَا جَاءَ تْکُم البینٰت فَاعْلَمُوا اَنَ اللّٰہَ عَزِیزٌ حَکِیمٌ ط

میرے بھائیو، اور دوستو! میں نے آپ کے سامنے قرآن کی ایک آیت پڑھی ہے، اس کا ترجمہ ہے۔ ”اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ سلم (صلح) میں پورے کے پورے اور شیطان کے نقشہائے قدم کی پیروی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اگر تم سے لغزش ہوئی صاف صاف باتیں آجانے کے بعد، تو یاد رکھو کہ خدائے تعالیٰ غالب اور حکیم ہے۔“

حضرات :- یہ آیت بڑی چونکا دینے والی ہے، اللہ سے جنگ کا کیا مطلب ہے کیا اس کا کوئی امکان ہے، کیا اس کا کوئی تصور کر سکتا ہے، بھلا بندہ اللہ سے جنگ

کر سکتا ہے ؟ لیکن قرآن میں لفظ یہی استعمال کیا گیا ہے، جس سے ہمارے کان کھڑے ہو جانے چاہئیں بلکہ جسم لرز جانے چاہئیں کہ اللہ تعالیٰ جو مالک الملک، خالق کائنات، قادر مطلق اور محسن و منعم ہے وہ اپنے بندوں سے کہے کہ اے ایمان والو! صلح میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے، ہم سے جنگ، محاذ آرائی اور مقابلہ کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔

بظاہر ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ "فی السلم" کے بجائے "فی الاسلام" کہا جاتا یعنی اسلام میں داخل ہو جاؤ، مگر نہیں، یہاں سلم میں داخل ہونے کو کہا گیا یعنی خدا کے ساتھ تمہارا معاملہ، فرمانبردارانہ، مصالحانہ، مطیعانہ اور مکمل ہونا چاہئے، عقائد میں بھی، فرائض و عبادات میں بھی، طرز معاشرت اور طریقۂ زندگی میں بھی تمہیں اللہ کی تعلیمات اور سید المرسلین خاتم النبین ﷺ کے لائے ہوئے اور بتائے ہوئے احکام کا پابند ہونا چاہئے اور تعلقات میں بھی اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ اللہ کے دشمن سے وفاداری اور اطاعت و فرمانبرداری کا تعلق نہ ہو، "اسلام" کا لفظ "سلم" ہی سے نکلا ہے، عربی زبان و لغت کے لحاظ سے "اسلام" کے معنی ہیں اپنے کو حوالہ کر دیا، سلنڈر کر دیا، اپنی ہر چیز سے دستبردار ہو گیا، اپنی ملکیت سے، خواہش، مصالح و مفادات سے، فوائد و ضرر میں فرق کے لحاظ، اور احساس سے دستبردار ہو گیا، اپنے کو خدا کے احکام کے قدموں میں ڈال دیا، اور اپنے کو بالکل سپرد کر دیا اور سلم کے معنی صلح کے ہیں، قرآن میں دوسری جگہ آیا ہے" وان جنحو اللسلم فاجنح لها "(اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی صلح کی طرف مائل ہو جائیے)" اسالم من سالم واحارب من حارب" مصالحانہ رویہ اختیار کرتا ہوں، اس کے لئے جو مجھ سے مصالحانہ رویہ اپنائے اور مقابلانہ و محاربانہ رویہ اختیار

کرتا ہوں اس کے لئے جو جنگ کرے، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دیگر مقامات پر اپنے لئے ایسے پر جلال اور باعظمت الفاظ استعمال کئے ہیں جو لرزا دینے والے اور تھرا دینے والے ہیں، مثلاً سود کے بارے آیا" یآ ایھا الذین آمنوا اتقوا للہ و ذروا مابقی من الربوا ان کنتم مؤمنین ط فان لم تفعلوا فأ ذنوا بحرب من اللہ ورسولہ" اگر تم نے سود نہیں چھوڑا تو تیار ہو جاؤ اللہ سے لڑنے کے لئے، جنگ کرنے کے لئے، اور اسی طرح حدیث قدسی میں آیا ہے "من اذیٰ لی ولیا فقد آذنتہ بالحرب" (میرے کسی دوست اور مقبول بندے کو جو ستائے گا ایذا پہونچائے گا تو میں نے اس کے لئے اعلان جنگ کردیا)

توبظاہر دور اور بہت دور کی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ کون سا شامت زدہ اور بد نصیب ہوگا جو خدا سے جنگ کی ٹھانے گا جو خدا سے برسر مقابلہ ہوگا، لیکن انسانوں کی نفسیات، انسانوں کی زندگی کے تجربات، اللہ ورسول کی تعلیمات کے مقابلہ میں طرز عمل اور ان کے کردار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے، اس کا امکان ہے کہ ایک آدمی اسلام کا دعویٰ بھی کرے، اللہ کے بندہ ہونے کا دعویٰ اور اعتراف کرے اور پھر بعض چیزوں میں اللہ تعالیٰ سے (معاذ اللہ، سوبار معاذاللہ) برسر جنگ ہو یعنی کچھ مانے اور کچھ نہ مانے------ اللہ کے یہاں رزرویشن اور تحفظ کیساتھ اور اپنی مرضی کو دخل دیتے ہوئے کوئی بندگی کا تعلق قائم کرے کہ اچھا صاحب، ہم عقائد کو تو مانتے ہیں، بیشک توحید برحق، معاد اور آخرت کا عقیدہ برحق، حساب وکتاب برحق، لیکن معاشرہ میں، تہذیب میں، اپنی گھریلو زندگی میں، اپنے عزیزوں کے ساتھ تعلقات میں، لین دین میں، کاروبار میں، تجارتی معاملات میں، ہم آزاد ہیں------ تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول کرنے کے

لئے تیار نہیں ہے یہ آیت اسی لئے نازل ہوئی ہے، اور یہ آیت گویا تازیانۂ عبرت ہے، ایک بہت بڑے خطرے کا اعلان ہے کہ خدا فرماتا ہے، اے وہ لوگو جن کو ایمان لانے کا دعویٰ ہے "اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً" اللہ کے ساتھ پورے طور پر صلح میں داخل ہو جاؤ، یہاں یہ نہیں چلے گا کہ اتنا ہم مانتے ہیں اتنا ہم نہیں مانتے ہیں" میٹھا میٹھا توہپ ہے کڑوا کڑوا تھو" یہ نہیں، آپ یہی دیکھ لیجئے کہ مسجد میں داخل ہوتا ہے آدمی، تو اپنے پورے جسم کے ساتھ داخل ہو جاتا ہے، کوئی کہنے لگے کہ صاحب! ہم تو پورے جسم کے ساتھ نہیں آتے، پاؤں رکھتے ہیں مسجد میں اور بدن رکھتے ہیں باہر، ہم اپنا سر جھکا دیتے ہیں مگر ہمارا بقیہ جسم باہر رہے گا، یا کوئی نماز کے بارے میں کہے کہ قیام تو سر آنکھوں پر، سو بار قیام کرا لیجئے لیکن جھکنا مشکل ہے رکوع اور سجود سے ہمیں معاف رکھئے اس میں ہمیں انسانیت کی توہین معلوم ہوتی ہے، ہمیں اپنی شکست کا احساس ہوتا ہے، ہمیں اپنی خودی سے دستبردار ہونا پڑتا ہے، تو دوستو! ایسی عبادت نماز کہلانے کی مستحق نہیں، بلکہ یہ کفر کا ایک کلمہ اور کفر کا ایک رویہ ہوگا۔

آپ مجھے معاف کریں، معلوم نہیں آپ کیا توقع رکھتے ہوں گے کہ میں آپ کو خوشخبریاں دوں، بزرگوں کے واقعات سناؤں، اور ایسی چیزیں سناؤں کہ آپ یہاں سے اور زیادہ مطمئن ہو کر جائیں، ہم مسلمانوں کی کمزوری یہ ہے کہ ہم اطمینان چاہتے ہیں، اپنی زندگی کی تصدیق چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی پر کوئی مہر تصدیق ثبت کر دے کہ ہم اس مقدس سرزمین پر ہیں ہم سے زیادہ کون خوش قسمت ہوگا، ہم یہ سننا چاہتے ہیں کہ مبارک ہو آپ کو، اللہ تعالیٰ آپ کو یہاں ہمیشہ رہنا نصیب فرمائے، آپ بڑے خوش نصیب ہیں، لاکھوں اولیاء اللہ اس کی تمنا کرتے تھے کہ

اللہ ہمیں ارض مقدس تک پہونچائے ایک اپنے زمانے کے امام الاولیاء، مجاہد اعظم اور مجدد وقت، جس کے ہاتھ پر ۴۰ ہزار لوگ مسلمان ہوئے اور جس کے ہاتھ پر براہ راست بیعت و توبہ کرنے والوں کی تعداد تیس لاکھ سے کم نہیں اور بالواسطہ سلسلۂ بیعت میں داخل ہونے والوں کی تعداد تو کروڑوں بیان کی جاتی ہے، اس زمانے کے بڑے مبصر، بڑے مصنف، اور صاحب نظر نے لکھا ہے کہ دوسرے ملکوں میں بھی ایسا صاحب تاثیر سنا نہیں گیا، وہ شخص جس کی وجہ سے ہزاروں کو ولایت ملی ہو تو تعجب نہیں، ان کا حال یہ تھا کہ جب وہ آرہے تھے حج کے لئے پہلی بار (اس زمانے میں حج کرنا بڑا مشکل تھا، بادبانی جہاز ہوتے تھے) تو ایک جگہ پر کسی نے کہا کہ وہ رہا جزیرۃ العرب! وہ کھجور کا درخت نظر آرہا ہے! (خدا جانے وہ جزیرۃ العرب کا کون سا حصہ تھا اور جس کی وجہ سے جزیرۃ العرب محبوب و مکرم ہے اس جگہ سے وہ کتنا دور تھا؟) تو وہ تاب نہ لاسکے وضو سے تھے، سجدے میں گر گئے دو رکعت نماز پڑھی اور فرمایا، اللہ کا شکر ہے، کہ اس نے مرنے سے پہلے ہمیں وہ سرزمین دکھادی ------ اسی طرح بہت سے عابدین و زاہدین یہ تمنا لے کر دنیا سے رخصت ہوگئے کہ ہمیں اس جگہ پہونچنا نصیب ہو تو ہم اپنی پلکوں سے وہ زمین جھاڑیں گے، اپنے آنسوؤں سے وہ خاک دھوئیں گے ----- تو آپ کہیں گے کہ ہم اس سرزمین میں ہیں، اس لیے ہمیں خوشخبری سنائیے، ہمیں مبارکباد دیجئے اور دعائیں دیجئے کہ ہم یہاں رہیں، پھر کیا بات ہے، یہ بے وقت کی شہنائی کیسی؟ ایسی سخت آیت ہمارے سامنے پڑھی گئی جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے ایمان والو! ہمارا معاملہ کسی دنیاوی حاکم و بادشاہ کا نہیں کہ تھوڑا دے دیا، تھوڑا سا ٹیکس ادا کر دیا، اس کی تھوڑی سی بادشاہت مان لی، اس کی بڑائی تسلیم کر لی تو خوش! اور آپ کے

سب گناہ معاف، ہماری ذات تو غنی ہے، ہم قوی ہیں، ہم عزیز ہیں، ہم غالب ہیں، ہم اس دنیا کے پیدا کرنے والے ہیں، ہم قسمتوں کے مالک ہیں، ہم تقدیر کے بنانے ، بگاڑنے والے ہیں، ہم بیماری اور صحت دینے والے ہیں" قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ "اے اللہ، اے سلطنتوں کے مالک، تیرے اختیار میں ہے تو جس کو چاہے سلطنت سے نوازے، اور جس سے چاہے آن کی آن میں پلک جھپکانے میں سلطنت چھین لے) اور تاریخ بتاتی ہے کہ ہزاروں برس کی شہنشاہیاں جن کا ڈنکا بج رہا تھا دنیا میں، جن کا طوطی بول رہا تھا، جن کے والیان سلطنت کی ایک نگاہ پڑ جانا سمجھا جاتا تھا کہ گویا "ھُما" اس کے سر پر بیٹھ گئی، اور وہ جس کے سر پر سے ہو کر اڑ گئی اس کی تقدیر بدل جاتی تھی، مٹی پر ہاتھ رکھ دیں تو سونا ہو جائے، پلک جھپکاتے میں اللہ نے ان کی سلطنتوں کا آفتاب غروب کر دیا، اور ایسا غروب کیا کہ اس کے بعد کبھی طلوع نہیں ہوا روما الکبریٰ کی تاریخ بتاتی ہے گبن (GIBBON) کی کتاب "زوال وسقوط روما" (DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE) آپ پڑھ لیجئے کہ وہ کیا سلطنت تھی، کیا شہنشاہیت تھی، کس طرح اس کو زوال ہوا، ساسانی سلطنت کی تاریخ پڑھئے کہ کیسا اس کا ڈنکا بجتا تھا، درفش کاویانی اور اس کی آتش مقدس، ہندوستان کی سرحدوں تک اس کی سلطنت پہونچی ہوئی تھی، اس کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے " فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ "ہم نے اس کو افسانۂ پارینہ بنا دیا اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے---- وہ اللہ کہتا ہے کہ صرف اتنا کافی نہیں کہ آپ نماز پڑھ لیجئے، آپ ایک سجدہ کر لیجئے، ایک مرتبہ اللہ کا نام لے لیجئے اور اب آپ سے کچھ نہیں پوچھا جائے گا، نہیں ہماری غلامی میں پورے طور پر

داخل ہونا پڑے گا، رزرویشن یہاں نہیں ہے، یہ نہیں کہ "اتنا ہمارا، اتنا آپ کا" یہاں تو سب ہمارا، تمہاری دولت ہماری، تمہاری عزت ہماری، تمہاری صحت ہماری، تمہارا بدن ہمارا، تمہارا سر ہمارا، تمہارا دین وایمان ہمارا، تمہاری وفاداریاں ہماری، گویا ساری کی ساری ہمارا حق ہیں، کسی کا حق نہیں ہے، ہم جس کی اجازت دے دیں اتنی تم کسی کی اطاعت کرو ورنہ اصل اطاعت ہماری ہے۔

یہ بڑی چونکا دینے والی آیت ہے جو ہم نے آپ کے سامنے پڑھی، معلوم نہیں پھر کبھی ملنا ہو کہ نہ ہو، اللہ تعالیٰ عین وقت پر یا کچھ پہلے جو ذہن میں ڈالتا ہے وہی میں کچھ کہہ سکتا ہوں، یہ آیت میرے ذہن میں آئی ہے کہ اللہ فرماتا ہے "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً" داخل ہو صلح میں پورے کے پورے "کافة" کا تعلق دونوں سے ہے، یعنی سارے احکام کو مانو اور تم سب مانو۔ ایک نے مانا دوسرے نے نہیں۔ اور ایک کو مانا دوسرے کو نہ مانا، ایسا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ سب ہمارا ہے ہمیں دے دو، سب ہمارے حوالہ کر دو، عقائد وہ ہوں جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے بتائے ہیں، اس میں ذرہ برابر فرق نہ ہو، کائنات میں کسی اور کا حکم چلے ایسا نہیں "الا له الخلق والامر" یاد رکھو! اس کا کام ہے پیدا کرنا اور اسی کا کام ہے حکم دینا وہی پیدا کرتا ہے، وہی صحت دیتا ہے، وہی رزق دیتا ہے، وہی طاقت دیتا ہے، وہی دولت دیتا ہے، وہی عزت دیتا ہے، وہی بیمار کرتا ہے وہی شفا دیتا ہے، وہی اولاد کا دینے والا ہے، وہی قسمت کا بنانے بگاڑنے والا ہے، اللہ کے متعلق یہ عقیدہ پورا کا پورا ہو کہ اس کی سلطنت میں، اس کے اختیارات میں کوئی بڑی سے بڑی ہستی بھی شریک نہیں ہے، نہ انبیاء شریک ہیں، نہ اولیاء، اللہ تعالیٰ کو سمجھو کہ وہ قادر مطلق ہے، اس کے یہاں کسی کی سفارش نہیں چلتی، اسی طرح اللہ کے رسول کو

مطاع مطلق مانو، قرآن مجید میں ہے کہ جو لوگ اللہ کے رسول کی کچھ بات مانتے ہیں کچھ نہیں مانتے وہ رسول کے مطیع نہیں ہیں، " وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ " کہ کسی مسلمان کو یہ اجازت نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول کا کوئی حکم شرعی معلوم ہو جائے تو اس کو کوئی اختیار باقی رہ جائے اور یہ کہے کہ ہمیں ذرا سوچنے اور غور کرنے کا موقع دیجئے، فوراً ہم جواب نہیں دے سکتے کہ ہم ضرور مانیں گے، نہیں، جب معلوم ہو جائے کہ یہ اللہ کے رسول کا منشا اور فرمان ناطق ہے، یہ ان کا قول ہے صحیح طریقہ سے ہم تک پہونچا ہے تو انسان کا اختیار اور آزادی ختم، اب تو وہی کرنا ہوگا جو اللہ کے رسول ؐ کہتے ہیں۔

آپ مجھے معاف کریں، میں تو ایک اڑتی چڑیا ہوں آیا اور اس شجرۂ طور پر بیٹھ گیا اور اڑ گیا، کل ہی یہاں سے خدا کو منظور ہوا تو اڑ جاؤں گا، آپ مجھے یہ نہ سمجھئے کہ میں جاسوسی کرتا ہوں، یا میں یہاں آکر عیب ڈھونڈتا ہوں، میں یہاں کے مسلمانوں کے حالات سے واقف ہوں، اور زندگی کا جو دھارا بہہ رہا ہے میں اس سے کچھ دور نہیں ہوں، اس لئے میں دیکھتا ہوں کہ عقائد درست ہیں، نمازوں کی پابندی ہے، فرائض کی پابندی ہے، لیکن معاشرہ بالکل بگڑا ہوا ہے، گھر کی زندگی بالکل اسلام سے بدلی ہوئی ہے، وہاں تعیشات کی باتیں ہیں، وہاں اسراف ہے، حقوق کی پامالی ہے، وہاں بے محل خرچ کرنا ہے، اس میں تفریحات کا سامان ہے، وہاں ویڈیو ہے جو دن رات کا مشغلہ ہے، مسجد میں مسلمان، وہاں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن دوستو! مسلمان صرف مسجد میں نہیں ہوتا، مسلمان تو روئے زمین کے کسی چپے پر ہو، بر و بحر میں ہو، اور اگر کبھی خدا چاند پر پہونچا دے (اور اس نے پہونچایا ہے، انسانوں کو

اپنے دیئے ہوئے علم و طاقت کے ذریعہ) وہاں بھی وہ عبد ہے، خدا کا بندہ ہے، یہاں تک کہ تمام علماء امت کا اتفاق ہے اس پر، کہ تکلیف ساقط نہیں ہوتی، پیغمبروں سے بھی تکلیف ساقط نہیں ہوئی، اور تکلیف کا مطلب کیا ہے، شرعی پابندیاں اور قرآن کی آیت "واعبد ربك حتىٰ یاتیكَ الیَقِینُ" کی تفسیر تمام مفسرین نے یہی لکھی ہے کہ اپنے رب کی بندگی کرتے رہو، جب تک کہ وفات کا وقت نہ آجائے، چنانچہ حضورؐ وفات کے وقت تک نمازوں کی ویسی ہی پابندی کرتے رہے، پوچھتے رہے کہ کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی، کہا گیا نہیں یارسول اللہؐ! آپ کا انتظار ہے، فرمایا پانی لاؤ غسل فرمایا، مگر چلنے کی طاقت نہیں تھی، دو دو مرتبہ تین تین مرتبہ آپؐ نے غسل فرمایا، تیاری کی، نہیں ہوسکا تو فرمایا: "مُروا اَبابکرٍ فَلیصلِ بالنَّاس" ابوبکر سے کہو کہ نماز پڑھائیں، پھر آپؐ نے بھی نماز پڑھی اس وقت آپؐ کا مسواک کرنا ثابت، آپ کا وصیت کرنا ثابت، آپؐ کا امت کو ہدایت دینا ثابت یہاں تک کہ " اللھم الرفیق الاعلیٰ اللھم الرفیق الاعلیٰ" کہتے ہوئے دنیا سے تشریف لے گئے۔

اور آج ہم مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ اگر عقائد درست ہیں تو عبادات میں خلل ہے اور اگر عقائد و عبادات دونوں درست ہیں تو اخلاق و معاملات میں بڑی بڑی خندقیں ہیں، یعنی رخنے نہیں، شگاف نہیں، خندقیں ہیں، کھائیاں ہیں، پوری پوری خلیج ----- میں نے شارقہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ جتنا خلیج سے واقف ہیں شاید دنیا کے کم لوگ واقف ہوں گے، آپ خلیج کے رہنے والے ہیں، مگر آپ ایک ہی خلیج کو جانتے ہیں اور یہ وہ خلیج ہے جو جزیرۃ العرب کو ایران سے الگ کرتی ہے، بیچ میں پانی ہے، میں آپ کو اس سے بھیانک خلیج کی خبر دیتا ہوں وہ خلیج، جو اسلام اور مسلمانوں کے درمیان پڑی ہوئی ہے، اسلام اور مسلمانوں

کے درمیان کئی کئی خلیجیں ہیں، عقائد اور عبادات میں خلیج، کتنے لوگ ہیں جو مسلمان ہیں، کلمہ پڑھتے ہیں لیکن نماز سے ان کو کوئی غرض نہیں اور بہت سے ہیں جن کے عقائد و عبادات دونوں درست ہیں، لیکن اخلاق و معاملات کو وہ فہرست سے بالکل خارج سمجھتے ہیں۔

جھوٹ بولتے ہیں، بے ایمانی کرتے ہیں، ناپ تول میں کمی کرتے ہیں، ملاوٹ کرتے ہیں جھوٹی قسمیں کھا کر اپنی تجارت کو چمکاتے ہیں، کسی کے حق کو ہضم کرلیتے ہیں، مگر ان کو کوئی باک نہیں ہوتا کیونکہ وہ ان سب باتوں کو دین سے خارج سمجھتے ہیں اور کتنے لوگ ہیں جو اپنے ماں باپ کے حق کو، گھر والوں کے حق کو پامال کررہے ہیں، پڑوسیوں سے ان کو کوئی مطلب نہیں، کتنے ہیں جنکی زبان میں نہ سچائی ہے، نہ راستی و صداقت ہے نہ حلاوت و شیرینی ہے۔

ان کے آس پاس کے لوگ شاکی ہیں، اور شاکی نہیں تو کم از کم شکر گزار نہیں ہیں، پھر اسکے بعد کتنے ہیں جن کے نزدیک تعلقات میں، سیاسیات میں، خدا کے دوست اور دشمن میں، کوئی فرق نہیں ہے، ان کے نزدیک صالح اور فاسد میں کوئی فرق نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ صاف فرماتا ہے "وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ" یہاں "رکون" کا لفظ آیا ہے، ان کا ساتھ دینا اور حمایت کرنا تو دور کی بات ہے ان کی طرف تمہارا جھکاؤ اور میلان بھی نہ ہو جنہوں نے ظلم کا شیوہ اختیار کررکھا ہے، جنہوں نے حد سے تجاوز کیا ہے، جن کے اندر بے اعتدالی پائی جاتی ہے، جن کے اندر حقوق کی پامالی پائی جاتی ہے، جن کے دلوں میں خدا کا خوف نہیں ہے جو دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، جو دولت کے پرستار ہیں، جو اقتدار کے پرستار ہیں، جو اپنی بات چلانا جانتے ہیں، یہ سب باتیں "ظلموا" کے تحت آجاتی ہیں،

یہ آیت ہم میں سے بہت سے مسلمانوں کے لئے شاید نئی ہوگی کہ اچھا یہ بات بھی ہے، بہت سخت لفظ ہے "لَاتَرْکَنُوْا" یہ نہیں کہا گیا کہ ان کے ہاتھ پر بیعت نہ کردیہ نہیں کہا کہ ان کے غلام نہ بن جاؤ بلکہ ادنیٰ جھکاؤ بھی نہیں ہونا چاہئے، ان کی طرف جنہوں نے ظلم کو اپنا شیوہ بنا رکھا ہے۔

کتنے مسلمان ہیں جو اس کو بھی دین کا کوئی شعبہ سمجھتے ہیں، وہ تو کہتے ہیں کہ صاحب! یہ باتیں تو زندگی کی ہیں یہ باتیں تو دین سے باہر ہیں، آپ دین کی باتیں کیجئے، آپ یہ بتائیے کہ فلاں چیز پڑھنے میں کتنا ثواب ہے، فلاں وظیفہ میں کتنا ثواب ہے، ذکر و تسبیح کا کوئی طریقہ بتائیے، کوئی نفل نماز بتائیں، باقی باتوں میں ہم بالکل آزاد ہیں، جو ہماری سمجھ میں آئے گا وہ ہم کریں گے، اس میں اس سے بحث نہیں کہ اس کا ساتھ دینے سے دین کا نقصان ہوگا یا دین کا فائدہ ہوگا، اس کا ساتھ دینے سے دین میں سہولت پیدا ہوگی یا دشواری پیدا ہوگی ان ساری چیزوں کو ہم نے دین کے دائرے سے الگ سمجھ رکھا ہے، میرے بھائیو! ہم تمام چیزوں میں خدا کے بندے ہیں، ہمیں احکام اسلام پر چلنا چاہئے اور اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں دیگر مسلمانوں کی بھی فکر رکھنی چاہئے، اسلام کے غلبہ کیلئے ہم دعا کریں، فکر کریں، کوشش کریں، یہ نہیں کہ ہم تو بڑے عابد و زاہد، اپنی ذات سے ہم بڑے دیندار، شریعت کے پابند، لیکن اسلام کس طرف جارہا ہے، مسلمان کس طرف جارہے ہیں، اس وقت اسلام پر کیا گزر رہی ہے، اور کیا مسائل مسلمانوں کو درپیش ہیں، کن کن ملکوں میں اسلام پر ادبار آیا ہوا ہے، کن کن ملکوں میں اسلام آزمائش کے دور سے گزر رہا ہے، اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں، حالانکہ "من لم یھتم بامر المسلمین فلیس منھم" جن کو مسلمانوں کے معاملات کی فکر نہ ہو، وہ مسلمان نہیں، اور "مثل المسلمین فی

توادهم وتراحمهم تعاطفهم كمثل الجسد الواحد اذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى" "سارے مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں اگر کسی عضو کو تکلیف ہو تو سارے جسم پر بخار چڑھ آئے سارے جسم کو اسکی تکلیف محسوس ہو۔

یہاں اللہ کا فضل ہے، رزق میں فراخی ہے، اللہ مبارک کرے ہمیں بالکل اس پر رشک نہیں۔

لیکن آپ کو اپنے ملک کی بھی فکر کرنی چاہئے اپنے ملک کے اداروں کی بھی فکر کرنی چاہئے، ملت اسلامیہ جس کے لئے تڑپ رہی ہے اس کی بھی آپ کو فکر کرنی چاہئے، خواجہ معین الدین چشتیؒ نے جس ملک کی فضا کو گرم کیا اس کراہ کی گرمی آج بھی محسوس کی جاسکتی ہے، اس بر صغیر میں، اس ہندوستان و پاکستان میں، جس کے آپ فرزند ہیں، اس میں آج بھی اگر اللہ کا کوئی بندہ جائے جس کو خدا نے فہم وادراک عطا فرمایا ہو، وہ محسوس کرے گا کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ خواجہ بختیار کاکیؒ خواجہ باقی باللہ اور داعیان اسلام جن کی آہوں کی گرمی اب بھی اس کی فضا میں ہے، اور زمین میں دیکھا جائے تو ان کی آنکھوں سے نکلی ہوئی تری زمین کے اوپر نہیں تو زمین کے اندر نظر آئے گی، ان کی وجہ سے اسلام کا درخت آج بھی موجود ہے، اگرچہ اس کے سامنے نئے نئے مرحلے پیش آرہے ہیں، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اب بھی وہ درخت باقی ہے، اس سرزمین کی بھی آپ کو فکر ہونی چاہئے کہ آئندہ نسل وہاں کے مسلمانوں کی اسلام پر قائم رہے گی یا نہیں؟ آپ نے اگر اپنی اولاد کے لئے کوئی منصوبہ بنا رکھا ہے، آپ نے ان کے لئے کوئی فضا سازگار کر رکھی ہے، مبارک، ہم اس میں کچھ نہیں بولتے، کوئی دخل نہیں دیتے، مگر آپ جہاں سے آئے ہیں جہاں

آپ کے اعزہ ہیں، جہاں آپ کے خاندان کے افراد ہیں، ۔۔۔۔ جہاں آپ کی پیدائش ہوئی ہے، اس سرزمین کو بھی نہیں بھولنا چاہئے ۔۔۔۔۔ میں کسی مدرسہ کے چندہ کے لئے نہیں آیا، کوئی خدا کا بندہ کچھ کہے گا بھی تو میں اس وقت بالکل توجہ نہیں کروں گا ۔۔۔۔ خدا کا شکر ہے، اللہ رازق حقیقی ہے، جو آپ کو رزق پہونچاتا ہے یہاں، وہی وہاں بھی رزق پہونچاتا ہے، اور وہ اس پر قادر ہے کہ آپ سے زیادہ رزق دے، اور اس نے یہ کر کے دکھایا ہے، اور سوبار کر کے دکھایا ہے، تو میں اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپکو کسی ادارے یا کسی تنظیم کی طرف متوجہ کروں، لیکن آپ کو وہاں کی ملت اسلامی کی، ہم وطنوں کے آئندہ نسلوں کے ایمان کی فکر ہونی چاہئے کہ وہاں کیا کیا خطرے پیدا ہو رہے ہیں، کس کس طرح ان کا ایمان خطرے میں پڑ رہا ہے، وہاں کیا کیا پروگرام چل رہے ہیں؟ رامائن کا سیریل کئی مہینہ تک چلتا رہا خود عینی مشاہدہ کرنے والوں نے مجھ سے پٹنہ میں بتاتے ہوئے کہا کہ ہم نے دیکھا کہ رحل پر قرآن شریف رکھے ہوئے ہیں، ان میں کچھ کھلے ہوئے ہیں کچھ بند ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ابھی لڑکے پڑھ رہے تھے، ارے بھئی لڑکے کہاں گئے؟ آج جمعہ تو نہیں ہے، آج تو اتوار کا دن ہے آخر لڑکے ہیں کہاں؟ تو کسی نے کہا کہ رامائن دیکھنے گئے ہیں، یہ اس بہار کے شہر پٹنہ کا واقعہ ہے، جس نے ملا محب اللہ بہاری جیسا راس العلماء، استاذ العلماء اور امام العلماء پیدا کیا، کتنے اولیاء اللہ پیدا کئے۔

تو آپ کو تھوڑی بہت اپنے ملک کی فکر ہونی چاہئے اور وہ فکر، میں معاشی و مالی فکر نہیں کہتا، آپ کو ذہنی فکر ہونی چاہئے آپ کے دل میں درد ہونا چاہئے کہ آئندہ نسل اسلام پر قائم رہے گی یا نہیں، جس سرزمین نے ایسے ایسے مجددین پیدا کئے جن کا فیض ہندوستان ہی نہیں ہندوستان کے باہر تک پہونچا، میں تاریخ کے

حوالے سے کہہ سکتا ہوں کی حضرت مجدد الف ثانیؒ کا فیض ترکی تک پہونچا، آج بھی ترکی میں ان کے سلسلے کے لوگ موجود ہیں، مولانا خالد رومیؒ دہلی کا سفر کر کے گئے انہوں نے اپنا واقعہ لکھا ہے کہ مکہ میں ہندوستان سے آئے ہوئے قافلہ سے میں نے حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کا حال پوچھا دہلی کے لوگ تھے، انہوں لا علمی ظاہر کی، مجھے تعجب ہوا اتنا بڑا شیخ وقت، مربی روحانی، اس سے یہ لوگ ناواقف ہیں، اس کے بعد وہ سفر کر کے دہلی آئے، اور پھر حضرت شاہ غلام علی صاحب کی مدح میں انہوں نے عربی و فارسی میں قصیدے کہے مولانا رومی علامہ شامی کے استاد تھے، اس لئے ان کا نام سن کر حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ محدث دہلوی جو اس زمانہ کے مسند الہند، استاذ العلماء اور امام وقت تھے، ان سے ملنے گئے تو حضرت شاہ ابو سعید صاحب (جو شاہ دہلوی کے شاگرد تھے) نے کہا کہ ہمارے شہر کے سب سے بڑے عالم آپ سے ملنے آئے ہیں، انہوں نے فرمایا کہ ان سے ہمارا اسلام کہنا، میں جس مقصد سے آیا ہوں اس کو پہلے حاصل کرلوں، تزکیۂ نفس میرا ہو جائے تو میں خود ہی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوں گا ----- خیر ---- اس کے بعد جب تکمیل روحانی کرا کر وہ واپس گئے ہیں اپنے ملک کی طرف، تو حالت یہ ہوئی کہ عراق میں مور و ملخ کی طرح اور شمع پر پروانوں کی طرح سیکڑوں کی تعداد میں علماء و عوام گرے کہ ہمیں اللہ کا نام سکھائیے۔ ہمیں نماز پڑھنا بتائیے ہمارے اندر روحانیت پیدا ہو اور احسان کی کیفیت پیدا ہو تو مولانا رومیؒ جو ترکی و شام کے سب سے بڑے عالم تھے وہ نماز پڑھنا سیکھنے کے لئے دہلی گئے، یہ وہ ملک ہے، اس ملک کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

تو میرے بھائیو! ایک تو یہ کہ دین کے کامل ہونے کا پہلو آپ اپنے ذہن

میں رکھیں، اس میں عقائد بھی ہیں، ایک ایسا عقیدہ جو شرط ہے اسلام کے لئے اس سے انحراف ارتداد کے مرادف ہے، عبادات و فرائض کی پابندی کیجئے ایسا نہ ہو کہ آپ یہاں رہیں، اس کے باوجود نماز کی پابندی نہ ہو، اس سے بڑھ کر بدنصیبی کیا ہو سکتی ہے، پھر اس کے ساتھ آپ کی تہذیب و معاشرت بھی اسلامی ہو، یہ نہیں کہ آپ رہیں سرزمین مقدس میں اور آپ کے گھروں میں ہر وقت (T.V) چل رہا ہو، نمازوں کے اوقات میں لڑکے وہ دیکھ رہے ہوں۔ " وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ." (اور لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو بیہودہ حکایتیں خریدتے ہیں تاکہ لوگوں کو بے سمجھے خدا کے راستہ سے گمراہ کریں (سورہ لقمان۔٦)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے صرف نام لینا رہ گیا ویڈیو اور ٹی وی کا، قرآن تو عربی زبان میں ہے، اس میں انگریزی کا لفظ کیسے آتا؟ عقل کی بات نہیں تھی، لیکن قرآن کا اعجاز معلوم ہوتا ہے کہ آج سے چودہ سو برس پہلے جو کتاب نکلی، اگر میں مسجد میں بیٹھ کر کہوں کہ اس میں ٹی وی اور ویڈیو کا ذکر ہے تو میں غلط نہیں کہوں گا، اس لئے کہ قرآن میں کہا گیا "مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَالْحَدِيْثِ "جو لوگ عربی کی بلاغت سے واقف ہیں، اور اس کی زبان کا صحیح ذوق رکھتے ہیں اہل زبان کی طرح، اور محض اللہ کا شکر و انعام ہے کہ ہمیں اسی حجاز و یمن کا فیض پہونچا ہے کہ ہم اس قابل ہوئے، ہمارے استاد عرب تھے، ہم نے ساری عربی عربوں سے پڑھی "الحمد للہ! تو ہم "لھو الحدیث "کا لطف لے رہے ہیں ہمارا عربی کا ذوق "لھو الحدیث" کے دائرے کی وسعت کو دیکھ رہا ہے، میں اس لفظ کا ترجمہ نہیں کر سکتا، حالانکہ لکھنؤ کا رہنے والا ہوں، میں اقرار کرتا ہوں کہ میں "لھو الحدیث" کے ترجمہ کا حق ادا نہیں کر سکتا

----اس کے معنی ہیں باتوں کا کھیل، اب بتایئے ----ریڈیو اور ویڈیو وغیرہ میں کیا ہے؟ اگر یہ ہوتا کہ بہت سے لوگ ہیں جو کھیل کو پسند کرتے ہیں، کھیل خریدتے ہیں تو اس میں ویڈیو اور ٹی وی نہ آتا ----مگر باتوں کا کھیل کہا گیا، یہ وہ ہے جو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ قرن اول، قرن ثانی، قرن ثالث، قرن رابع، اور پانچویں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں یہاں تک کہ میں کہوں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا ذہن بھی یہاں تک نہیں گیا ہوگا، (یعنی ویڈیو اور ٹی وی کی طرف) یہ قرآن کا معجزہ ہے حدیث کا لہو، باتوں کا کھیل، اور وہ کیا ہے، یہ ویڈیو کا پروگرام، ٹی وی کی بولتی تصویریں، یہ ویڈیو، یہ رکارڈ جو سنے جاتے ہیں،، سب "لھو الحدیث" ہیں آج سے چودہ سو برس پہلے جب یہ سب چیزیں ایجاد ہونا تو در کنار، کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا، اس وقت کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اس وقت اللہ کی کتاب نے کہہ دیا، بہت سے لوگ ہیں جو "لھو الحدیث" خریدتے ہیں۔

میرے عزیزو! آپ کو کم از کم اپنے گھروں کی حفاظت کرنی چاہئے، اور یہ سمجھنا چاہئے کہ عقائد میں بھی ہم کو پورا مسلمان ہونا چاہئے، عبادات میں بھی پورا مسلمان ہونا چاہئے، اور یہاں نہ ہوئے تو ہم کہاں ہوں گے اس کے بعد میں یہاں تک کہتا ہوں (مجھے معاف کریں آپ حضرات) آپ جب چھٹیوں میں یا کسی زمانے میں ہندوستان اپنے وطن جائیں تو غیر مسلم پہچان جائیں کہ بھائی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہندوستان میں نہیں اس سے کسی بہتر فضا میں رہ کر آئے ہیں، ان کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ نور ٹپک رہا ہے، ان کی باتوں سے شہد ٹپک رہا ہے، ان کی نگاہوں سے حرمت اور احترام ٹپک رہا ہے، معلوم ہوتا ہے، کہ یہ عرب سے آئے ہیں، یہ ہونا چاہئے، نہ یہ کہ دور سے دیکھ کر آدمی کہے کہ ان کے پاس بڑا قیمتی

بریف کیس ہے، لگتا ہے کہ عرب سے آئے ہیں، اور پیچھے پڑ جائیں لوگ، کہ کہیں سے اڑا لینا چاہیے، اس میں ہزاروں لاکھوں روپئے کی رقم ہوگی، آپ بریف کیس اور لباس سے نہ پہچانے جائیں۔ بلکہ آپ پہچانے جائیں اپنی صورتوں سے، سجدہ کے نشانوں سے، چہرہ کی نورانیت سے، الفاظ کی حلاوت سے، خیر خواہی سے، سنجیدگی و متانت سے اور تہذیب سے، آپ سے آپ کے گھر والے متاثر ہوں، آپ جتنے دن رہیں گے اپنے گھروں میں (خدا مبارک کرے) ان دنوں میں ان گھروں کی فضا بدل جائے، قرآن کی تلاوت نہیں ہوتی تھی تو ہونے لگی، وہاں اگر بہت سی سنتیں متروک تھیں تو شروع ہو جائیں۔ وہ لوگ آپ سے شرمائیں، اور کہیں کہ بھائی! جدہ کے لوگ آئے ہیں، مکہ کے لوگ آئے ہیں، مدینہ کے لوگ آئے ہیں، دیکھو، ریڈیو نہیں بجنا چاہیے، ٹی وی یہاں نہیں ہونا چاہیے چہ جائے کہ لوگ کہیں (ارے بھائی! مکہ مدینہ کے لوگ آئے ہیں، وہاں بہت ہوتی ہے، ان کو دکھاؤ ان کے زمانہ میں تو اور ہونا چاہیے) یہ بڑی بے حرمتی ہے اس جگہ کی، آپ کی وجہ سے وہ چیزیں بند ہو جانی چاہئیں، آپ کے جانے سے ان لوگوں کو شرم آنی چاہیے کہ اب موقع نہیں رہا۔

آپ جب جائیں تو جس طرح روشنی تاریکی کو چیرتی ہے، اور چیرتی ہوئی چلی جاتی ہے، آپ کی صورتیں وہاں کے بحر ظلمات میں روشنی کا کام دیں، آپ کی زندگیوں میں یہیں انقلاب آنا چاہیے وہاں جانے سے پہلے آپ کے اندر تبدیلیاں آنی چاہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے بعد فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے درمیان تین چار برس کے عرصہ میں جتنی کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے، امام زہریؒ جو

سید التابعین ہیں ان کا قول ہے کہ مکہ معظمہ کے تیرہ برس کے قیام میں اور مدینہ طیبہ کے دس برس کے مبارک قیام میں، اتنی کثرت سے لوگ مسلمان نہ ہوئے، اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کی وجہ سے راستہ کھل گیا۔ اور بے تکلف قریش آنے لگے مکہ معظمہ اپنے عزیزوں کے یہاں اب ان کی جتنی راتیں گزرتیں انکو دیکھ کر مکہ والے حیران تھے ------ اور کہتے کہ ان کا تو عالم ہی دوسرا ہے، یہاں راتوں کو لوگ اٹھتے ہیں، یہاں تو بچے بھی اٹھتے ہیں، ان کے یہاں تو جھوٹ بولنا کیا، کوئی لغویات کرنا نہیں جانتا، ہر وقت اللہ رسولؐ کی باتیں ہوتی ہیں، یہاں تو اتنا ایثار ہے کہ مہمان کے لئے تھپکا کر بچوں کو بھوکا سلادیتے ہیں، بس وہ مسلمان ہونا شروع ہوئے، کیونکہ انہوں نے اسلام کا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

حضرات! آپ لوگوں کے ذریعہ بھی آپ کے ملکوں میں اسلام پھیلنا چاہئے، یہاں سے آپ اگر مراسلہ اور رابطہ قائم کریں تو یہی اثر دیں، خود جائیں تو پورے طور پر اثر ڈالیں ان لوگوں پر کہ آپ اس جگہ سے آئے ہیں، اپنے ساتھ برکتوں کا خزانہ لے کر آئے ہیں۔

اب میں اس سے زیادہ طول دینا نہیں چاہتا آپ اس آیت کو اپنے دل پر نقش کرلیں "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً۔"

اے ایمان والو! خدا کے ساتھ صلح کرنے میں پورے پورے داخل ہوجاؤ، اور شیطان کے نقشہائے قدم کی پیروی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، دیکھئے یہاں نقش قدم (واحد) استعمال نہیں کیا گیا، خُطُوٰاتِ الشَّیْطٰنِ جمع کا صیغہ لایا گیا، معلوم ہوا کہ اس کے بہت سے نقش قدم ہیں، اس میں وسعت آگئی، خواہ اعتقادی چیزیں ہوں، خواہ عملی چیزیں ہوں، خواہ اخلاقی چیزیں ہوں، خواہ تہذیبی چیزیں

ہوں، خواہ سیاسی چیزیں ہوں سب اس میں شامل ہیں اور اس بات کا آپ خیال رکھیں کہ آج اگر ہمارے مسلم معاشرہ میں یہ باتیں ہوتیں تو وہ خرابیاں پیش نہ آتیں جو بہت سی جگہ پیش آرہی ہیں کہ کوئی فرق نہیں ہے صالح اور غیر صالح میں، دین دار اور بے دین میں، شریعت پر چلنے والے اور نہ چلنے والے میں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا کرے، یہاں کا رہنا قبول فرمائے، اس کی برکتوں سے مالامال کرے، اور آپ کی برکتوں سے فیض پہونچے آپ کے ملکوں میں، جہاں سے آپ آئے ہیں، جن کا حق آپ پر قائم ہے اور قائم رہے گا، چاہے آپ یہیں کے ہو جائیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

☆☆☆☆

☆☆☆

مُحسنِ عالم

یہ تقریر ۲؍ مئی ۱۹۷۵ء کو اسلامک اسٹڈی سرکل کے زیر اہتمام گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں کی گئی، جس میں تاریخی حقائق وواقعات کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ صحیح معنی میں رحمت عالم اور محسن انسانیت ہیں، اور آپ کا احسان نسل انسانی اور تہذیب و تمدن پر ناقابل انکار اور ناقابل فراموش ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محسنِ عالم

رحمۃ للعالمین ﷺ

"وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ"

حضرات!

میں نے آپ کے سامنے سورۂ انبیاء کی ایک آیت پڑھی ہے اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد فرماتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ ﷺ "ہم نے آپ کو سارے جہاں اور جہاں والوں کے لئے محض رحمت بنا کے بھیجا ہے" یہ خدا کی طرف سے ایک حیرت انگیز (اور اگر رحمت کی روح اور مفہوم کے منافی نہ ہوتا تو میں کہتا کہ) ایک تہلکہ خیز اعلان ہے، یہ اعلان اس صحیفہ میں کیا گیا ہے، جس کے لئے تقدیر الٰہی کا فیصلہ تھا کہ وہ دنیا کے ہر حصہ میں (اور اپنے نزول کے بعد) تاریخ انسانی کے ہر دور میں پڑھا جائے گا۔ اس کے پڑھنے والے بھی لاکھوں کروڑوں انسان ہوں گے، اس پر غور کرنے والے، اس کی تشریح کرنے والے، اس کے

اسرار اور رموز بیان کرنے والے، اس کے ایک ایک لفظ، بلکہ ایک ایک حرف کی تحقیق کرنے والے، اس کو تنقید اور شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے والے، اور اس کو علم و تحقیق کی ترازو میں تولنے اور اس کو واقعات کی کسوٹی پر کسنے والے انسانوں کا سلسلہ بھی قیامت تک ختم نہیں ہوگا، ایک شخص ایک بیان جاری کرتا ہے، کوئی مضمون نگار کسی اخبار یا رسالہ میں (جس کی زندگی عام طور پر مختصر اور پڑھنے والوں کا حلقہ اکثر محدود ہوتا ہے) کوئی مضمون لکھتا ہے، تو...... اس کو اس اندیشہ سے کئی کئی بار غور کرنا پڑتا ہے، اور وہ ترازو میں تول تول کر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ کوئی اس کی تردید نہ کردے، اور اس کی صداقت کو چیلنج نہ کرے، کتابوں کا معاملہ اس سے بھی مختلف ہے کہ ان کی عمریں عام طور پر اخبارات ورسائل سے زیادہ طویل ہوتی ہیں، اور بعض اوقات سالہا سال تک وہ لوگوں کے مطالعہ میں رہتی ہیں، اور کوئی کوئی کتاب صدیوں تک بھی زندہ رہتی ہے، اس میں کسی بات کو درج یا کسی چیز کا دعویٰ کرتے ہوئے مصنف کو اپنی ذمہ داری کا زیادہ احساس ہوتا ہے، وہ لکھنے کے لئے قلم اٹھاتا ہے تو اس کو پہلے کسوٹی پر کستا ہے، اور دیکھتا ہے کہ اس دعویٰ یا اعلان کا پڑھنے اور سننے والوں پر کیا ردعمل ہوگا، اس کے بعد غور کیجئے کہ خدائے علام الغیوب ایک ایسی کتاب میں یہ اعلان کرتا ہے جس کے متعلق وہ خود ہی کہتا ہے کہ "لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ط تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ" (اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے (اور) دانا (اور) خوبیوں والے خدا کی اتاری ہوئی ہے) اور جس کے متعلق اس کا اعلان ہے کہ "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" (بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہمیں نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔)

اس اعلان کی وسعت و عظمت اس کے زمانی و مکانی رقبہ کا طول و عرض دونوں ایسی غیر معمولی باتیں ہیں، جن سے سرسری طور پر گزرا نہیں جاسکتا۔

زمانی رقبہ سے مراد یہ ہے کہ بعثتِ محمدی سے لے کر قیامت تک جتنی نسلیں دنیا میں آئیں گی اور تاریخ کے جتنے دور گزریں گے، یہ اعلان ان سب پر حاوی ہے، اور یہ آیت اس پورے زمانی رقبہ کو جو ہزاروں سال پر پھیلا ہوا ہے، گھیرتی (COVER) کرتی ہے۔

مکانی رقبہ کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ دنیا کا کوئی گوشہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا، یہ نہیں کہا گیا کہ ہم نے آپ کو جزیرۃ العرب کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے، یا مشرق کے لئے یا کسی براعظم مثلاً ایشیاء کے لئے پیام رحمت بنایا ہے، اس کے برخلاف یہ کہا گیا ہے کہ یہ رحمت ساری دنیا پر محیط ہے گویا اردو کے شاعر حالیؔ کی زبان میں ۔

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

واقعہ یہ ہے کہ اس اعلان کی وسعت، عمومیت، عظمت اور لامحدودیت کے سامنے دنیا کے سارے مؤرخین، فلاسفہ، مفکرین، مصنفین بلکہ پورے فکر انسانی کو انگشت بدنداں، حیرت زدہ اور ششدر ہو کر کھڑا ہو جانا چاہئے، اور ایک بار سب کام چھوڑ کر اس واقعہ کی تصدیق، اور اس اعلان کی صداقت کی تحقیق میں مصروف ہو جانا چاہئے، مذاہب ہی کی تاریخ میں نہیں، تمدنوں اور فلسفوں ہی کی تاریخ میں نہیں، اصلاحی اور انقلابی تحریکوں اور کوششوں ہی کی تاریخ میں نہیں، بلکہ پوری تاریخ انسانی، اور پورے انسانی لٹریچر میں ایسا پر اعتماد، ایسا واضح اور بے

لاگ، ایسا عمومی وعالمگیر اعلان، کسی شخصیت یا کسی مذہب ودعوت کے متعلق نہیں ملتا، مذاہب عالم کی تاریخیں، انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں، اور تعلیمات کا جو ریکارڈ دنیا میں محفوظ ہے، وہ بھی اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

دنیا کا ایک مشہور اور قدیم مذہب یہودیت ہے، اس کا حال یہ ہے کہ وہ خدا کا تصور بھی جو کائنات اور تمام مخلوقات کا خدا ہے، زیادہ تر بنی اسرائیل کے خدا کی حیثیت ہی سے کرتی ہے، عہد عتیق کے اکثر صحیفے، اور یہودیوں کا مذہبی لٹریچر، خدا کے رب کائنات اور رب العالمین کے تصور سے خالی ہے، اس لئے ان کی تاریخ اور ان کے صحیفوں مین کسی پیغمبر کے متعلق وہ چاہے، موسیٰ وہارون جیسے باعظمت، یا داؤد اور سلیمانؑ جیسے صاحب سلطنت پیغمبر ہوں، کسی ایسے اعلان کو تلاش کرنا، فعل عبث اور اضاعت وقت کے مرادف ہے، یہ مذہب کبھی بھی نسل انسانی کا عمومی اور ان کے لئے بلا تفریق نسل ونسب، ہدایت ورحمت کا پیغام نہیں رہا، اور نہ اس میں کبھی غیر اسرائیلی قوموں اور افراد کو یہودیت کی دعوت و تبلیغ کی ہمت افزائی کی گئی۔

عیسائی مذہب جو اپنے تبلیغی جوش وہمدردی بنی نوع انسان کے لئے مشہور ہے، اس کے پیغمبر (حضرت مسیح علیہ السلام) بار بار اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ "وہ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کیلئے آئے ہیں" انہوں نے اپنے شاگردوں سے صفائی سے کہا، "میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا"۔ جب ان کی توجہ ان مریضوں کی مسیحائی کی طرف منعطف کی گئی، جو بنی اسرائیل سے نسل ونسب کا کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے تو انہوں نے معذرت کر دی اور فرمایا کہ "لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو ڈال دینا اچھا

نہیں ہے"۔ انہوں نے جب اپنے بارہ حواریوں کو تبلیغ کیلئے بھیجا تو انہوں نے ان کو حکم دیکر کہا۔"غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا"۔

دوسرے مشرقی وایشیائی مذاہب ہندومت وغیرہ کا معاملہ اس سے زیادہ کچھ مختلف نہیں، بلکہ نسل ونسب کی تقدیس اور بے لوچ اور بے رحم انسانی تقسیم میں وہ کچھ آگے ہی بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں، قدیم ہندوستانی سماج میں شودر ہر قسم کی عزت ومساوات بلکہ اکثر اوقات عام انسانی حقوق اور عام انسانی ہمدردی سے بھی محروم تھے، ان کو علم حاصل کرنے، دوسروں کو تعلیم دینے، اور روحانی ترقی کے مدارج طے کرنے کی اجازت نہ تھی، وید کی تعلیم اپنے لئے اور دوسروں کے لئے دیوتاؤں کے چڑھاوے چڑھانا، اور دان دینا برہمنوں کا حق قرار دیا گیا تھا، وید کی تعلیم حاصل کرنے اور پڑھنے کی اجازت صرف چھتریوں اور ویش کو دی گئی تھی، اور منوشاستر کی تصریح کے مطابق "شودر کے لئے قادر مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا اور وہ ان تینوں کی خدمت کرنا ہے"۔ ہندوستان کے قدیم باشندے عام طور پر ہمالیہ پہاڑ کے پیچھے دنیا کا تصور نہیں کرتے تھے، ان کو باہر کی دنیا اور عام انسانوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اس لئے یہاں کسی مصلح، کسی رشی بلکہ کسی پیغمبر کے متعلق بھی (جن کا اس ملک میں پیدا ہونا قرآن مجید کے نصوص کے مطابق ممکن اور ہر طرح قرین قیاس ہے) اس قسم کے کسی اعلان کا تلاش کرنا بیکار ہے، حقیقت یہ ہے کہ جن مذاہب میں رب العالمین ہی کا تصور نہیں، ان میں اپنے کسی پیغمبر کے متعلق رحمۃ للعالمین ہونے کا تصور یا اعلان پایا جانا غیر منطقی اور غیر فطری بات ہے۔

حضرات! کسی چیز کی اہمیت و عظمت اور قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لئے عام طور پر دو پیمانے ہوتے ہیں، ایک اس کی تعداد اور مقدار جس کو ہم جدید علمی اصطلاح میں "کمیت" QUANTITY کے لفظ سے ادا کرتے ہیں، اور ایک کسی شئی کا جوہر یا صفت ہے، جس کو اصطلاحاً "کیفیت" QUALITY کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ قرآنی اعلان جو محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق کیا گیا ہے، ان دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہے، یعنی آپ کی بعثت و نبوت، آپ کے وجود گرامی، اور آپ کی تعلیمات سے انسانیت کو جو فیض پہنچا، اس کو حیات نو کا جو پیغام ملا، اور اس کی بیماریوں کا جو مداوا، اس کے مصائب کا جو خاتمہ ہوا، اس پر رحمتوں اور برکتوں کا جو دروازہ کھلا وہ اپنی وسعت و کثرت اپنی مقدار و کمیت (QUANTITY) کے اعتبار سے بھی اور اپنی نوعیت و افادیت، اپنے جوہر و کیفیت (QUALITY) کے اعتبار سے بھی بے نظیر و بے مثال ہے، "رحمت" ہماری روز مرہ زندگی کا ایک کثیر الاستعمال لفظ ہے، اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے، جس سے کسی انسان کو فائدہ یا راحت حاصل ہو، اس کے انواع و اقسام اور اس کے مراتب و درجات کا کوئی ٹھکانہ نہیں، اگر کوئی کسی کو پانی پلا دیتا ہے تو وہ بھی ایک طرح کی "رحمت" ہے، اگر گرمی میں کوئی کسی کو پنکھا جھل دیتا ہے تو وہ بھی ایک طرح کی "رحمت" ہے ماں اپنے بچہ کو پیار کرتی ہے، باپ اپنے لڑکے کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتا ہے، اور اس کے لئے زندگی کا ضروری سامان مہیا کرتا ہے، وہ اس سے بھی بڑی ایک "رحمت" ہے، استاذ طالب علم کو پڑھاتا ہے، اس کو علم کی نعمت بخشتا ہے، یہ بھی ایک بڑی قابل قدر "رحمت" ہے بھوکے کو کھانا کھلانا، ننگے کو کپڑا پہنانا سب "رحمت" کے مظاہر ہیں،

اور سب کا اعتراف ضروری اور شکریہ واجب ہے۔

لیکن ''رحمت'' کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ کسی جاں بلب مریض کی جان بچالی جائے، ایک بچہ دم توڑ رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہےکہ عنقریب آخری ہچکی لے گا، ماں رو رہی ہے کہ میرا لال دنیا سے رخصت ہو رہا ہے کہ، اس سے کچھ نہیں ہو سکتا، باپ مارا مارا پھر رہا ہے، اور سر پھوڑ رہا ہے، سب بے بس معلوم ہوتے ہیں، کہ اچانک ایک طبیب حاذق فرشتۂ رحمت بن کر پہنچتا ہے، اور کہتا ہے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں! وہ دوا کا ایک قطرہ بچہ کے حلق میں ٹپکاتا ہے، وہ آنکھیں کھول دیتا ہے، سب اس کو خدا کا بھیجا ہوا فرشتہ کہیں گے اور وہ ساری رحمتیں جن کا میں نے نام لیا۔ اس ''رحمت'' کے سامنے مات ہو جائیں گی، اس لئے کہ یہ اس مریض ہی پر نہیں، بلکہ اس کے چھوٹے سے کنبہ اور اس سے محبت کرنے والوں پر بھی احسان عظیم ہے کہ اس کی جان بچالی گئی، کوئی نابینا چلا جارہا ہے، راستہ میں کوئی خندق یا کوئی کنواں پڑ گیا، قریب ہے کہ اس کا اگلا قدم اسی خندق یا کنویں میں ہو، اللہ کا ایک بندہ عین وقت پر پہونچتا ہے، اور وہ اس کی کمر پکڑ لیتا ہے، اور اس کو اس خندق میں گرنے سے بچالیتا ہے تو وہ اس کے حق میں فرشتۂ رحمت کہلائے گا، ایک نوجوان جو اپنے ماں باپ کی آنکھ کا تارا اور اپنے کنبہ کا سہارا ہے، دریا میں ڈوبنے لگا، وہ غوطے کھا رہا ہے، کوئی گھڑی ہے کہ وہ تہ نشین ہو جائے، ایسے میں اللہ کا بندہ اپنی جان پر کھیل کر کوُد پڑتا ہے، اور اس کی جان بچالیتا ہے، اس کے ماں باپ اور بھائی فرط مسرت اور احسان مندی کے جذبہ سے اس سے لپٹ جاتے ہیں، اور ساری عمر اس کا احسان نہیں بھولتے۔

لیکن ''رحمت'' کا آخری مظہر یہ ہے کہ پوری انسانیت کو ہلاکت سے

بچایا جائے، پھر ہلاکت ہلاکت اور خطرہ خطرہ میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے، ایک عارضی ہلاکت اور تھوڑی دیر کا خطرہ ہے، ایک ابدی ہلاکت اور دائمی خطرہ ہے، خدا کے پیغمبر انسانوں کے ساتھ "رحمت" کا جو معاملہ کرتے ہیں، وہ ان رحمتوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، یہ زندگی کا مواج سمندر، یہ زندگی کا طوفانی دریا، جو انسانوں اور افراد ہی کو نہیں، قوموں اور ملکوں کو غرق کر چکا ہے، تہذیبوں اور تمدنوں کو لقمۂ اجل بنا چکا ہے، جس کی موجیں نہنگوں کی طرح منہ پھیلا کر بڑھتی اور بپھرے ہوئے شیر کی طرح انسانوں پر حملہ کرتی ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ اس بے رحم دریا سے کس طرح پار اترا جائے اور انسانی قافلہ کو ساحل مراد بلکہ ساحل نجات پر پہنچایا جائے، نوع انسانی کا سب سے بڑا محسن اور اس کا نجات دہندہ وہ قرار پائے گا جس انسانی کشتی کو جو ڈانواڈول ہو رہی ہے، جس کے سوار موجود ہیں، لیکن ملاح مفقود، ساحل تک پہنچادے.......... نوع انسانی ان کی بھی شکر گزار ہے، جو اس کو علم و فن کا تحفہ دیتے ہیں، وہ ان کی بھی شکر گزار ہے، جو اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں، وہ ان کی بھی شکر گزار ہے، جنہوں نے اس کی زندگی کو پُر راحت بنایا اور اس کی زندگی کے مشکلات کو ختم یا کم کیا، وہ کسی کے احسان کی ناقدری نہیں کرتی، لیکن اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اسکو ان دشمنوں سے بچایا جائے، جو اس کی جان کے دشمن ہیں، اور اس کی کشتی پار لگائی جائے۔

اس زندگی کی بے رحم موجیں اور اس دریا کے ظالم و خونخوار نہنگ کیا ہیں؟

اس کائنات کے پیدا کرنے والے کی ہستی، اس کی حقیقی صفات اور مقام سے بے خبری، شرک، اصنام و اوہام پرستی میں مبتلا ہونا ہے، انسانیت کی بے شعوری اور خود فراموشی، خدا ناشناسی اور نفس پرستی، اپنے حدود سے تجاوز کر جانا، اخلاق کا بگاڑ،

جذبات کی سرکشی، اپنا فرض ادا کرنے سے انکار، اور اپنا حق وصول کرنے پر اصرار ہے، زندگی کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ زندگی کی چول اپنی جگہ سے ہٹ جائے، انسان اپنے مقام و مرتبہ اور اپنے مقصد زندگی سے غافل ہو جائے، وہ اپنے کو ایک بھیڑیا سمجھنے لگے یا سانپ و اژدہا، انسان جب ان حقیقتوں کو بھول جاتا ہے، تو زندگی کا یہ دریا، آگ کا دریا بن جاتا ہے، پھر انسان، انسان کو کھانے لگتا ہے، پھر سانپوں، بچھوؤں، بھیڑیوں، اور چیتوں کی ضرورت نہیں رہتی، انسان سب سے بڑا بھیڑیا بن جاتا ہے، جس کے سامنے بھیڑیے کان پکڑیں، وہ ایسا شیطان بن جاتا ہے، جس کے سامنے شیطان ناک رگڑے، اس وقت انسان اپنی لگائی ہوئی آگ میں خود سلگتے اور جلتے ہیں، باہر کی کسی آگ کی ضرورت نہیں۔

یہ وقت ہوتا ہے، جب خدا کی غیرت حرکت میں آتی ہے، اس کی رحمت کا ظہور ہوتا ہے، اس وقت باد بہاری کا ایک جھونکا آتا ہے، اور مردہ انسانیت کو تر و تازہ اور انسانیت کے خزاں رسیدہ چمن کو پر بہار بنا جاتا ہے، انسانیت کو اس وقت ایسے ملاحوں کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس کی کشتی کو پار لگائیں۔

اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لئے میں ایک تمثیل سے کام لوں گا، جو خدا کے پیغمبر کے منصب و مقام اور اس کے کام کی نوعیت و حیثیت کے سمجھنے میں وہ خدمت انجام دے سکتی ہے، جو بہت سی دقیق علمی اور فلسفیانہ دلائل نہیں دے سکتے۔

کہتے ہیں کہ زندہ دل نوجوانوں کی ایک پارٹی "پکنک" کے لئے روانہ ہوئی، انہوں نے ایک ملاح سے طے کیا کہ وہ ان کو دریا کی سیر کرائے گا، اور اس تفریح گاہ تک پہنچا دے گا جو دریا کے دوسرے کنارے پر واقع ہے، صبح کا سہانا وقت

تھا، طبیعت موج پر تھی، کام کچھ نہ تھا، وہ آپس میں تو باتیں کیا ہی کرتے تھے، اس مرتبہ انہوں نے ملاح کو تفریح کا ذریعہ بنایا، وہ اس سے دل بہلانے لگے، ان میں سے ایک صاحبزادے نے کہا کہ چچا! آپ نے کچھ تعلیم بھی حاصل کی ہے؟ اس ملاح نے سر جھکا کے کہا نہیں، بھیا میں تو کچھ پڑھا لکھا نہیں ہوں، میرے یہاں تو پرکھوں سے یہی ناؤ کھینے کا پیشہ چلا آرہا ہے، ناؤ چلاتا ہوں، چار پیسے کما لیتا ہوں، اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھر لیتا ہوں، دوسرے صاحبزادے بولے، چچا جان! آپ نے گرامر تو پڑھی ہوگی، انگلش لٹریچر کا تو مطالعہ کیا ہوگا؟ ملاح نے کہا میں تو آج پہلی مرتبہ یہ بھاری بھرکم نام سن رہا ہوں تیسرے صاحب بولے کہ آپ نے جامیٹری تو ضرور پڑھی ہوگی، اس کے بغیر تو کشتی چلائی نہیں جاسکتی؟ کس زاویہ (AN-GLE) سے چلائی جائے، کس زاویہ سے نہ چلائی جائے؟ اس نے کہا میں کچھ نہیں سمجھا، اسی طرح انہوں نے اپنے ان سب مضامین کا باری باری سے نام لیا، جو وہ کالج میں پڑھتے تھے، اور آخر میں پوچھا کہ آپ نے الجبرا تو پڑھا ہی ہوگا، وہ بڑا ضروری علم ہے؟ ملاح بیچارے نے شرما کر کہا کہ بھیا، یہ شہر کا نام ہے یا آدمی کا؟ لڑکوں نے ایک قہقہہ لگایا، پھر ملاح سے پوچھا تمہاری عمر کیا ہے؟ ملاح نے کہا یہی کوئی چالیس برس ہوگی، لڑکے کہنے لگے کہ جاؤ تم نے اپنی آدھی عمر کھوئی، ملاح خاموش ہوگیا، اللہ کو اس کی غریبی اور جہالت پر رحم آیا، اب اس کی باری آئی، دریا ابھی تک پرسکون تھا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس میں طوفان آیا، بڑی بڑی لہریں اٹھنی شروع ہوئیں، ان لہروں نے اس کشتی سے ایسی شوخیاں کرنی شروع کیں، جیسی یہ لڑکے ملاح سے کر رہے تھے، کشتی کبھی اس طرف جھکتی کبھی اس طرف، لڑکوں کا یہ حال تھا کہ اوپر کی سانس اوپر نیچے کی سانس نیچے، ملاح تھوڑی دیر تک تو خاموش یہ تماشا دیکھتا رہا،

پھر بڑی سنجیدگی کے ساتھ منہ بنا کر کہا، بھیا! تم نے کچھ پیرنا بھی سیکھا ہے؟ ایک تو حقیقت حال نے ان کو سنجیدہ بنادیا تھا، اور وہ ساری شوخی اور طباعی بھول گئے تھے، موت ان کو سامنے کھڑی نظر آرہی تھی، انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا کہ چچا جان! پیرنا تو نہیں سیکھا، لڑکوں نے تو یہ کہا تھا کہ جاؤ تم نے آدھی عمر کھوئی، ملاح نے بڑے بلیغ اور ادبی انداز میں کہا (بعض مرتبہ بے پڑھے لوگوں کی زبان سے ایسے فقرے نکل جاتے ہیں کہ بڑے بڑے شاعر اور ادیب ان پر سر دُھنتے ہیں) کہ جاؤ میں نے تو اپنی آدھی عمر کھوئی تھی، تم نے اپنی ساری عمر ڈبوئی، اگر یہ کشتی ڈوبی تو تم جو نام لے رہے تھے (بھاری بھاری لفظ بیچارے ملاح کو کہاں یاد رہ سکتے تھے) وہ تمہارے کیا کام آئیں گے، تم کچھ نہ پڑھتے مگر پیرنا سیکھ لیتے تو کہیں اچھے رہتے، تم سے تو میں دو ٹکے کا ملاح اچھا کہ میں پیرنا جانتا ہوں، اپنی جان بچالوں گا۔

تاریخ انسانی ہمیں بتلاتی ہے، اور اس کا ریکارڈ موجود ہے کہ جب زندگی کی کشتی انسانوں کی بد اعمالی سے الٹی یا ڈوبی تو کوئی چیز نہیں بچی، تہذیبوں نے ہزاروں برس میں جو سرمایہ پیدا کیا تھا، ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دماغ کا نچوڑ، ان کی ذہانت کا جوہر، ادب، شاعری، فلسفہ کا انمول خزانہ وہ سب اس کشتی، اور اس کشتی کے سواروں کے ساتھ ڈوب گیا، زندگی کی یہ کشتی، شاعری کے انحطاط، ادب کے زوال، تعلیم گاہوں کی کمی اور اعلیٰ تعلیم کے فقدان دولت و سرمایہ کی کمی یا معیار زندگی کے پست ہو جانے سے نہیں ڈوبی، وہ اس وجہ سے ڈوبی کہ انسان خودکشی پر آمادہ ہو گیا تھا، اس نے جس شاخ پر اپنا نشیمن بنایا تھا، اور جس شاخ پر اس کا سارا کنبہ اور اس کی متاع تھی، اسی شاخ پر وہ تیشہ چلانے لگا، تاریخ بتاتی ہے کہ انسانوں کے دماغوں پر ایسے دورے پڑتے رہے ہیں، کہ انسان تعمیر کے بجائے تخریب پر اتر آیا

ہے، ہم نے بارہا حیرت کی آنکھوں سے دیکھا ہے، یقین نہیں آتا تھا، لیکن یقین کرنا پڑا کہ انسانوں نے اسی شاخ کو پورے جوش کے ساتھ کاٹنا شروع کر دیا، جس پر ان کا آشیانہ تھا، گویا کہ یہ ایک نہایت عظیم الشان کارنامہ اور کوئی زبردست تعمیری کام ہے، انسان ہلاکت کی خندق میں چھلانگ لگانے پر اصرار کر رہا ہے، زندگی سے بیزار اور ہلاکت کے لئے بے قرار ہے، گویا زندگی کوئی عذاب اور ہلاکت کوئی عظیم نعمت اور عظیم ترین لذت ہے۔

چھٹی صدی مسیحی میں عالمگیر پیمانہ پر یہی کیفیت نظر آتی ہے، اس وقت پوری نوع انسانی خودکشی پر آمادہ نہیں کمربستہ تھی، جیسے خودکشی کرنے کی اس نے قسم کھالی تھی، ساری دنیا میں خودکشی کی تیاری ہو رہی تھی، اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں اس منظر اور صورت حال کی جو تصویر کھینچی ہے، اس سے بہتر کوئی بڑے سے بڑا مصور، ادیب و مؤرخ تصویر نہیں کھینچ سکتا، وہ فرماتا ہے: "وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا" (اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے، اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے، تو خدا نے تم کو اس سے بچالیا) ہمارے مؤرخوں اور سیرت نگاروں کا خدا بھلا کرے، ان سے جاہلیت کی تصویر پورے طور پر نہ کھینچ سکی، وہ نہ صرف قابل معافی بلکہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ادب اور زبان کا ذخیرہ ساتھ نہیں دیتا، واقعہ اور صورت حال اتنی سنگین، اتنی نازک اتنی مہیب اور اتنی پیچیدہ اور دقیق تھی کہ موئے قلم سے اس کی تصویر اور زبان وادب کی بڑی سے بڑی قدرت وصلاحیت

سے اس کی تعبیر ممکن نہیں، کوئی مؤرخ اس کا حق کیسے ادا کر سکتا ہے؟ دورِ جاہلیت جس میں جس میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی، کیا وہ ایک یا دو قوموں کے انحطاط یا اخلاقی بگاڑ کا مسئلہ تھا، خالی بُت پرستی کا مسئلہ تھا، اخلاقی جرائم وذمائم کا مسئلہ تھا، شراب نوشی، قماربازی عیش پرستی، ہوس رانی، حقوق کی پامالی، ظلم واستبداد، معاشی استحصال، جابر اور بیداد حکومتوں، ظالمانہ نظاموں اور غیر منصفانہ قوانین کا مسئلہ تھا، ؟ کیا مسئلہ یہ تھا کہ کسی ملک میں باپ اپنی نوزائیدہ بچی کو زندہ درگور کر رہا تھا؟ مسئلہ یہ تھا کہ انسان انسانیت کو خاک میں ملا رہا تھا، مسئلہ یہ نہیں تھا کہ عرب کے کچھ سنگ دل اور قسی القلب لوگ اپنی اپنی معصوم بچیوں کو جھوٹی شرم، اور خیالی ننگ وعار سے بچنے کے لئے ایک خود ساختہ تخیل اور ایک ظالمانہ روایت کی بناء پر اپنے ہاتھوں زمین میں زندہ دفن کر دینا چاہتے تھے، مسئلہ یہ تھا کہ مادر گیتی اپنی پوری نسل کو زندہ دفن کرنا چاہتی تھی، وہ دَور ختم ہو چکا اب اس کو کیسے لاکر سامنے کھڑا کر دیا جائے، وہ دَور جن لوگوں نے دیکھا تھا، وہی اس کی حقیقت کو سمجھتے اور جانتے تھے۔

مسئلہ کسی ایک ملک و قوم کا بھی نہیں تھا، نہ کسی ایک مغالطہ اور فریب کا تھا، مسئلہ انسانیت کی قسمت کا تھا، مسئلہ نوعِ انسانی کے مستقبل کا تھا، اگر کوئی مصور ایسی تصویر پیش کرے، جس میں دکھایا گیا ہو کہ نوع انسانی کی نمائندگی ایک انسان کر رہا ہے، ایک حسین و جمیل پیکر، ایک فربہ و توانا جسم، جو خدا کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے، جس سے آدم کا نام زندہ اور اس کا سلسلہ قائم ہے، جو مسجود ملائکہ ہے، اور مقصود آفرینش، جس کے سر پر خدا نے خلافت کا تاج رکھا ہے، اور جس کی وجہ سے یہ کرۂ ارضی ایک خرابہ اور ویرانہ نہیں ایک آباد اور گلزار جگہ ہے، اس انسان کے

سامنے آگ کا ایک سمندر ہے، ایک نہایت مہیب خندق ہے، جس کی کوئی تھاہ نہیں، وہ انسان اس میں چھلانگ لگانے کے لئے تیار کھڑا ہے، اس کے پاؤں اٹھ چکے ہیں، اور وہ مائل بہ پرواز ہے، ایسا نظر آرہا ہے کہ چند لمحوں میں وہ اس کی اندھیروں میں غائب ہو جائے گا، اگر اس دَور کی ایسی تصویر کھینچی جائے تو کسی حد تک اس صورتِ حال کا اندازہ ہو سکتا ہے، جو بعثت کے وقت پائی جاتی تھی، اور اسی حقیقت کو بیان کرنے کیلئے فرمایا گیا ہے کہ :"وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا" اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے، خدا نے تم کو اس سے بچالیا)۔

اور اسی بات کو نبوت نے ایک تمثیل میں بیان کیا ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "میری اس دعوت وہدایت کی مثال جس کے ساتھ مجھے دنیا میں بھیجا گیا ہے، ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی، جب اس کی روشنی گردو پیش میں پھیلی تو وہ پروانے اور کیڑے جو آگ پر گرا کرتے ہیں، ہر طرف سے امنڈ کر اس میں کودنے لگے، اسی طرح سے، تم آگ میں گرنا اور کودنا چاہتے ہو، اور میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ تم کو اس سے بچاتا اور علیٰحدہ کرتا ہوں"۔

حقیقتاً اصل مسئلہ یہی تھا کہ انسانیت کی کشتی کو سلامتی کے ساتھ پار لگایا جائے، جب انسان اپنے صحیح "موڈ" میں آجائے گا، جب زندگی میں اعتدال اور توازن پیدا ہو جائے گا، تو ان سب تعمیری، فلاحی، علمی، ادبی اور ترقیاتی کوششوں اور منصوبوں کا دَور آئے گا، جن کی صلاحیت مختلف انسانوں اور انسانیت کے بہی خواہوں میں پائی جاتی ہے، حقیقتاً ساری دنیا پیغمبروں کی احسانمند ہے کہ انہوں نے نوع انسانی کو ان خطرات سے بچالیا جو اس کے سر پر ننگی تلوار کی طرح لٹک رہے تھے، دنیا کا

کوئی علمی، تعمیری، اصلاحی کام، کوئی فلسفہ کوئی دبستانِ فکر، ان کے احسان سے سبک دوش نہیں، سچ پوچھئے تو موجودہ دنیا اپنی بقا اور ترقی اور زندگی کے استحقاق میں پیغمبروں ہی کی رہینِ منت ہے، انسانوں نے زبانِ حال سے کئی مرتبہ یہ اعلان کیا کہ اب ان کی افادیت ختم ہوگئی اور اب وہ دنیا کے لئے اور اپنے لئے کوئی نافعیت، برکت ورحمت اور کوئی پیغام اور دعوت نہیں رکھتے، انہوں نے اپنے خلاف خدا کی عدالت میں خود نالش کی اور گواہی دی، ان کی مسل تیار تھی، اور وہ اپنے کو بڑی سے بڑی سزا بلکہ سزائے موت کا مستحق ثابت کر چکے تھے۔

جب تمدن اپنے حدود سے تجاوز کر جاتا ہے، جب وہ اخلاقیات کو یکسر فراموش کر دیتا ہے، جب انسان اپنی سفلی خواہشات اور نفس کے حیوانی تقاضوں کی تکمیل کے سوا ہر مقصد اور ہر حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے، جب اس کے پہلو میں انسان کے دل کے بجائے بھیڑیے اور چیتے کا دل پیدا ہو جاتا ہے، جب اس کے جسم میں ایک فرضی معدہ اور ایک لامحدود نفس امارہ جنم لیتا ہے، جب دنیا پر جنون کا دورہ پڑتا ہے تو قدرت خداوندی اس کو سزا دینے یا اس کے جنون کے نشہ کو اتارنے کے لئے نئے نئے نشتر اور نئے نئے جراح پیدا کرتی ہے ؎

کرتی ہے ملوکیت اندازِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور یا چنگیز

آپ ملوکیت کے لفظ کو تمدن سے بدل دیجئے کہ تمدن کا بگاڑ اور تمدنی جنون، ملوکیت کے جنون سے زیادہ خطرناک اور زیادہ وسیع ہوتا ہے، ایک کمزور سا مریض اگر پاگل ہو جاتا ہے تو محلّہ کی نیند حرام کر دیتا ہے، اور سارا محلّہ عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے، آپ تصور کیجئے کہ جب نوعِ انسانی پاگل ہو جائے اور جب تمدن کا قوام

بگڑ جائے، جب انسانیت کا مزاج خراب ہو جائے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔

جاہلیت میں تمدن صرف بگڑا ہی نہیں تھا، متعفن ہو گیا تھا، اس میں کیڑے پڑ گئے تھے انسان، نوع انسانی کا شکاری بن گیا تھا، اس کو کسی انسان کی جانکنی، کسی زخمی کی تڑپ اور کسی مصیبت زدہ کی کراہ میں وہ مزا آنے لگا تھا، جو جام و سبو میں، اور دنیا کے لذیذ سے لذیذ کھانے اور خوشنما سے خوشنما منظر میں نہیں آتا تھا، آپ روما کی تاریخ پڑھیں جس کی فتوحات نظم و نسق اور قانون سازی اور تہذیب کے، دنیا میں ڈنکے بجے، یورپین مؤرخ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ: "اہل روما کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ فرحت افزا اور مست کر دینے والا نظارہ وہ ہوتا تھا، جب باہم شمشیر زنی یا خونخوار جانوروں کی لڑائی میں ہزیمت خوردہ اور مجروح شمشیر زن (GLADIATOR) جانکنی کی تکلیف میں مبتلا ہوتا، اور موت کے کرب میں آخری ہچکی لیتا، اس وقت روما کے خوش باش اور زندہ دل تماشائی اس خوش کن منظر کو دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر گرے پڑتے اور پولیس کو بھی ان کو کنٹرول میں رکھنا ممکن نہ ہوتا۔"

رومی عہد کے سیاقی جس میں انسان میں جانوروں سے لڑنے پر مجبور کیا جاتا تھا، انسانی شقاوت و سنگدلی کی بدترین مثال پیش کرتی ہے، لیکن یہ صرف اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کا محبوب مشغلہ تھا، "تاریخ اخلاق یورپ" کے مصنف لیکی ان کھیلوں کی ہر دلعزیزی بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> "سیاقی کی یہ مقبولیت و دل فریبی اس لحاظ سے مطلق حیرت انگیز نہیں کہ دلکشی کے جتنے مناظر اس میں آکر مجتمع ہو گئے تھے اتنے کسی دوسرے ملعبہ میں نہ تھے، لق و دق اکھاڑہ، امراء

واعیان، دولت کی زرق برق پوشاکیں، تماشائیوں کا انبوہ کثیر ان کے ذوق شوق کا اثر متعدی، اتنے بڑے مجمع میں ایک متوقع سکون و خاموشی، اسی ہزار زبانوں سے ایک بارگی صدائے تحسین بلند ہوتا، اس کی آواز سے شہر کیا معنی مضافات شہر تک گونج اٹھتا، جنگ کا گھڑی گھڑی رنگ بدلتے رہنا عدیم المثال جرأت و بے جگری کا اظہار، ان میں سے ہر شئی کو متاثر کرنے کے لئے کافی ہے، اور ان کی مجموعی طاقت قدرتی طور پر بہت قوی ہے۔

ان ظالمانہ تفریحات کو روکنے کے لئے احکام جاری کئے گئے۔ لیکن یہ سیلاب اتنا پر زور تھا کہ کوئی بند اسے روک نہیں سکتا تھا۔"

پس جاہلیت کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ پوری زندگی کی چول اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی، بلکہ ٹوٹ گئی تھی، انسان، انسان نہیں رہا تھا، انسانیت کا مقدمہ اپنے آخری مرحلہ میں خدا کی عدالت میں پیش تھا، انسان اپنے خلاف گواہی دے چکا تھا، اس حالت میں خدا نے محمد رسول ﷺ کو مبعوث فرمایا، اور ارشاد ہوا: "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ" (اور اے محمدؐ ہم نے تم کو تمام جہاں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔)

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ دَور بلکہ قیامت تک کا پورا دَور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت، دعوت اور مساعی جمیلہ کے حساب میں ہے، آپؐ کا پہلا کام یہ تھا کہ آپؐ نے اس تلوار کو جو نوع انسانی کے سر پر لٹک رہی تھی، اور کوئی گھڑی تھی کہ اس

کے سر پر گر کر اس کا کام تمام کر دے، اس تلوار کو ہٹالیا، اور اس کو وہ تحفے عطا کیے، جنہوں نے اس کو نئی زندگی، نیا حوصلہ، نئی طاقت، نئی عزت اور نئی منزل سفر عطا کی اور ان کی برکت سے انسانیت تہذیب و تمدن، علم و فن، روحانیت و اخلاص اور تعمیر انسانیت کا ایک نیا دور شروع ہوا ہم یہاں پر آپ کے ان چند عطیوں کا ذکر کرتے ہیں، جنہوں نے نوع انسانی کی ہدایت و اصلاح اور انسانیت کی تعمیر و ترقی میں بنیادی اور قائدانہ کردار ادا کیا، اور جن کی بدولت ایک نئی دنیا وجود میں آئی۔

آپ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ آپ نے دنیا کو عقیدۂ توحید کی نعمت عطا فرمائی اس سے زیادہ انقلاب انگیز، حیات بخش، عہد آفریں اور معجز نما عقیدہ، دنیا کو نہ پہلے کبھی ملا ہے اور نہ قیامت تک کبھی مل سکتا ہے، یہ انسان جس کو شاعری، فلسفہ، اور سیاست میں بڑے بڑے دعوے ہیں، اور جس نے قوموں، ملکوں کو بارہا غلام بنایا، عناصر اربعہ پر اپنی حکومت چلائی، پتھر میں پھول کھلائے، اور پہاڑوں کا جگر کاٹ کر دریا بہائے اور جس نے کبھی کبھی خدائی کا بھی دعویٰ کیا، یہ اپنے سے کہیں زیادہ مجبور و ذلیل، بے حس و حرکت، بے جان و مردہ اور بعض اوقات خود اپنی ساختہ پرداختہ چیزوں کے سامنے جھکتا تھا، ان سے ڈرتا اور ان کی خوشامد کرتا تھا، یہ پہاڑوں، دریاؤں، درختوں، جانوروں، ارواح و شیاطین اور مظاہر قدرت ہی کے سامنے نہیں، بلکہ کیڑوں، مکوڑوں تک کے سامنے سجدہ ریز ہوتا تھا، اور اس کی پوری زندگی انہیں سے خوف و امید اور انہیں خطرات میں بسر ہوتی تھی، جس کا نتیجہ بزدلی، ذہنی انتشار، وہم پرستی اور بے اعتمادی تھا، آپ نے اس کو ایسے خالص بے آمیز، سہل الفہم، حیات بخش عقیدۂ توحید کی تعلیم دی جس سے وہ خدا کے سوا جو خالق کائنات ہے، ہر ایک سے آزاد، نڈر اور بے فکر ہو گیا، اس میں ایک نئی قوت، نیا

حوصلہ، نئی شجاعت اور نئی وحدت پیدا ہوئی، اس نے صرف خدا کو کارساز حقیقی، حاجت روائے مطلق، اور نافع وضار (نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا) سمجھنا شروع کیا، اس نئی دریافت اور یافت سے اس کی دنیا بدل گئی، وہ ہر قسم کی غلامی و عبودیت اور ہر طرح کے بے جا خوف ورجا اور ہر طرح کے تشتت وانتشار سے محفوظ ہو گیا، اس کو کثرت میں وحدت نظر آنے لگی، وہ اپنے کو ساری مخلوقات سے افضل، ساری دنیا کا سردار و منتظم اور صرف خدا کا محکوم اور فرمانبردار سمجھنے لگا، اس کا لازمی نتیجہ انسانی عظمت وشرف کا قیام تھا، جس سے پوری دنیا محروم ہو چکی تھی۔

بعثت محمدی کے بعد ہر طرف سے اس عقیدۂ توحید کی (جس سے زیادہ مظلوم ومجہول کوئی عقیدہ نہ تھا) صدائے بازگشت آنے لگی، دنیا کے سارے فلسفوں اور افکار وخیالات پر اس کا کم وبیش اثر پڑا، وہ بڑے بڑے مذاہب جن کے رگ وریشہ میں شرک اور تعددِ آلہہ (متعدد خداؤں اور معبودوں) کا عقیدہ رچ بس گیا تھا، کسی نہ کسی نے میں یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوئے کہ خدا ایک ہے، وہ اپنے مشرکانہ عقیدوں کی تاویل پر مجبور ہوئے، اور ان کی ایسی فلسفیانہ تشریح کرنے لگے، جس سے ان پر شرک وبدعت پرستی کا الزام نہ آئے، اور وہ اسلامی عقیدۂ توحید سے کچھ نہ کچھ ملتا ہوا نظر آئے ان کو شرک کا اقرار کرنے میں شرم اور جھجک محسوس ہونے لگی اور سارے مشرکانہ نظام، فکر واعتقاد، احساس کمتری (INFERIORITY COMPLEX) میں مبتلا ہوئے، اس محسن اعظم کا احسان اعظم یہ ہے کہ اس نے توحید کی نعمت دنیا کو عطا کی۔

آپؐ کا دوسرا انقلاب آفریں اور عظیم احسان وحدت انسانی کا وہ تصور ہے،

جو آپ نے دنیا کو عطا کیا، انسان قوموں اور برادریوں، ذات جاتی اور اعلیٰ ادنیٰ طبقوں میں بٹا ہوا تھا، اور ان کے درمیان انسانوں اور جانوروں، آقاؤں اور غلاموں اور عبد و معبود کا سا فرق تھا، وحدت و مساوات کا کوئی تصور نہ تھا، آپ نے صدیوں کے بعد پہلی مرتبہ یہ انقلاب انگیز اور حیرت خیز اعلان فرمایا۔" ایھا الناس ان ربکم واحد وان اباکم واحد کلکم لآدم و آدم من تراب ، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم، ولیس لعربی علی عجمی فضل الا بالتقویٰ" لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے تم سب اولاد آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پاکباز ہے، کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کی بنا پر"۔

یہ وہ الفاظ ہیں، جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے آخری حج میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کے عظیم مجمع میں فرمائے تھے، ان میں، دو وحدتوں کا اعلان کیا گیا ہے، اور یہی وہ دو فطری مستحکم اور دائمی بنیادیں ہیں، جن پر نسل انسانی کی حقیقی وحدت کا قصر تعمیر کیا جاسکتا ہے، اور جس کے سایہ کے نیچے انسان کو امن و سکون حاصل ہوسکتا ہے، اور وہ اشتراک عمل اور تعاون کے اصول پر انسانیت کی تعمیر نو کا کام انجام دے سکتا ہے، یہ دو وحدتیں کیا ہیں؟ ایک نوع انسانی کے خالق و صانع کی وحدت، اور ایک نسل انسانی کے بانی اور مورث کی وحدت، اس طرح ہر انسان دوسرے انسان سے دوہرا رشتہ رکھتا ہے، ایک روحانی اور حقیقی طور پر، وہ یہ کہ سب انسانوں اور جہانوں کا رب ایک ہے، دوسرا جسمانی اور ثانوی طور پر، وہ یہ کہ سب انسان ایک باپ کی اولاد ہیں، دوسرے الفاظ میں توحید "رب" اور توحید "اب" کی تعلیم دی، جس کو مختصر الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے،، "الرب واحد

والا ب واحد"رب (پروردگا) بھی ایک ہے، اور اب (والد بزرگوار) بھی ایک۔

جس وقت یہ اعلان کیا گیا تھا، اس وقت دنیا اس کے سننے کے حال (موڈ) میں نہ تھی، یہ اعلان اس وقت کی دنیا میں ایک زلزلہ سے کم نہ تھا، بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں، جو تدریجی طور پر قابل برداشت ہو جاتی ہیں، بجلی کا یہی حال ہے کہ اس کو پردوں میں رکھ کر چھو لیتے ہیں، لیکن بجلی کی عریاں لہر کو اگر کوئی چھو لے تو جسم میں اس کا کرنٹ دوڑ جاتا، اور اس کا کام تمام کر دیتا ہے، آج علم و فہم اور فکر انسانی کے ارتقاء کی ان منزلوں نے جو اسلام کی دعوت، اسلامی معاشرہ کے قیام، مصلحین اور داعیان اسلام کی کوششوں سے طے ہوئیں، اس انقلاب انگیز اور زلزلہ فگن اعلان کو روزمرہ کی حقیقت بنا دیا ہے، اقوام متحدہ کے اسٹیج سے لے کر جس نے حقوق انسانی کا منشور (HUMAN RIGHTS CHARTER) شائع کیا، ہر جمہوریہ اور ہر ادارہ کی طرف سے انسانی حقوق اور مساوات انسانی کا اعلان کیا جارہا ہے، اور کوئی اس کو سن کر متعجب نہیں ہوتا، لیکن ایک زمانہ تھا، جب مختلف قوموں اور خاندانوں کے مافوق البشر ہونے کا عقیدہ قائم تھا، اور بہت سی نسلوں اور خاندانوں کا نسب نامہ خدا سے اور سورج چاند سے ملایا جارہا تھا، قرآن شریف نے یہودیوں اور عیسائیوں کا قول نقل کیا ہے کہ ہم خدا کی لاڈلی اور چہیتی اولاد کی طرح ہیں " وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ" فراعنۂ مصر اپنے کو سورج دیوتا کا اوتار کہتے تھے، ہندوستان میں سورج بنسی اور چندر بنسی خاندان موجود تھے، شاہان ایران کو جن کا لقب کسریٰ (خسرو) ہوا کرتا تھا، اس کا دعویٰ تھا کہ ان کی رگوں میں خدائی خون ہے، اہل ایران انہیں اسی نظر سے دیکھتے تھے، ان کا اعتقاد تھا کہ ان پیدائشی بادشاہوں کے خمیر میں کوئی مقدس آسمانی چیز شامل ہے، کیانی سلسلہ کے آخری

ایرانی شہنشاہ یزدگرد کا نام بتاتا ہے کہ وہ اور ایرانی ان کو خدا کا کس درجہ مقرب اور ہم نشین سمجھتے تھے۔

چینی اپنے شہنشاہ کو آسمان کا بیٹا تصور کرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ آسمان نر اور زمین مادہ ہے، ان دونوں کے اتصال سے کائنات کی تخلیق عمل میں آئی ہے اور شہنشاہ ختااول اس جوڑے کا پہلو ٹھا بیٹا ہے، عرب اپنے سوا ساری دنیا کو گونگا اور بے زبان (عجم) کہتے تھے، ان کا سب سے ممتاز قبیلہ قریش، عام عربوں سے بھی اپنے کو بالا و برتر سمجھتا تھا، اور اسی احساس برتری میں حج کے ایسے عمومی اجتماع میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھتا تھا۔

قرآن نے اس فضا اور اس ماحول میں اعلان کیا: "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط" لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو (اور) خدا کے نزدیک تم میں عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

اور قرآن کی ایک ایسی سورہ میں جو قرآن کا دیباچہ (فاتحہ) اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی سورہ ہے، کہا گیا ہے۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" سب تعریف اللہ کی ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

آپ کی رحمۃ للعالمینی کا تیسرا مظہر، اور نوع انسانی پر تیسرا احسان عظیم احترام انسانیت اور انسان کی قدر و قیمت کا وہ اسلامی تصور ہے جو آپ کا عطیہ اور اسلام کا تحفہ ہے، اسلام کا ظہور جس زمانہ میں ہوا اس زمانہ میں انسان سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں تھا، انسانی وجود بالکل بے قیمت اور بے حقیقت ہو کر رہ گیا تھا، بعض

اوقات پالتو جانور، بعض "مقدس" حیوانات، بعض درخت جن کے ساتھ بعض عقائد وروایات وابستہ ہوگئی تھیں، انسان سے کہیں زیادہ قیمتی، لائق احترام اور قابل حفاظت تھے ان کے لئے بے تکلف انسانوں کی جانیں لی جاسکتی تھیں، اور انسانوں کے خون اور گوشت کے چڑھاوے چڑھائے جاسکتے تھے، آج بھی بعض بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک میں اس کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کے دل ودماغ پر یہ نقش بٹھادیا کہ انسان اس کائنات کا سب سے زیادہ قیمتی، قابل احترام، لائق محبت اور مستحق حفاظت وجود ہے، آپ نے انسان کا پایہ اتنا بلند کیا کہ اس سے اوپر صرف خالق کائنات کی ہستی رہ جاتی ہے، قرآن نے اعلان کیا کہ خلیفة الله (خدا کا نائب) ہے، ساری دنیا اور یہ سارا کارخانۂ عالم، اسی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ "هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا" وہی ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو اس زمین پر ہے۔

وہ اشرف المخلوقات ہے اور اس بزم عالم کا صدر نشین ہے۔ "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا" اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری دی اور پاکیزہ روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔

اس سے زیادہ اس کی عزت افزائی اور اس کی اہمیت کا اعتراف کیا ہوسکتا ہے کہ صاف کہہ دیا گیا کہ انسان خدا کا کنبہ ہیں، اور خدا کو اپنے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور اس کو آرام پہنچائے۔" الخلق عيال الله فاحب الخلق الى الله من احسن الىٰ عياله ."

انسانیت کی بلندی اور خدا سے اس کے قرب و اختصاص کا اظہار اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے، جو ایک حدیث قدسی میں کیا گیا ہے، فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا، ''اے فرزند آدم میں بیمار ہوا تو مجھے دیکھنے نہیں آیا، بندہ کہے گا، پروردگار! میں تیری عیادت کیا کر سکتا ہوں، تو تو رب العالمین ہے، ارشاد ہوگا، کیا تجھے معلوم نہیں ہوا، میرا فلاں بندہ بیمار پڑ گیا تھا، تو اس کی عیادت کو نہیں گیا، تجھے معلوم نہیں تھا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، پھر ارشاد ہوگا، اے فرزند آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا، تو نے مجھے کھانا نہیں دیا، بندہ عرض کرے گا، پروردگار! میں تجھے کیسے کھانا کھلا سکتا ہوں، تو رب العالمین ہے، ارشاد ہوگا کیا تجھے اس کا علم نہیں ہوا کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے اسے نہیں کھلایا، کیا تجھے اس کی خبر نہ تھی کہ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو تو اس کو میرے پاس پاتا، اے فرزند آدم، میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا، بندہ عرض کرے گا، اے رب! میں تجھے کیسے پانی پلا سکتا ہوں، تو تو رب العالمین ہے، ارشاد ہوگا، تجھ سے میرے فلاں بندہ نے پانی طلب کیا تھا، تو نے اسے پانی نہیں دیا، تجھے اس کا پتہ نہیں چلا کہ اگر تو اس کو پانی پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا''۔

ایک سراپا توحید مذہب میں، کیا انسانیت کی بلندی، اور انسان کی رفعت و محبوبیت کا اس سے بڑھ کر اعتراف و اعلان پایا جا سکتا ہے، اور کیا دنیا کے کسی مذہب و فلسفہ میں انسان کو یہ مقام دیا گیا ہے؟ آپ نے خدا کی رحمت و شفقت کے لئے انسانوں پر رحم و شفقت کو شرط اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ بتایا اور فرمایا ''الراحمون یرحمھم الرحمن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء'' رحم کرنے والوں پر رحمٰن کی رحمت ہوتی ہے، اگر تم اہل زمین پر رحم کھاؤ

گے تو وہ جو آسمان پر ہے وہ تم پر رحمت نازل کرے گا۔

آپ غور کیجئے کہ وحدت انسانی کا نقش دلوں پر بٹھانے اور احترام انسانیت کا یقین دلوں میں پیدا کرنے کے لئے جب یہ سعی بلیغ نہیں کی گئی تھی، اس وقت انسان کا کیا حال رہا ہوگا ایک انسان کی ادنیٰ خواہش کی قیمت ہزاروں انسانوں سے زیادہ تھی، بادشاہ اٹھتے تھے، اور ملکوں کے ملکوں کا صفایا کردیتے تھے، سکندر اٹھا اور جیسے کوئی کبڈی کھیلتا ہے، ہندوستان تک چلا آیا، اور قوموں اور تہذیبوں کے چراغ گُل کردیئے، سیزر اٹھا اور انسانوں کا اس طرح شکار کھیلنا شروع کیا جیسے جنگلی جانوروں کا شکار کھیلا جاتا ہے، آج ہمارے زمانہ میں بھی دو دو عالمگیر جنگیں ہوگئیں، جنہوں نے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور صرف قومی تکبر، سیاسی انانیت، اقتدار کی ہوس، یا تجارتی منڈیوں پر قبضہ کرنے کے جذبہ کا نتیجہ تھا، اقبالؔ نے سچ کہا ؎

ابھی تک آدمی صید زبون شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے

چوتھا انقلابی کارنامہ یہ ہے کہ بعثت محمدی کے وقت نوع انسانی کے اکثر افراد پر فطرت انسانی سے بدگمانی اور خدا کی رحمت سے مایوسی کی ایک عام فضا چھائی ہوئی تھی، اس ذہنی کیفیت کے پیدا کرنے میں ایشیا کے بعض قدیم مذاہب اور مشرق وسطیٰ اور یورپ کی تبدیل شدہ عیسائیت نے یکساں کردار ادا کیا تھا، ہندوستان کے قدیم مذاہب نے تناسخ "آواگون" کے فلسفہ کے ذریعہ جس میں انسان کے ارادہ و اختیار کو مطلق دخل نہیں ہے، اور جس کی رُو سے ہر انسان کو اپنے پہلے جنم کے اعمال اور غلطیوں کی سزا بھگتنی ضروری ہے، اور عیسائیت نے انسان

کے پیدائشی گنہ گار ہونے اور اس کے لئے حضرت مسیح کے کفارہ بننے کی ضرورت کے عقیدہ کے نتیجہ میں اس وقت کے متمدن دنیا کے لاکھوں کروڑوں افراد کو جو ان مذاہب کے پیرو تھے، اپنی ذات سے بدگمانی اور اپنے مستقبل اور خدا کی رحمت سے مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے پوری طاقت و صفائی سے اعلان کیا کہ انسان کی فطرت ایک سادہ تختی کے مانند ہے جس پر پہلے سے کوئی تحریر لکھی نہیں ہے، اس پر بہتر سے بہتر تحریر لکھی جا سکتی ہے انسان اپنی زندگی کا خود آغاز کرتا ہے، اور اپنے اچھے یا بُرے عمل سے اپنی دنیا و عاقبت بناتا یا بگاڑتا ہے، وہ کسی دوسرے کے عمل کا ذمہ دار یا جواب دِہ نہیں ہے، قرآن مجید نے بار بار اعلان کیا کہ آخرت میں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا، اور یہ اس کے حصہ میں اسی کی کوشش اور اس کے نتائج آنے والے ہیں، انسان کی کوشش کا نتیجہ ضرور ظاہر ہوگا، اور اس کو اس کا بھرپور بدلہ ملے گا۔ "اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى" یہ کہ کوئی شخص دوسرے (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی، پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائیگا۔

اس اعلان سے انسان کا اپنی فطرت، اور اپنی فطری صلاحیتوں پر وہ اعتماد بحال ہو گیا جو بالکل متزلزل ہو گیا تھا، وہ نئے عزم و یقین اور نئے جوش و ولولہ کے ساتھ اپنی اور انسانیت کی تقدیر چمکانے اور اپنی قسمت اور قوت آزمانے کے لئے سرگرم سفر ہو گیا۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے گناہوں، لغزشوں اور غلطیوں کو ایک عارضی

حالت قرار دیا جس میں انسان کبھی کبھی اپنی نادانی، کوتاہ نظری اور نفس و شیطان کی ترغیب سے مبتلا ہو جاتا ہے، صلاحیت، خیر پسندی اور اعتراف قصور و ندامت، اس کی فطرت کا اصل تقاضہ، اور انسانیت کا جوہر ہے، اپنی غلطی کا اعتراف کرنا، اس پر نادم ہونا، خدا کے سامنے رُودُھو کر اپنے قصور کو معاف کرا لینا، اور آئندہ ایسی غلطی کے نہ کرنے کا عزم کرنا انسان کی شرافت اور آدم کی میراث ہے، آپؐ نے دنیا کے مایوس و دل شکستہ اور گناہوں کے دلدل میں گلے گلے ڈوبے ہوئے انسانوں پر توبہ کا ایسا دروازہ کھولا اور اس کی اس زور و شور سے تبلیغ فرمائی کہ آپؐ کو اس شعبہ کا دوبارہ زندہ کرنے والا کہنا صحیح ہوگا، اسی بنا پر آپ کے ناموں میں ایک نام "نبی التوبہ" (توبہ کا پیغمبر اور پیغامبر) بھی ہے، آپ نے توبہ کو ایک مجبوری کی بات اور تلافی مافات کے طور پر پیش نہیں کیا، بلکہ آپؐ نے اس کے ایسے فضائل بیان کئے اور اس کا مرتبہ اتنا بلند کیا کہ وہ اعلیٰ درجہ کی عبادت، اور خدا کے قرب اور اس کی محبوبیت کا ایسا ذریعہ بن گیا کہ اس پر بڑے بڑے معصوم صفت اور ناکردہ گناہ عابدوں اور زاہدوں کو رَشک آنے لگا۔

قرآن مجید نے اس طرح رحمت کی وسعت پر گناہ گار کے توبہ کر سکنے اور بڑے سے بڑے گناہ سے پاک و صاف ہو جانے کے امکان کو اس دلکش اور دلنواز انداز میں بیان کیا اور گنہ گار بندوں اور نفس و شیطان کے زخم خوردہ انسانوں کو اس طرح خدا کے دامن رحمت میں پناہ لینے کی منادی کی، اور اس کے دریائے رحمت کے جوش و تلاطم کو اس انداز میں بیان کیا کہ یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ مطلوب سے زیادہ طالب اور گنہ گار بندوں کے حق میں نہ صرف حلیم و رحیم اور فیاض و کریم ہے، بلکہ (اگر یہ کہنا صحیح ہو) ان کا منتظر و مشتاق اور ان کا سچا قدرداں ہے، قرآن مجید کے

ان الفاظ کو پڑھیے، اور اس لطف و شفقت کا اندازہ کیجئے جو اس کے لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے۔" قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ"۔ کہہ دیجئے! اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنے حق میں زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف کر دیتا ہے، بے شک وہ بڑا بخشنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔

ایک دوسری آیت میں گنہگار اور خطاکار انسانوں کے تذکرے اور سیاق و سباق میں نہیں، بلکہ بلند ہمت، نیکو سیرت اور جنتی انسانوں کے سلسلہ اور سیاق و سباق میں گناہوں سے توبہ کرنے والوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔" وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ۝ (۱)" اور اپنے پروردگار کی بخشش اور بہشت کی طرف لپکو جس کا عرض آسمان اور زمین کے برابر ہے اور جو (خدا سے) ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے، جو آسودگی اور تنگی میں (اپنا مال خدا کی راہ) خرچ کرتے ہیں، اور غصے کو روکتے اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں، اور خدا نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے، اور وہ

کہ جب کوئی کھلا گناہ یا اپنے حق میں کوئی اور برائی کر بیٹھتے ہیں تو خدا کو یاد کرتے اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں، اور خدا کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے؟ اور جان بوجھ کر اپنے افعال پر اڑے نہیں رہتے، ایسے لوگوں کا صلہ پروردگار کی طرف سے بخشش اور باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ بستے رہیں گے اور (اچھے) کام کرنے والوں کا بدلہ بہت اچھا ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر باعمل اور نیک سیرت بندوں کے مختلف طبقوں کا ذکر کرتے ہوئے، اس نورانی فہرست کا افتتاح عابدوں زاہدوں کے بجائے "تائبوں" سے فرمایا گیا، قرآن مجید کی اس سورہ کی جس کا نام ہی سورہ توبہ ہے، آیت ہے۔ "التَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّائِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ الْآمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ط" توبہ کرنے واے عبادت کرنے والے حمد کرنے والے، بے تعلق رہنے والے رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے، نیک کاموں کا امر کرنے والے اور بُری باتوں سے منع کرنے والے خدا کی حدوں کی حفاظت کرنے والے (یہی مومن لوگ ہیں) اور اے پیغمبرؐ مومنوں کو (بہشت کی) خوشخبری سنادو۔

اس اعزاز اور اظہار اعتماد کی ایک روشن مثال یہ ہے کہ جب قرآن مجید کی زبان سے ان تین صحابیوں کی توبہ کی قبولیت کا اعلان کیا گیا جو غزوۂ تبوک کے نازک اور اہم موقع پر (جس میں شرکت نہایت ضروری تھی) بغیر کسی معقول عذر کے مدینہ میں رہ کر شدید کوتاہی کے مرتکب ہوئے تھے، تو ان کا ذکر کرنے سے پہلے خود پیغمبرؐ اور ان مہاجرین وانصار کا ذکر کیا گیا جن سے اس موقع پر کسی کوتاہی کا صدور نہیں ہوا تھا، تاکہ ان تین پیچھے رہ جانے والوں کو اپنی تنہائی اور پسماندگی کا

احساس نہ ہو، اور وہ احساس کہتری، اور انگشت نمائی کے ہر داغ سے بَری ہو جائیں، اور ان پر اور قیامت تک قرآن مجید کے پڑھنے والوں پر یہ بات واضح ہو جائے کہ ان کی اصل جگہ اور اصل گروہ یہی صادقین اولین اور مہاجرین اور انصار کے صف اول کے لوگ ہیں، توبہ کی قبولیت، تائب کی مقبولیت، اور نفسیاتی طور پر دلنوازی اور چارہ سازی کی اس سے زیادہ لطیف اور دقیق مثال ادیان و مذاہب اور علم الاَخلاق اور علم النفس کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے، اسی سورۂ توبہ میں ارشاد ہوا ہے۔ " لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ط اِنَّهُ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ط وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ط حَتّٰى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَيْهِ ط ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ط" بے شک خدا نے پیغمبر پر مہربانی کی اور مہاجرین و انصار پر، جو باوجود اس کے کہ ان میں سے بعضوں کے دل پھر جانے کو تھے، مشکل کی گھڑی میں پیغمبر کے ساتھ رہے، پھر خدا نے ان پر مہربانی فرمائی، بے شک وہ ان پر نہایت شفقت کرنے والا (اور) مہربان ہے اور ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا، یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہو گئی، اور ان کی جانیں بھی ان پر دوبھر ہو گئیں اور انہوں نے جان لیا کہ خدا (کے ہاتھ) سے خود اس کے سوا کوئی پناہ نہیں ہے پھر خدا نے ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں، بے شک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

اس کے علاوہ ایک اصول کے طور پر اس کا اعلان کیا کہ رحمت الٰہی ہر چیز پر حاوی اور غضب و جلال پر غالب ہے، قرآن مجید میں: "وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ

شَیْءٍ" میری رحمت ہر چیز پر حاوی اور محیط ہے۔ اور حدیث قدسی میں ہے: "ان رحمتي سبقت غضبي" میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ پھر اس نے مایوسی کو بھی کفر کا، اور جہالت و گمراہی کا مرادف قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ ایک پیغمبر برحق (حضرت یعقوبؑ) کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔ "اِنَّهُ لَا يَيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ" اللہ کی رحمت سے وہی لوگ مایوس ہو سکتے ہیں جو خدا کے منکر اور اس کی ذات و صفات سے ناآشنا ہیں۔ دوسری جگہ ایک دوسرے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کا قول نقل کیا گیا ہے۔ "وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ" اپنے رب کی رحمت سے گمراہوں کے سوا کون مایوس ہو سکتا ہے۔

اس طرح محمد رسول اللہ ﷺ نے توبہ کی فضیلت و ترغیب اور خدا کی رحمت کی وسعت و شمولیت کا اعلان و تبلیغ کر کے یاس و قنوط کی ماری ہوئی، اور غضب و جلال کے اعلانات و تفصیلات سے (جن میں یہودی علماء اور شارحین کتب مقدسہ اور قرون وسطیٰ کے غالی فطرت دشمن، عیسائی زاہدوں، اور پادریوں نے اہم کردار ادا کیا تھا) ڈری اور سہمی ہوئی انسانیت کو نئی زندگی کا پیغام دیا، اس کے تن مردہ اور دل افسردہ میں نئی روح پھونکی، اس کے زخموں پر مرہم رکھا، اور اس کو خاک مذلت سے اٹھا کر عزت و شرف، خود اعتمادی، اور خدا اعتمادی کے بام عروج پر پہونچا دیا۔

نبوت محمدیؐ کا پانچواں عظیم اور ناقابل فراموش احسان، اور ایک گراں قدر تحفہ، دین و دنیا کی وحدت کا تصور اور یہ انقلاب انگیز تلقین ہے کہ یہ کوئی حقیقی اختلاف نہیں، محض اصطلاح کا اختلاف ہے، اور قدیم درسی زبان میں "نزاع

لفظی" ہے، انسان کے اعمال و اخلاق اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کا اصل انحصار، انسان کی ذہنی کیفیت، عمل کے محرکات اور اس کے مقصد پر ہے، جس کو اسلام کے دین و شریعت کی زبان میں "نیت" کے ایک مفرد و سادہ، لیکن نہایت بلیغ و عمیق لفظ میں ادا کیا گیا ہے، اس کے نزدیک نہ کوئی چیز "دنیا" ہے اور نہ کوئی چیز "دین" اس کے نزدیک خدا کے رضا کی طلب 'اخلاص' اور اس کے حکم کی تعمیل کے جذبہ' و ارادہ سے بڑے سے بڑا دنیاوی عمل، یہاں تک کہ حکومت، جنگ، دنیاوی نعمتوں سے تمتع، نفس کے تقاضوں کی تکمیل، حصولِ معاش کی جدوجہد، جائز تفریح طبع کا سامان، ازدواجی و عائلی زندگی، سب اعلیٰ درجہ کی عبادت، تقرب الی اللہ کا ذریعہ، اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب ولایت تک پہونچنے کا وسیلہ، اور خالص دین من جاتی ہے، اس کے برخلاف بڑی سے بڑی عبادت، اور دینی کام جو رضا الٰہی کے مقصد اور اطاعت کے جذبہ سے خالی ہو (حتیٰ کہ فرض عبادتیں، ہجرت و جہاد، قربانی و سر فروشی اور ذکر و تسبیح) خالص دنیا اور ایسا عمل شمار ہوگا جس پر کوئی ثواب اور اجر نہیں ہے۔

قدیم مذاہب نے زندگی کو دو خانوں میں (دین و دنیا) میں تقسیم اور دنیا کو دو کیمپوں، اہل دین اور اہل دنیا میں بانٹ دیا تھا، جو نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے جُدا تھے، اور ان کے درمیان ایک موٹی سرحدی لکیر اور ایک وسیع خلیج حائل تھی، بلکہ یہ دونوں خانے ایک دوسرے سے متصادم اور یہ دونوں کیمپ باہم متحارب تھے، ان کے نزدیک دین و دنیا میں کھلا تضاد اور شدید رقابت تھی، جس کو ان میں سے کسی ایک سے رسم و راہ پیدا کرنی ہو، اس کو دوسرے سے قطع تعلق اور اعلان جنگ کرنا ضروری تھا، کوئی انسان ایک وقت میں ان دونوں کشتیوں پر سوار نہیں ہو سکتا

تھا، معاشی جد و جہد، غفلت و خدا فراموشی کے بغیر، حکومت و سلطنت دینی و اخلاقی تعلیمات کو نظر انداز کیے اور خوف خدا سے خالی ہوئے بغیر، اور دیندار بننا، تارک الدنیا ہوئے بغیر متصور ہی نہیں تھا، ظاہر ہے کہ انسان عام طور پر سہولت پسند اور لذت پرست واقع ہوا ہے، دین کا ایسا تصور جس میں دنیا کی کسی جائز تمتع، ترقی اور سربلندی، طاقت و حکومت کے حصول کی گنجائش نہ ہو، انسانوں کی اکثریت کے لئے قابل قبول اور قابل برداشت نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے متمدن، ذہین، صاحب صلاحیت، اور باعمل انسانوں کی بڑی تعداد نے اپنے لئے، ''دین'' کے بجائے ''دنیا'' کا انتخاب کیا، اور اس نے اس پر اپنے کو مطمئن و راضی کر لیا، وہ ہر قسم کی دینی ترقی سے مایوس ہو کر دنیا کے حصول اور اس کی ترقی میں مشغول ہو گئی، دین و دنیا کے اس تضاد کو ایک مذہبی اور مسلم حقیقت سمجھ کر انسانوں کے مختلف طبقوں اور انسانی اداروں نے عام طور پر مذہب کو خیر باد کہا، سیاست و ریاست نے مذہب کے نمائندہ کلیسا سے بغاوت کی اور اپنے کو اس کی ہر پابندی سے آزاد کر لیا، انسان ''پیلِ بے زنجیر'' اور معاشرہ ''شترِ بے مہار'' ہو کر رہ گیا، دین و دنیا کی اس دوئی اور اہل دین اور اہل دنیا کی اس رقابت نے نہ صرف یہ کہ مذہب و اخلاق کے اثر کو محدود و کمزور اور انسانی زندگی اور انسانی معاشرہ کو اس کی برکت و رحمت سے محروم کر دیا، بلکہ اس الحاد و لادینیت کا دروازہ کھولا جس کا سب سے پہلے یورپ شکار ہوا، پھر دنیا کی دوسری قومیں یورپ کے فکری، علمی، یا سیاسی اقتدار کے زیر اثر آئیں، اس سے کم و بیش متاثر ہوئیں، موجودہ دنیا کی صورتِ حال جس میں مذہب و اخلاق کا زوال، اور نفس پرستی (اپنے وسیع معنی میں) اپنے آخری نقطہ پر پہونچ گئی، اسی دین و دنیا کی تفریق کا نتیجہ ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کا یہ عظیم ترین معجزہ اور انسانیت کے لئے عظیم ترین تحفہ اور آپؐ کی رحمۃ للعالمینی کا مظہر ہے کہ آپؐ کامل طور پر رسولِ وحدت ہیں، اور بہ یک وقت "بشیر" و "نذیر" ہیں، آپؐ نے دین و دنیا کے تضاد کے نظریہ کو ختم کر کے پوری زندگی کو عبادت میں اور پورے روئے زمین کو ایک وسیع عبادت گاہ میں تبدیل کر دیا، دنیا کے انسانوں کو متحارب کیمپوں سے نکال کر حسن عمل، خدمت خلق اور حصول رضاء الٰہی کے ایک ہی محاذ پر کھڑا کر دیا، یہاں لباس دنیا میں درویش، قباء شاہی میں فقیر و زاہد، سیف و تسبیح کے جامع، رات کے عبادت گذار اور دن کے شہ سوار نظر آئیں گے، اور ان کو اس میں کسی قسم کا تضاد محسوس نہیں ہوگا۔

چھٹا انقلاب یہ ہے کہ بعثتِ محمدی سے پہلے انسان اپنی منزل مقصود سے بے خبر تھا، اس کو یاد نہیں رہا تھا کہ اس کو کہاں جانا ہے؟ اس کی صلاحیتوں کا اصل میدان اور اس کی کوششوں کا اصل نشانہ کیا ہے؟ انسان نے کچھ موہوم منزلیں اور اپنی کوششوں کے لئے کچھ چھوٹے چھوٹے دائرے بنا لئے تھے، ان میں انسانوں کی ذہانت اور قوت عمل صَرف ہو رہی تھی، کامیاب اور بڑا انسان بننے کا مطلب صرف یہ تھا کہ میں دولت مند بن جاؤں، طاقتور اور حاکم بننے کا مطلب صرف یہ تھا کہ میں دولت مند بن جاؤں، طاقتور اور حاکم بن جاؤں، وسیع سے وسیع رقبۂ زمین اور کثیر سے کثیر انسانی نفوس پر میری حکمرانی اور فرماں روائی قائم ہو جائے، لاکھوں آدمی ایسے تھے، جن کا پروازِ تخیل، نقش و نگار، رنگ و آہنگ، لذت و ذائقہ اور بلبل و طاؤس، یا چوپایہ و حیوان کی تقلید سے بلند نہیں ہوتا تھا، ہزاروں انسان ایسے تھے، جن کی ساری ذہانت اپنے زمانہ کے دولت مندوں اور طاقت وروں اور سرکار دربار کی

خدمت وخوشامد یا بے مقصد ادب وشاعری سے دل خوش کرنے میں صرف ہو رہی تھی، محمد رسول اللہ ﷺ نے نسلِ انسانی کے سامنے اس کی حقیقی منزل لا کر کھڑی کر دی، آپ نے یہ بات دل پر نقش کر دی کہ خالقِ کائنات کی صحیح معرفت، اس کی ذات و صفات اور اس کی قدرت و حکمت کا صحیح علم، ملکوتُ السمٰوات والارض کی وسعت و عظمت اور لا محدودیت کی دریافت، ایمان ویقین کا حصول، خدا کی محبت ومحبوبیت، اس کو راضی کرنا اور اس سے راضی ہو جانا، اس کثرت میں وحدت کی تلاش اور یافت، انسان کی حقیقی سعادت اور کمالِ آدمیت ہے، اپنی باطنی قوتوں کو ترقی دینا، ایمان ویقین کی دولت سے مالا مال ہونا، انسانوں کی خدمت اور ایثار و قربانی کے ذریعہ خدا کی خوشنودی کا حاصل کرنا، اور کمال و ترقی کے ان اعلیٰ مدارج تک پہنچ جانا، جہاں فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے، انسان کی کوششوں کا حقیقی میدان ہے۔

آپ کی بعثت کے بعد دنیا کی رت بدل گئی، انسانوں کے مزاج بدل گئے، دلوں میں خدا کی محبت کا شعلہ بھڑکا، خدا طلبی کا ذوق عام ہوا، انسانوں کو ایک نئی دھن (خدا کو راضی کرنے اور خدا کی مخلوق کو خدا سے ملانے اور اس کو نفع پہنچانے کی) لگ گئی، جس طرح بہار یا برسات کے موسم میں زمین میں روئیدگی، سوکھی ٹہنیوں اور پتیوں میں شادابی اور ہریالی پیدا ہو جاتی ہے، نئی نئی کونپلیں نکلنے لگتی ہیں، اور درو دیوار پر سبزہ اُگنے لگتا ہے، اسی طرح بعثتِ محمدی بعض قلوب میں نئی حرارت، دماغوں میں نیا جذبہ اور سروں میں نیا سودا سما گیا، کروڑوں انسان اپنی حقیقی منزلِ مقصود کی تلاش اور اس پر پہنچنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے، ہر ملک اور قوم میں طبیعتوں میں یہی نشہ اور ہر طبقہ میں اس میدان میں ایک دوسرے سے بازی

لے جانے کا یہی جذبہ موجزن نظر آتا ہے، عرب و عجم، مصر و شام ترکستان اور ایران، عراق و خراسان، شمالی افریقہ اور اسپین اور بالآخر ہمارا ملک ہندوستان اور جزائر شرق الہند سب اسی صہبائے محبت کے متوالے اور اسی مقصد کے دیوانے نظر آتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انسانیت صدیوں کی نیند سوتے سوتے بیدار ہوئی، آپ تاریخ و تذکرے کی کتابیں پڑھئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ خدا طلبی، اور خدا شناسی کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا، شہر، شہر، قصبہ، قصبہ، گاؤں، گاؤں بڑی تعداد میں ایسے خدا مست، عالی ہمت، عارف کامل، داعی حق، اور خادم خلق، انسان دوست، ایثار پیشہ انسان نظر آتے ہیں، جن پر فرشتے بھی رشک کریں، انہوں نے دلوں کی سرد انگیٹھیاں گرما دیں، عشق الٰہی کا شعلہ بھڑکا دیا، علوم و فنون کے دریا بہا دیئے، علم و معرفت کی محبت کی جوت جگادی اور جہالت و وحشت، ظلم و عداوت سے نفرت پیدا کردی، مساوات کا سبق پڑھایا، دکھوں کے مارے اور سماج کے ستائے ہوئے، انسانوں کو گلے لگایا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بارش کے قطروں کی طرح ہر چپہ زمین پر ان کا نزول ہوا ہے، اور ان کا شمار نا ممکن ہے۔

آپ ان کی کثرت (کمیت) کے علاوہ ان کی کیفیت کو دیکھئے، ان کی ذہنی پرواز، ان کی روح کی لطافت اور ان کے ذوق سلیم کے واقعات پڑھئے، انسانوں کے لئے کس طرح ان کا دل روتا، اور ان کے غم میں گھلتا، کس طرح ان کی روح سلگتی تھی، انسانوں کو مصیبت سے نجات دینے کے لئے وہ کس طرح اپنے کو خطرہ میں ڈالتے اور اپنی اولاد اور متعلقین کو آزمائش میں مبتلا کرتے تھے، ان کے حاکموں کو اپنی ذمہ داری کا کس قدر احساس اور محکوموں میں اطاعت و تعاون کا کس قدر جذبہ تھا، ان کے ذوق عبادت، ان کی قوت دعا، ان کے زہد و فقر، جذبۂ خدمت، اور مکارم

اخلاق کے واقعات پڑھیے، نفس کے ساتھ ان کا انصاف اپنا احتساب، کمزوروں پر شفقت، دوست پروری، دشمن نوازی، ہمدردی خلائق کے نمونے دیکھئے، بعض اوقات شاعروں اور ادیبوں کی قوت متخیلہ بھی ان بلندیوں تک نہیں پہنچتی، جہاں وہ اپنے جسم و عمل کے ساتھ پہنچے، اگر تاریخ کی مستند اور متواتر شہادت نہ ہوتی تو یہ واقعات، قصے کہانیاں اور افسانے معلوم ہوتے۔

یہ انقلاب عظیم، یہ دور جدید محمد رسول اللہ ﷺ کا معجزہ اور آپ کی بعثت کا کرشمہ ہے کہ آپ نے دنیا کی کایا پلٹ دی، اقبال نے سچ کہا ہے ؎

بوریا ممنون خواب راحتش — تاج کسریٰ زیر پائے امتش
در شبستان حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشم او محروم نوم — تا بہ تخت خسروی خوابید قوم
وقت ہیجا تیغ او آہن گداز — دیدۂ او اشکبار اندر نماز
در دعائے نصرت آمیں تیغ او — قاطع نسل سلاطیں تیغ او
در جہاں آئین نو آغاز کرد — مسند اقوام پیشیں در نورد
از کلید دیں در دنیا کشاد — ہمچو او بطن ام گیتی نزاد
در نگاہ او یکے بالا و پست — با غلام خویش بریک خواں نشست
امتیازات نسب را پاک سوخت — آتش او ایں خس و خاشاک سوخت

ترجمہ: اگرچہ ایک بوریہ پر آپ آرام فرماتے تھے، لیکن کسریٰ (شاہ ایران) کا تاج آپ کے امتیوں کے پاؤں تلے تھے۔

حرا کی خلوت گاہ میں آپ نے کچھ دن تنہائی اختیار کی اور قوم، آئین و دستور

اور ایک نئی حکومت دنیا میں پیدا کر دی۔

چند راتیں آپ کی آنکھیں بے خواب رہیں، لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کے صحرا نشین اور شتر سوار پیرو تخت خسروی پر آرام کرنے کے قابل ہو گئے۔

جنگ کے وقت آپ کی تلوار میں وہ حرارت ہوتی تھی کہ لوہا اس سے پگھلتا تھا، اور نماز میں آپ کے قلب مبارک میں وہ رقت اور محبت ہوتی تھی کہ آنکھیں اشکبار ہوتیں۔

فتح و نصرت کی دعا میں آپ کا آمین کہنا تلوار کا کام کرتا تھا، اور جنگ میں آپ کی تلوار سلاطین (پیدائشی بادشاہوں) کی نسل کا خاتمہ کرنے والی تھی۔

دنیا میں آپ نے آئین نو کا آغاز کیا اور گذشتہ قوموں کی مسندیں الٹ دیں۔

دین و مذہب کی کنجی سے آپ نے دنیا کا دروازہ کھولا، مادر گیتی نے آپ جیسا فرزند پیدا نہیں کیا۔

آپ کی نگاہ میں اعلیٰ و ادنیٰ سب ایک تھے، آپ اپنے غلام کے ساتھ ایک ہی دستر خوان پر بیٹھ کر کھاتے تھے۔

آپ نے نسل و نسب کے امتیازات کو یکسر ختم کر دیا آپ کی پیدا کی ہوئی حرارت ایمانی نے اس خس و خاشاک کو جلا کر رکھ دیا۔

حالیؔ نے اسی مضمون کو اپنے اس سادہ سے شعر میں ادا کیا ہے ؎

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے

یہ سب پودا انہیں کی لگائی ہوئی ہے

وصدق الله العظیم "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ"

☆☆☆

مدرسے کا مقصد

۱۲ر مارچ ۱۹۶۴ء کو ندوہ کی وسیع مسجد میں طلبائے دارالعلوم کا اجتماع ہوا، ہر سال تعلیم کے آغاز پر طلبہ کا یہ اجتماع منعقد ہوتا ہے، اس مرتبہ طلبہ کی تعداد میں نمایاں اضافہ ایک خاص بات تھی، حمد و صلوۃ کے بعد مولانا نے یہ تقریر فرمائی۔ اور درجہ، ہشتم کے طالب علم نعیم صدیقی اعظمی نے اس کو قلمبند کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدرسے کا مقصد

نئے سال کے شروع میں آپ سے تعارف حاصل کرنا اور اپنے تجربات بیان کرنا ایک مناسب و بر محل بات ہے، آپ سے بات کرنا مشکل بھی ہے، اور آسان بھی، ظاہر بات ہے کہ باپ جب اپنے بیٹے سے اور ایک عزیز اپنے دوسرے عزیز سے بات چیت کرتا ہے تو نہ اسکے اندر کسی تصنع و بناوٹ کی ضرورت ہوتی ہے، نہ دقیق و ثقیل الفاظ کے استعمال کی، یہی میری باتوں کی بھی حیثیت ہے، جانی بوجھی باتیں، عمر بھر کے تجربے، راستہ کے نشیب و فراز، اُسکی منزلیں، ان تمام باتوں کو آپ کے سامنے رکھنا، اس نوعیت کے اعتبار سے یہ بات بہت آسان ہے، اس میں مجھے زیادہ سوچنے سمجھنے کی ضرورت نہیں، اور میں کیا یہاں آپ کے اساتذہ میں سے جو کوئی بھی آپ سے بات کرے اسے زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ

"عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں"

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ آپ سے بات کرنا مشکل بھی ہے، اس لئے کہ میں آپ سے اتنی باتیں کرنا چاہتا ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں

اور کہاں ختم کروں، باتوں کا ایک اتھاہ سمندر ہے، اور اسکے اتنے محرکات ہیں، جن میں سے کسی ایک کو نظر انداز کرنا مشکل ہے، لیکن ہر مشکل کا ایک حل ہے، اور اس کا حل یہ ہے کہ ان تمام باتوں کو مختلف اوقات میں آپ کے سامنے رکھا جائے۔

سب سے پہلے میں آپ سب کو مبارک باد دیتا ہوں، پرانے طلبہ کو اس لئے کہ وہ اب تک موجود ہیں، زمانے کی گردشیں، اور اسکے الٹ پھیر نے الحمد للہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا، اور وہ اسکا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے مقصد کے حصول میں مشغول ہیں، اور نئے طلباء کو مبارک باد اس لئے دیتا ہوں کہ انہوں نے دینی تعلیم کا انتخاب کیا، اللہ تعالیٰ کا کتنا فضل و کرم ہے کہ اسنے آپ کے والدین کو یہ توفیق دی کہ وہ آپ کو ایک دینی درسگاہ میں تعلیم کی غرض سے بھیجیں، بعض ایسے بھی طلباء ہیں، جو زبردستی بھیجے گئے، لیکن وہ بھی اللہ کے منظور نظر ہیں، حدیث شریف میں وارد ہے کہ "جنت میں بعض لوگ ایسے بھی جائیں گے، جن کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوں گی" یعنی وہ اللہ کے اتنے منظور نظر ہیں کہ باوجود اس کے کہ وہ خود جنت میں داخل ہونا نہیں چاہتے، انکے بیڑیاں ڈال کر اور زبردستی داخل جنت کیا جائیگا، اسی طرح دینی تعلیم کا حصول بھی اتنی بڑی نعمت ہے کہ جو اس پر زبردستی لگائے جائیں، اور وہ بغیر اپنے مقصد کو سمجھے ہوئے جبراً و کرہاً یہاں پہونچائے جائیں، وہ بھی مبارک باد کے مستحق ہیں، غرض یہ کہ جو جس طرح بھی یہاں آیا اور اسکے والدین لائق تحسین و صد مبارک باد ہیں۔

مگر یہاں آپ کو کیا ملے گا؟ آپ کیا پائیں گے؟ یہ بہت وسیع موضوع ہے، جس پر مفصل روشنی ڈالنے کا یہ موقع نہیں ہے، امام غزالیؒ کی "احیاء العلوم" اس موضوع پر بہترین کتاب ہے، آپ موقع نکال کر اس کا مطالعہ کریں تو آپ

کو معلوم ہوگا کہ دینی درسگاہ میں طالب علم کو کیا کچھ ملتا ہے؟

کلام پاک کی نعمت

ابھی ابھی قاری جب تلاوت کلام پاک میں مشغول تھا تو مجھ پر صرف ایک کیفیت شروع سے آخر تک طاری رہی اور وہ یہ کہ ہم جیسے ناپاک و نجس انسان جس کی حیثیت لاشیٔ محض کی سی ہے، وہ اور اس ذات عالی کا کلام جس نے بحر وبر، آسمان اور زمین شمس و قمر کو وجود بخشا اسکا کلام سمجھ سکیں، اسکے مخاطب بننے کے مستحق بن سکیں، الٰہی کیا مقام ہے، وہ شخص جس کی اس صفحہ ہستی کے اوپر کوئی حیثیت نہیں، آخر وہ اس نعمتِ عظمٰی کو پاکر دیوانہ کیوں نہیں ہو جاتا، گریبان کیوں نہیں پھاڑ لیتا، کیا ہم اس قابل ہیں کہ خلاق عالم کے مخاطب بن سکیں، جب تک قاری تلاوت میں مشغول تھا، مجھ پر صرف یہی ایک تأثر قائم رہا، یہ فہم قرآن اتنی بڑی نعمت ہے کہ اگر اس پر کوئی شخص خوشی سے دیوانہ ہو جائے، اور گریباں چاک کر کے مجنونانہ کیفیت اختیار کرلے تو کوئی تعجب انگیز بات نہیں، کیا ابی بن کعبؓ کا واقعہ بھول گئے، ذرا تاریخ کے اوراق کو الٹ کر ایک مرتبہ پھر نظر ڈالیئے، جب رسول اللہ ﷺ نے ابی ابن کعبؓ سے فرمایا خدا نے تمہارا نام لیکر کہا ہے کہ ان سے کلام پاک پڑھوا کر سنو تو سیدنا ابی ابن کعبؓ پر والہانہ کیفیت طاری ہو گئی، اور مارے خوشی کے چیخ نکل گئی، اور فرمایا او سماني ربي اللہ تعالیٰ کیا کہتا ہے، خدا اور اسکے رسول سے محبت و وارفتگی کا جس کا عشر عشیر بھی ہمارے نصیب میں نہیں۔

میرے عزیزو! اگر یہاں آپکو کچھ نہ ملے، سارا مال خرچ کرنے کے بعد صرف یہی ایک نعمت ملے کہ ہم خدا کے کلام کے مخاطب بننے کے اہل ہو جائیں، تو سچ جانئے دنیا کی ساری لذتیں و آرائشیں سب اس ایک نعمت پر قربان، اور اس نعمت

عظمیٰ کے ملنے کے بعد آپ کی ساری محنتیں وصول اور آپکے والدین کی ساری کمائی حاصل۔

میرے عزیزو! یہ بات خوب ذہن میں بٹھالیجئے کہ آپ یہاں کس لئے آئے ہیں، اپنی تعلیم میں لگنے سے پہلے اپنے مقاصد کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے، آپ کس نعمت کو حاصل کرنے آئے ہیں، اسکے لئے ذہن کو بیدار کر لیجئے، تمہارا قصہ صرف یہی نہیں کہ تم زبردستی لائے گئے ہو، بلکہ تمہارے اور تمہارے خالق کے درمیان ایک سنہری زنجیر ہے، جسکا اگر ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہے تو دوسرا سرا اللہ رب العزت کے قبضہ میں، گویا تمہارے اور اللہ کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہے، جسکی بنا پر تم اسکے کلام کو سمجھ سکتے ہو، اور اسکو اخذ کر سکتے ہو، اس سے بات کرنے کا طریقہ تمہیں معلوم ہے۔

مدرسے کا مقصد

میں کسی بھی مدرسہ کی تعریف ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ جب ایسی زبان سکھائی جاتی ہے جس کی بدولت عربی کتابیں پڑھی جاسکیں، اور اس سے دوسرے دنیاوی فائدہ اٹھائے جاسکیں، عربی مدرسہ کی ہرگز ہرگز یہ تعریف نہیں، بلکہ وہ تو وہ جگہیں ہیں جہاں طالب علم کے درمیان جیسا کہ میں نے پہلے کہا، اور خدا کے درمیان ایک بلاواسطہ کی کڑی ہے، جس کا ایک سرا ادھر ہے، اور دوسرا سرا اللہ کے قبضہ میں ہے۔

ہمیں کیا کرنا ہے

میرے عزیزو! اس بات کو سمجھو کہ اس نعمت عظمیٰ کا اہل بننے کے لئے تمہیں کن باتوں کی ضرورت ہے، تمہیں کم سے کم کیا کرنا ہے؟ سب سے پہلے اپنے اندر شکر

پیدا کرو، اکیلے میں بیٹھ کر سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں انبیاء عظام اور اولیاء کرام کے راستہ پر ڈال دیا، اگر تم پھر اپنی سابقہ جگہ پر پہنچ جاؤ تو یہ تمہاری بڑی بدقسمتی ہے، اس راستہ میں اولیاء کرام اور انبیاء عظام کا نقش قدم نظر آئیگا، اور اس سے بڑھ کر تمہیں علم نبوت کی روشنی ملے گی۔

دوسری چیز اس مدرسہ کی زندگی میں حسب استطاعت اپنے کو اس کے مطابق بنانا ہے، ہر راہ کے کچھ تقاضہ ہوتے ہیں، اس راہ کے تقاضے یہ ہیں کہ فرائض کی پابندی کی جائے، مثلاً نمازوں میں مستعدی، جماعت کے وقت سے پہلے مسجد آجاؤ، نوافل ودعاء کا ذوق پیدا کرو۔

تیسری چیز، اپنے اخلاق کو بھی اسی کے مطابق بناؤ، تمہارے اندر صبر، زہد، استغنیٰ کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

چوتھی چیز تمہارے اخلاق وآداب، طور وطریق، رہن سہن سب خالص اسلامی ہو، تمہارا مظہر بھی اس راستہ کے پیشواؤں کے مطابق ہو۔

مجھے خدا کی قسم تمہارے متعلق یہ خطرہ ہرگز نہیں کہ تم یہاں سے جانے کے بعد فقر سے دوچار ہوگے، خطرہ جو ہے وہ صرف اس بات سے کہ کہیں اس نعمت عظمیٰ کی ناقدری سے جو اللہ تعالیٰ تم کو عطا فرما رہا ہے تم پر اِدبار نہ آجائے اور اگر تم نے شکر ادا کیا تو اس نعمت کے شکر کے عوض تمہاری استعداد کہیں زیادہ بڑھ جائے گی، لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَأَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ۔

لیکن جب تک تم اپنے اندر جوہر ذاتی نہ پیدا کرو گے اور استعداد میں پختگی نہ حاصل کرو گے، اس وقت تک تم کچھ بھی نہ ہو گے، اور دنیا میں بھی جا کر تم کچھ نہ کر سکو گے۔

آخر میں میں اس امر کو پھر صاف صاف بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ اپنی تعلیم شروع کرنے سے پہلے اپنے مقاصد اور اپنے مقام کو پہچانو، پڑھنا اور استعداد پیدا کرنا ہی صرف اپنا مقصود اور نصب العین بناؤ، اس کے علاوہ کسی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو، انشاء اللہ دنیا میں بھی کامیاب وبامراد رہو گے، کامیابی وشادمانی تمہارے قدم چومے گی، اور پھر اللہ رب العزت کے حضور میں حاضری کے وقت بھی سرخرو ہو گے، اللہ آپکو کامیاب کرے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

☆☆☆☆☆

علوم اسلامیہ کے سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں بلکہ اصل سرچشمہ وحی ہے

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام ایک چار روزہ سیمینار منعقدہ ۲۲ تا ۲۵ جنوری ۱۹۷۷ء میں کی گئی ایک اختتامی تقریر۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علوم اسلامیہ کے سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں بلکہ اصل سر چشمہ وہی ہیں

مہارت اور اختصاص ضروری ہے

حضرات! میں آپ کی اس عزت افزائی کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے اس علمی مجلس کے افتتاح کے موقع پر اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا، اب اس کے آخری نشست کے اختتام پر بھی مجھے تقریر کا موقع دیا ہے، آغاز وانجام میں خاص مناسبت ہے، میں آپ کے اس اعتماد واعزاز کے لئے دل سے شکر گذار ہوں، مجھے بڑی مسرت ہے کہ علوم اسلامیہ اور دینی موضوعات سے کچھ عرصہ سے عصری دانش گاہوں کے فضلاء بھی دلچسپی لینے لگے ہیں، اور یہ سیمینار اس کی دلیل ہے، اب علوم اسلامیہ کے ایک خادم اور میدان تحقیق کے پرانے مسافر کو اقبالؔ کے الفاظ میں یہ کہنے کا حق ہے کہ ؎

سگئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں　　　یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں

دماغی صلاحیتوں کا خزانہ کسی ایک طبقہ میں مرکوز نہیں ہے، نہ کبھی مرکوز رہا ہے، اور نہ کبھی مرکوز ہو سکتا ہے، اور ایسا ہونا کچھ اچھا بھی نہیں، اس طبقہ کے لئے خواہ یہ بات کتنی ہی نازش وافتخار کی ہو، لیکن انسانیت کے حق میں یہ کوئی بہتر بات نہیں ہے کہ انسانی ذہانتوں کا خزانہ اور محنتوں کا ذخیرہ کسی ایک طبقہ میں مرکوز ہو کر رہ جائے، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں علمائے دین کا کوئی مخصوص موروثی طبقہ نہیں ہے، کلرجی (CLERGY) اور پریسٹ ہڈ (PRIESTHOOD) کا تخیل مسیحی دنیا میں ملتا ہے، اس کا دنیائے اسلام میں کہیں وجود نہیں، اگر ہمارے بعض اہل قلم مصنفین کی تحریروں میں کچھ ایسی تعبیرات اور الفاظ آتے ہیں تو بے سوچے سمجھے یا مغرب کی تقلید میں، مثلاً اس وقت عرب مصنفین کے یہاں "رجال الدین" کا ایک لفظ استعمال ہوتا ہے، جو تقریباً اسی معنی میں ہے جو مسیحی دنیا میں پرسٹ ہوڈ (PRIESTHOOD) کے لئے استعمال ہوتا تھا، اس لئے محتاط مصنفین جو اسلام کی صحیح روح اور صحیح فکر کی ترجمانی کرنا چاہتے ہیں، ان لفظوں سے ہمیشہ احتراز کیا ہے، لیکن علوم اسلامیہ کی طرف عصری دانش گاہوں کے فضلاء کی توجہ پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بھی میں یہ اضافہ کروں گا کہ کلرجی (CLERGY) اور پریسٹ ہڈ (PRIESTHOOD) اسلام میں نہیں ہے لیکن ایکسپرٹ (EXPERT) اسپیشلسٹ (SPECIAL-IST) ماہرین فن اور اصحاب اختصاص کا وجود ہمیشہ رہا ہے اور یہ ایک علمی حقیقت ہے، اس لئے کہ علوم اتنے پھیل گئے ہیں، اور ان میں اتنا تنوع اور وسعت پیدا ہو گئی ہے کہ ایک آدمی کے لئے ہمہ داں ہونا عملاً ناممکن ہے، یورپ میں بھی ترقی

اس وقت سے شروع ہوئی جب وہاں تقسیم کار کے اصول پر عمل کیا گیا، اور علوم کے مختلف شعبے تقسیم ہو گئے، اور اسکی کوشش مغربی فضلاء نے چھوڑ دی کہ وہ تمام علوم میں اتھارٹی اور سند کا درجہ حاصل کریں، جہاں تک مجھے علم ہے یورپ میں اب بھی اس اصول کا احترام مشرق سے زیادہ کیا جاتا ہے، وہاں کسی علم کے فاضل بھی بعض اوقات اس علم کے بعید متعلقات کے متعلق بغیر کسی شرم و ندامت کے محسوس کئے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ہمارا موضوع نہیں، اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے، ہمیں اس کو اصول کے تحت تسلیم کر لینا چاہئے کہ ہماری آئندہ دلچسپیاں اور ہماری علمی اور تصنیفی سرگرمیاں کسی خاص موضوع یا فن کے ساتھ مخصوص ہوں گی۔

معیار کی طرف توجہ کی ضرورت ہے

مجھے خوشی اور فخر ہے کہ میں آپ کا ہم سفر ہوں ہم سفری کے اس حق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں آپ کے سامنے چند باتیں عرض کر دینا چاہتا ہوں، آپ اس کو کسی تعریض پر محمول نہ فرمائیں، پہلی بات جسے میں محسوس کر رہا ہوں، اور آپ میں سے بہت سے لوگ محسوس کر رہے ہوں گے، بہت سے سینئر اسکالرز یہاں موجود ہیں جن کے ۳۰-۴۰ برس اس صحرا نوردی میں گذرے ہوں گے کہ علم و تحقیق کا معیار روز بروز گھٹتا جا رہا ہے، مجھے یورپ کے سفروں میں بھی اس کا احساس ہوا اور میں نے بعض فضلاء سے بھی سنا وہاں بھی اورینٹل ازم کا جہاں تک تعلق ہے، یعنی مشرقی مباحث پر لکھنے کا، اسکا معیار فروتر ہو گیا ہے، اور وہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ جتنی محنت اور جیسا عشق اور لگن گذشتہ نسل کے فضلاء میں

تھی، اس میں کمی ہے، اس کے پیچھے بہت سے عوامل اور (FACTORS) کام کرتے ہیں کچھ سیاسی ہیں کچھ معاشی ہیں۔

استشراق کی ترقی کا راز

ہر علم کے پیچھے بعض بہت طاقتور محرکات ہوتے ہیں، ان عوامل و محرکات نے اورینٹل ازم کو ایک زمانہ میں چوٹی پر پہونچادیا تھا، فزکس اور ٹکنالوجی یا اکنامکس کے چند دائروں کو چھوڑ کر جہاں تک علمی اور نظری مباحث کا تعلق ہے، اورینٹل ازم کو جو یورپ میں اعزاز حاصل تھا، مستشرقین اور ان کی کتابوں کی جس طرح قدر ہوتی تھی، وہ کم علوم کو حاصل تھی، یہاں تک کہ ادبیات اور لسانیات کے علوم کو بھی شاید وہ درجہ نہیں دیا جاتا تھا، اس کے پیچھے ایک بہت بڑا عامل یا (FACTIOR) کام کر رہا تھا، ہم کو خوشی ہونی چاہئے کہ اب وہ باقی نہیں رہا، وہ تھا استعمار، مشرق کے سب سے زیادہ سرسبز و شاداب ممالک بدقسمتی یا خوش قسمتی سے مسلمانوں کے زیر اثر تھے، ان پر مغرب کی للچائی ہوئی نگاہیں پڑ رہی تھیں۔

استعمار نئی نئی نوآبادیاں (COLONIES) قائم کرنا چاہتا تھا، اس لئے وہاں کے قومی مزاج اور خصوصیات اور ان کی خوبیوں سے زیادہ کمزوریوں سے واقف ہونے کی ضرورت تھی، اس کے لئے مستشرقین ایک ہراول دستہ (PIONEER) کا کام کرتے تھے، ان کے پیچھے حکومتوں کی سرپرستی تھی، بڑے بڑے فنڈ اور بڑے بڑے ادارے تھے، اور ان کا اکرام بادشاہ اور صدر جمہوریہ کے دربار میں بھی ہوتا تھا، یہ (FACTOR) عرصہ ہوا کمزور پڑ گیا ہے،

دوسرا معاشی عامل (FACTOR) تھا، اس پر بھی کچھ اثر پڑا ہے، معاشی

ڈھانچہ میں ایسی تبدیلیاں ہوئیں ہیں کہ اب وہ انعام ملنا مشکل ہے جو پہلے ملتا تھا۔

علم کا عشق

تیسری چیز جو زیادہ توجہ کے قابل ہے، اور اس کو میں اصل سمجھتا ہوں وہ ہے، علم کا عشق جو ہماری پہلی نسل میں تھا، ایک لگن اور خود فراموشی کی کیفیت جو اس عہد میں تصنیفی اور تحقیقی کام کرنے والوں پر طاری رہتی تھی۔

یہ بات کسی خاص دانش گاہ یا جامعہ کو سامنے رکھ نہیں کہہ رہا ہوں، یہ میرا عام مطالعہ ہے، تقریباً سب جگہ یہ محسوس کیا جا رہا ہے (اور یہ بدقسمتی کی بات ہے) کہ علم سے عشق جو ہمارے اسلاف میں پایا جاتا تھا، اسلاف سے مراد مسلمانوں ہی کے اسلاف نہیں بلکہ گذشتہ نسل میں پایا جاتا تھا، وہ اب بہت کم نظر آتا ہے۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی کتاب ''علمائے سلف'' جو انہوں نے اسی علی گڑھ میں لکھی ہے اس کو پڑھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ علم کا عشق اس وقت کے مصنفین اور محققین کے دلوں میں کیسا موجزن تھا، اور آج اس میں کس قدر نمایاں انحطاط ہوا ہے، یہ انحطاط کیوں ہوا؟ اس کا تعلق سیاسیات، معاشیات، ادبیات اور اخلاقیات سب سے ہے، اس کے پورے اسباب کا تجزیہ کرنا اس وقت نہ ضروری ہے، اور نہ اس کی گنجائش ہے، لیکن اتنی بات آپ تسلیم کریں گے اور ہمارے معزز شرکاء کار اور ہم سفر ضرور اس کو تسلیم کریں گے کہ علم سے عشق، شمع علم پر پروانگی کی کیفیت علم و تحقیق کا ایسا جنون کہ کھانے پینے، کپڑے کا ہوش نہ رہے، آج مفقود بلکہ معدوم نظر آتا ہے، علماء سلف کے واقعات کو چھوڑ دیجئے اسی علی گڑھ میں جو علماء پیدا ہوئے، مولانا لطف اللہ علی گڑھی ان کے

اس عشق کو دیکھئے اور اس کو بھی آپ چھوڑ دیجئے، اس وقت کے مغربی مصنفین کے یہاں "لین" (LANE) جس کا عربی لغت انگریزی دانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ عربی ادب کے ان فضلاء کے لئے بھی قابل استفادہ ہے، جو تفصیلات میں جانا چاہتے ہیں، اور وہ مواد یکجا دیکھنا چاہتے ہیں، جو بعض اوقات بہت سے عربی لغتوں میں بھی نہیں ملتا، میں نے سنا ہے کہ قاہرہ میں جب وہ اس لغت کا کچھ حصہ تیار کر رہا تھا تو مہینوں گذر گئے وہ کہیں نہیں گیا اس کو پتہ نہیں تھا کہ بازار کہاں ہے، بازاروں میں جانے اور اہرام مصر جیسے عجائبات عالم کو دیکھنے کی فرصت نہ تھی، اس کو آپ بد مذاقی یا مردہ دلی پر محمول کر سکتے ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے، بہت سی لازوال اور لافانی تصانیف کی تاریخ اگر آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے مصنفین پر خود فراموشی کا عالم طاری تھا، یہ وہ چیز تھی جس نے مغرب و مشرق کے مصنفین کے قلم سے وہ زندہ جاوید تصانیف اور ایسی تحقیقات نکلوائیں (جن سے اختلاف کے باوجود) ان کی علمی قدر و قیمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ماضی قریب کی علمی شخصیتیں

میرا روئے سخن خالص اپنے ان دوستوں سے ہے، جو لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں، مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مولانا شبلی نے کتب خانہ اسکندریہ پر قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس کی، ایک زمانہ تھا، جب ہندوستان مین مشترک دانش گاہوں میں پڑھنے والے مسلمان طلباء کو چڑھانے کے لئے صرف یہ کہنا کافی تھا "اچھا آپ اس نسل اس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، جس کے خلیفہ نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلوا دیا تھا" ابھی وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے وہ زمانہ پایا ہے،

وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم لوگ منہ چھپاتے تھے، بلکہ منہ چراتے تھے، اور آنکھیں نہیں ملا سکتے تھے کہ اس کا کیا جواب دیں، ایک چلی ہوئی کہانی تھی کہ حضرت عمرؓ کو لکھا گیا کہ یہاں ایک کتب خانہ ہے، جو ظہور اسلام سے پہلے کا ہے، اس میں فلاسفہ کی اور منطقیوں کی کتابیں ہیں تو انہوں نے کہا کہ اگر وہ قرآن کے مطابق ہیں تو اس کی ضرورت نہیں اگر خلاف ہیں تو اس کو آگ لگا دینی چاہئے چنانچہ لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ قرآن کے خلاف ہیں، اور بغیر پڑھے کتب خانے کو آگ لگا دی، یہ ایک کہانی تھی، جس کو ٹائن بی (TOYNBEE) جیسا مؤرخ تک دہراتا ہے، ٹائن بی (TOYNBEE) نے جب رسم الخط کی تبدیلی اور کمال اتاترک کی اصلاح پر تبصرہ کیا تو اس نے کہا اب کتب خانہ اسکندریہ کو جلانے کی ضرورت نہیں، صرف رسم الخط بدل دینا کافی ہے، علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس پر قلم اٹھایا، اور اس افسانہ کو آخری طور پر ختم کر دیا اب کسی پڑھے لکھے کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ یہ کہے کہ کتب خانۂ اسکندریہ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں ان کے حکم سے جلا دیا گیا، انہوں نے قدیم مؤرخین کی شہادتوں سے ثابت کر دکھایا کہ کتب خانہ اسکندریہ حضرت عمرؓ کی خلافت سے پہلے ہی جل چکا تھا، اس کا کہیں وجود ہی باقی نہیں تھا، مثلاً انہوں نے جزیہ کے مسئلہ پر قلم اٹھایا تو اس بحث ہی کو ختم کر دیا، یا انہوں نے "شعر العجم" لکھی تو اہل ذوق اور فارسی دانوں سے اپنا لوہا منوالیا، پروفیسر براؤن (PROF. BROWN) جن کی کتاب "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" اپنے موضوع پر (GOSPEL) کا درجہ رکھتی ہے، اور دنیا کی اکثر یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل تھی) نے کہا کہ مجھے اب اردو سیکھنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے تو اس لئے کہ میں براہ راست "شعر العجم" کا مطالعہ کر سکوں، یہ سب اس علمی شغف اور علمی استغراق کا

نتیجہ تھا جو ان لوگوں پر طاری تھا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ جن کا اصل موضوع قرآن مجید، سیرت نبویؐ اور تاریخ اسلام تھا انہوں نے "عمر خیام" پر ایک ایسی کتاب لکھی جس کی داد فضلائے ایران نے بھی دی، اسی طرح ان کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" محنت و کاوش اور ریسرچ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

میں اس موقع پر "نزہۃ الخواطر" کا بھی ذکر کروں گا، جو میرے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی تصنیف ہے، اور عربی میں آٹھ ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی، اس میں ہندوستان کے ساڑھے چار ہزار مشاہیر اور اہل کمال کے تذکرے ہیں، انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں اس کام کا بیڑہ اٹھایا، جب عربی مطابع کا رواج اور اشاعت کی سہولتیں نہیں تھیں، تقریباً ۲۵ سال وہ اس کام میں مشغول رہے، اس وقت یورپ میں بھی یہ کتاب ہندوستانی علماء و فضلاء کے حالات معلوم کرنے کا سب سے بڑا ماخذ ہے، اسی طرح ان کی دوسری کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" جو ہندوستان میں علوم اسلامیہ اور نصاب درس کی تاریخ اور ہندوستانی علماء کی تصنیفات کی مکمل ڈائرکٹری ہے، اس کتاب کو دمشق کی رائل اکیڈمی "المجمع العلمی العربی" نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا، میں نے وہاں کی علمی مجلسوں میں بڑے بڑے فضلاء کو اس کی تعریف اور مصنف کی محنت کا اعتراف کرتے ہوئے پایا۔

علم محنت بھی ہے اور انعام بھی

ایک آدمی اس وقت وہ کام کرتا تھا جو ایک اکیڈمی اس وقت انجام نہیں

دیتی، یہ سب ایک آدمی کی محنت کا نمود، ایک آدمی کی محنت کا کرشمہ اور ایک آدمی کے علم سے عشق کا نتیجہ ہے، آج اکیڈیمیاں، بڑے بڑے ادارے اور شعبے موجود ہیں، لیکن سالہا سال میں وہ کوئی ایسی پیش کش نہیں کرپاتے جس کو دیکھ کر اس علم کے ماہر یہ کہیں کہ ہاں یہ اوریجنل (ORIGINAL) چیز ہے، بعض کتابیں دیکھ کر غالبؔ کا وہ مصرع پڑھنا پڑتا ہے ؂

اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

محنت کے معیار کو بڑھانے کی ضرورت ہے، علم محنت بھی ہے، انعام بھی ہے، پیاس بھی ہے پانی بھی، بھوک بھی ہے، غذا بھی۔

جب تک اپنے فن سے اتنا تعلق نہ ہو کہ آدمی کو کتاب لکھنے پر اتنی خوشی ہو کہ وہ کہے اب مجھے اس ڈیپارٹمنٹ کا چیرمین بنایا جائے یا نہ بنایا جائے، میں نے اپنا کام کردیا، میری محنت وصول ہوگئی۔

آج کے فضلاء اپنی کتاب اور تحقیق کو مکمل نہیں کر چکتے کہ وہ اس کے انعام کے متوقع ہو جاتے ہیں، سب کی نگاہیں عہدے اور منصب کی ترقی، شہرت و ناموری اور تنخواہوں کی بیشی پر لگی ہوئی ہیں، اور ان کی ذہانت و توجہ کا بڑا حصہ اسی مقصد پر صرف ہوتا ہے، آپ بہت سے ISMS سے واقف ہیں، ایک نئے ISM کا اضافہ کر لیجیے جو ہماری دانش گاہوں اور تعلیمی مرکزوں میں تیزی سے پھیل رہا ہے، اور وہ ہے CAREERISM (کیریرازم) یعنی CAREER کو بہتر بنانا اور تقرب اور علم کے ذریعے جاہ طلبی۔

دلچسپی اور شغف عارضی نہ ہو

دوسری چیز یہ کہ یہ دلچسپی اور شغف عارضی نہ ہو مثلاً کسی سیمینار کے لئے ہم کسی موضوع کو اپنے اوپر تھوڑی دیر کے لئے طاری کرلیں پھر اس کے بعد جیسے جگالی کی جاتی ہے، پڑھ کر ہم اس کو اگل دیں اور نہ ہمیں اس موضوع سے محبت ہو اور نہ وفاداری ہو نہ فکر ہو کہ اس سلسلے میں کیا ہوا، نہ اس میں اضافہ کرنے کا شوق ہو، اس موقع پر اقبالؔ سے مدد لیتا ہوں انہوں نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے کہ ؎

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا

علم اور تحقیق بھی ایک ہنر ہے، اور اس ہنر کو زندگی بھر کا ساتھ دینا چاہئے۔ اس میں مقصدیت پیدا ہونی چاہئے وہ مثل شرر نہیں کہ بھڑکا اور بجھ گیا۔

علوم اسلامیہ کے سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں

جہاں تک علوم اسلامیہ کا تعلق ہے آپ بیشک اجتہاد کی ضرورت پر مقالے پڑھیں ہم سب اس کو تسلیم کرتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اس کا دروازہ بند ہو جانے کے اسباب کیا تھے، اور کہاں تک جائز تھے؟ لیکن میں ایک بات کہوں گا جہاں تک علوم اسلامیہ کا تعلق ہے، اس کے کچھ سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں، بلکہ ان کا اصل سرچشمہ وہی ہے۔ اس لئے ہمارا طرز عمل ان کے بارے میں وہ نہ ہونا چاہئے جو ایک غیر مسلم مستشرق (ORIENTALIST) کا ہوتا ہے ہم صرف بحث کریں اور ہمیں نہ اس سے کوئی دلچسپی ہو، نہ اس سے اتفاق ہو، ایک حد تک اتفاق بھی ہونا چاہئے اور اگر وہ ایمانیات سے تعلق رکھتا ہے تو اس پر ایمان بھی ہونا

چاہئے اور کسی حد تک ہماری عملی زندگی میں اس کی نمود بھی ہونی چاہیے، میں اپنے بچپن میں ایک حکیمانہ مقولہ سنا کرتا تھا کہ "یک من علم را دہ من عقل باید" ایک من علم ہو تو دس من عقل ہونی چاہئے ورنہ آدمی اس کا صحیح استعمال نہ کر سکے گا، تو میں ترمیم کروں گا کہ تحقیق کی کسی بڑی سے بڑی مقدار کے ساتھ کسی تناب سے تقویٰ بھی ہونا چاہئے، اس لئے کہ یہ مسئلہ علوم اسلامیہ کا ہے جس کا تعلق ایمانیات سے ہے، اگر ہم اس پر اس طرح عمل جراحی کرتے ہیں، جیسا کسی مردہ لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے، تو یہ مناسب نہیں، تنقید میں کسی قسم کی توہین یا تضحیک کی شان نہیں ہونی چاہئے کہ طنزیات و تضحیک کو خالص علمی مزاج سے کوئی مناسبت نہیں، آپ کا اپروچ APPROACH خالص علمی SCIENTIFIC خالص اکیڈیمک ACADEMIC ہو۔

جو لوگ علم کی ذمہ داریوں اور تحقیقات و نظریات کی تغیر پذیری سے واقف ہیں، وہ اپنے کسی علمی نظریے یا تحقیق کے پیش کرنے میں جزم و وثوق اور قطعیت کے الفاظ استعمال کرنے سے احتراز کرتے ہیں، وہ اپنے کسی نئے خیال کو اس طرح نہیں پیش کرتے کہ وہ گویا اس موضوع پر حرف آخر اور تمام پچھلی تحقیقات پر خط نسخ پھیر دینے والا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میرے اس وقت کے مطالعہ اور تحقیق نے اس نتیجہ تک پہونچایا ہے، ممکن ہے کہ آئندہ اس میں تبدیلی کرنی پڑے یا کوئی نئی بات ثابت ہو، یا مجھے اندیشہ ہے کہ یہ بات اس طرح ہو، مجھے بدرالدین طیب جی کا یہ جملہ پسند آیا جو انہوں نے کل ایک نشست کی صدارت کرتے ہوئے ایک مقالہ نگار سے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کا وقت ختم ہو گیا ہو، (I AM AFRAID YOUR TIME IS OVER) وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ حضرت آپ کا وقت

ختم ہو گیا ہے، لیکن انہوں نے اس کو بڑے لطیف انداز سے ادا کیا، ہم اس سے سبق لے سکتے ہیں، قلم پکڑیں تو آپ کو اول سے آخر تک علم کا احترام اور اس شخص کا احترام بھی ملحوظ رکھنا چاہئے جس نے اپنا وقت صرف کیا، جس نے اپنی آنکھیں خراب کیں، جس نے اتنا مواد فراہم کیا۔

عربی زبان کی اہمیت

عربی زبان کی اہمیت بنیادی چیز ہے، اگر آپ کو علوم اسلامیہ پر کوئی کام کرنا ہے تو یہ بڑے ڈس کلیفکشن (DISQUALIFICATION) کی بات ہو گی آپ عربی سے ناآشنا ہوں، قرآن، حدیث اور اسلامیات پر لکھنے والے بہت سے مشرقی اور مغربی فضلاء سے عربی نہ جاننے کی وجہ سے نادانستہ ایسی غلطی ہو جاتی ہے، جو بعض اوقات ان کے پورے علمی کارنامے پر پانی پھیر دیتی ہے۔

مجھے ایک دوست نے بتایا کہ دہلی میں کوئی سیمینار ہو رہا تھا، اس میں ایک صاحب جنہوں نے انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا، تقریر کر رہے تھے تو مشہور عرب ادیبہ اور مورخہ "عائشہ بنت الشاطیٔ" نے جو اس سیمینار میں شریک تھیں، ان سے عربی میں خطاب کیا تو انہوں نے بے تکلفی سے کہا کہ میں عربی نہیں سمجھتا تو عائشہ نے کہا کہ قرآن مجید کا ترجمہ پھر آپ کیسے کرتے ہیں؟ اس کے بعد وطن جا کر انہوں مصر کے کثیر الاشاعت اخبار "الاہرام" میں اس پر کئی قسطوں میں مضمون لکھا کہ "میں نے عجائبات عالم میں سے ایک عجیب چیز یہ دیکھی کہ ایک فاضل نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور وہ عربی سے ناواقف تھا"۔

آپ حضرات آسانی کے ساتھ اس پر قابو پا سکتے ہیں، اور عربی زبان میں وہ

دسترس حاصل کرسکتے ہیں، جس سے آپ غلطیوں سے بچ سکیں، اس سلسلے میں عربی مدارس آپ سے بھر پور تعاون کریں گے۔

انتشار انگیزی سے احتراز کیجئے

بعض فضلاء اپنے نظریات و تحقیقات کے اظہار میں بہت عجلت سے کام لیتے ہیں، ان کی اشاعت ہو جاتی ہے، پھر وہ کچھ عرصہ بعد خود ہی ان سے رجوع کر لیتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنا اخلاقی فرض انجام دیتے ہیں، لیکن جو لوگ اس عرصہ میں ان نظریات و تحقیقات کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، ان کی ذمہ داری کس پر ہے؟ یہ مسئلہ اور زیادہ سنگین ہو جاتا ہے، جب اس کا تعلق ایمانیات اور عقائد سے ہو، اسلئے ہمیں اپنی تحقیقات کی اشاعت و تبلیغ کے بارے میں (خاص طور پر جب ان کا تعلق عقائد اور دینیات سے ہو) عجلت اور بے صبری سے کام نہیں لینا چاہئے، ان پر بار بار غور کرنا چاہے، ان کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے، ماہرین فن کے سامنے پیش کرنا چاہئے، اور ان کی رائے اور مشورہ کا انتظار کرنا چاہئے، پھر اس کے بعد اس کی اشاعت کی اجازت دینی چاہئے، یہ دور انتشار ہے، اس وقت طبیعتیں انتشار انگیزی کے لئے ہر وقت آمادہ ہیں، انسان ہمیشہ سے سہولت پسند اور حیلہ جُو واقع ہوا ہے، جدید تمدن نے، سائنسی ترقی کی رفتار نے اور معیار زندگی کی بلندی نے اس کو زیادہ سہولت پسند اور انتشار پسند بنا دیا ہے، اس لئے ہم ایسی بات کہنے سے احتراز کریں، جس سے لوگوں میں انتشار پیدا ہو۔

۱۹۶۷ء میں جب عربوں کو اسرائیل کے مقابلہ میں شکست فاش ہوئی تو میں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اس میں بہت بڑی ذمہ داری ان تشکیک پسند

ادباء اور مصنفین پر ہے، جنہوں نے ہماری جدید عرب نسل کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ تمام قدیم اقدار کو انہوں نے متزلزل کر دیا۔

میں شکر گزار ہوں وائس چانسلر صاحب پرو وائس چانسلر صاحب پروفیسر حقی صاحب اور ان سب حضرات کا جو اس سیمینار سے تعلق رکھتے ہیں کہ انہوں نے مجھے عزت بخشی اور بڑے اعتماد کا اظہار کیا، میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اس سیمینار میں کہا، مخلصانہ کہا۔

خدا کرے کہ میں بھی اس سے فائدہ اٹھاؤں اور آپ بھی اپنے جوہر اور کمالات میں اضافہ کریں۔

☆☆☆☆

☆☆☆

لسانی و تہذیبی "جاہلیت" کا المیہ

اور

اس سے سبق

یہ تقریر ۲۳ر مئی ۱۹۷۲ء کو مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (M.S.A.) کلکتہ کے ایک عظیم جلسہ میں ہوئی جس میں طلبہ کے علاوہ اساتذہ اور شہر کے تعلیم یافتہ مسلمان بڑی تعداد میں شریک تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لسانی و تہذیبی "جاہلیت" کا المیہ

اور

اس سے سبق

انسان تجربات سے فائدہ اٹھاتا ہے

حضرات! اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو بیش بہا نعمتیں دی ہیں، ان میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ وہ اپنے تجربوں سے فائدہ اٹھاتا ہے اگر اس کو راستہ چلتے ٹھوکر لگ جاتی ہے تو وہ جھک کر دیکھنے لگتا ہے، کہ اس کو کس چیز سے ٹھوکر لگی، وہ راستہ کے اس پتھر کو ہٹا دیتا ہے یا اس سے بچ کر چلتا ہے اور اگر کسی راستہ میں ایسے ہی پتھر پڑے ہوئے ہیں، یا پیچ و خم ہیں، تو وہ دوسرا صاف، سیدھا اور ہموار راستہ اختیار کرتا

ہے، اس سے جب کوئی شدید غلطی ہوتی ہے، یا کسی معاملہ میں اسکو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، تو وہ اس کے اسباب وعلل پر غور کرتا ہے، اس ناکامی کا راز معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور آئندہ ایسی غلطیوں سے بچنے کی جدوجہد کرتا ہے، جنکی وجہ سے اس کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، اسباب ونتائج کا یہ تجزیہ (ANALYSIS) انسان کی وہ فطری صلاحیت اور خداداد عطیہ ہے جس سے جانور عام طور پر محروم ہیں، اور جس کی وجہ سے انسان اعلیٰ مراتب کمال تک پہونچا، اور انسانی تہذیب وتمدن، اور علوم وفنون نے اتنی ترقی کی۔

انسان کی تعریف یہ نہیں کہ وہ غلطی نہیں کرتا، غلطی کرنا تو اس کی سرشت اور خمیر میں داخل ہے، اور آدم کی میراث ہے، تعریف یہ ہے کہ وہ غلطی کا اعتراف کرتا ہے، اس پر نادم ہوتا ہے، اس کی تلافی کرتا ہے، اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے، اور بعض اوقات اپنی ایک لغزش اور غلطی پر اسکو ایسی ندامت ہوتی ہے، کہ اس سے وہ میدان ترقی میں ہزاروں لاکھوں میل کی مسافت آن کی آن میں طے کرلیتا ہے، اور اس مقام تک پہونچ جاتا ہے جہاں غلطی اور توبہ کے بغیر وہ برسوں میں بھی نہیں پہونچ سکتا تھا، اور اسکی اس ترقی اور پرواز پر معصوم فطرت فرشتوں کو بھی رشک آنے لگتا ہے، نسل انسانی کے مورث اعلیٰ حضرت آدمؑ سے بھی غلطی ہوئی تھی، لیکن انھوں نے اس غلطی پر اصرار نہیں کیا، بلکہ ان لفظوں میں اس کا اعتراف، اور اس پر ندامت کا اظہار کیا کہ رحمت الٰہی کے دریا میں ایک تلاطم برپا ہوگیا، اور ان کو محبوبیت کا وہ مقام حاصل ہوگیا، جو شائد اس لغزش سے پہلے حاصل نہ تھا انھوں نے کہا۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (سورہ

الاعراف. ۲۳) اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا، اور ہم پر رحم نہیں کریگا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔

انکو اس توبہ اور ندامت سے جو ترقی حاصل ہوئی، اس کا قرآن مجید نے خود اعلان فرمایا ہے۔

وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ اور آدم نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا، تو وہ بے راہ ہو گئے، پھر ان کے پروردگار نے ان کو نوازا اور ان پر مہربانی سے توجہ فرمائی اور سیدھی راہ بتائی۔

لیکن شیطان کا معاملہ اس کے بر عکس تھا، اس نے اپنی غلطی اور نافرمانی پر اصرار کیا، اور اپنے عمل کی صحت اور جواز کے لئے دلائل دیئے۔

قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ (سورہ الاعراف ۱۲) اس نے کہا کہ میں اس سے افضل ہوں، مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے بنایا ہے

بہت سی انسانی کامیابیوں کا سہرا غلطیوں کے سر ہے

انسانی ترقیات اور تہذیب و تمدن کی وسعت اور ارتقاء میں غلطیوں کا حصہ صحیح اقدامات، اور راست روی سے شاید کم نہیں، بلکہ بعض انسانی فتوحات اور کامیابیوں کا سہرا انہیں غلطیوں کے سر ہے، اس طرح انسانی تاریخ جس طرح انسانوں کے صحیح فیصلوں، اور صحیح عمل کی مرہون منت ہے، اسی طرح غلطیوں، لغزشوں اور نادانیوں کی بھی، اور اس دعوای کے ثبوت کے لئے آپ کو تاریخ میں

بہت سی مثالیں ملیں گی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جزیرہ نمائے سینا میں صحیح سلامت پہونچنا، اور فرعون کے لشکر کا بحر احمر میں غرق ہونا، حضرت موسیٰ کے رات کے اندھیرے میں راستہ بھول جانے کا نتیجہ تھا، نئی دنیا (امریکہ) کی دریافت کولمبس کی غلطی، اور غلط فہمی کا نتیجہ تھا، جو ہندوستان کی تلاش میں نکلا تھا، وعلیٰ ھٰذالقیاس،

غلطیوں کا احساس نہ کرنا صحیح الفطرت انسان کا شیوہ نہیں

اپنی غلطیوں کا احساس نہ کرنا، اور اپنے تجربوں اور ناکامیوں سے فائدہ نہ اٹھانا، غلطیوں اور ناکامیوں کے اسباب وعلل کو تلاش نہ کرنا، ایک ہی غلطی بار بار کرنا، اور ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسا جانا ایک صحیح الفطرت اور صحیح الحواس انسان کا شیوہ نہیں ہے اور مومن کو تو یہ کسی طرح بھی زیب نہیں دیتا، جسکو اللہ تعالیٰ نے فراست ایمانی عطا فرمائی ہے، اور عقل و تجربے سے فائدہ اٹھانے کی سب سے زیادہ دعوت دی ہے، قرآن شریف نے گروہ منافقین کی یہ کمزوری اور عیب بیان کیا ہے، کہ وہ واقعات اور تجربات سے بالکل فائدہ نہیں اٹھاتے، اور سال میں کئی کئی بار آزمائش میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اَوَلَا یَرَوْنَ اَنَّھُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ کُلِّ عَامٍ مَّرَّۃً اَوْمَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ وَلَا ھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ (سورت التوبہ ۱۲۶) کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، مگر اس پر بھی نہ توبہ کرتے ہیں، نہ کوئی سبق لیتے ہیں۔

مومن کی اسی صلاحیت پر اعتماد کرتے ہوئے ایک صحیح حدیث میں یہ

مضمون آیا ہے، لا یلدغ المومن من جحر مرتین (مومن ایک ہی سوراخ سے دو بار ڈسا نہیں جاتا)

لسانی وتہذیبی جاہلیت

ابھی چند روز کا واقعہ ہے کہ ایک قدیم اسلامی ملک، اور مسلمانوں کے خالص اکثریت والے علاقے میں جو علماء اور مشائخ، اور مدارس وخانقاہوں کی سر زمین تھی، جس کے چپہ چپہ پر مسجدیں اور خانۂ خدا تھے، جس کے لئے صدیوں اولیاءِ کرام نے آب دیدہ، اور خون جگر بہایا، اور جس کی زمین انکے آنسوؤں سے نم، اور جس کی فضاء انکے نالہ ہائے نیم شبی سے گرم تھی، زبان وتہذیب کے جنون کی ایک تیز وتند لہر اٹھی، اور دیکھتے دیکھتے صدیوں کی محنتوں پر پانی پھر گیا، مسلمان نے بے تکلف مسلمان کا گلا کاٹا، بے گناہ انسان اس طرح مارے گئے جیسے سانپ اور بچھو مارے جاتے ہیں، اور ان پر کوئی رحم نہیں کھایا جاتا، جن لوگوں نے اس ملک میں پناہ لی تھی، ان کے لئے اب اس ملک میں کہیں پناہ نہ تھی، نہ کسی دل میں ان کے لئے رحم کا جذبہ تھا، نہ کسی آنکھ میں انکے لئے کوئی آنسو، انسانوں کا شکار اس طرح کھیلا جارہا تھا، جیسے کسی جنگل میں درندوں، پرندوں کا۔ اور کسی تالاب ودریا میں مچھلیوں کا کھیلا جاتا ہے، نہ شریف عورتوں کی عصمت محفوظ رہی، نہ بوڑھوں کے بڑھاپے پر ترس کھایا گیا، نہ معصوم بچوں کی چیخ پکار پر کان دھرے گئے، بھوک پیاس کا عذاب، سنگ دلی اور شقاوت کی کوئی قسم ایسی نہ تھی، جو اپنے بھائیوں کے لئے روا نہ رکھی گئی ہو، زبان کی "وثنیت" (بت پرستی) عقیدۂ توحید پر، قوم پرستی، اور نسل پرستی، اسلامی وحدت پر اور حمیت جاہلیت اور عصبیت، اخوت اسلامی پر، اس

طرح غالب آکر رہی کہ ابتدائے اسلام سے آج تک کسی خطۂ زمین پر ابھی تک اس طرح غالب نہیں آئی تھی اور اسلام اور مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں کبھی اسطرح ذلیل نہیں ہوئے، جس طرح اس زمانہ میں۔

تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

مختلف زبانیں، تہذیبیں، تمدن اور طرزِ معیشت دنیا میں اس وقت سے ہیں، جب سے انسان ہے، انسانیت نے ہمیشہ انکے سایہ میں آرام اٹھایا، انکی وجہ سے زندگی کا لطف بڑھا اور اسکے اندوختہ، اور سرمایہ میں اضافہ ہوا، اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنا یہ احسان یاد دلاتے ہوئے، فرمایا:۔

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ۔ (سورہ حجرات) لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہاری قوم اور قبیلے بنائے تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرو، اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے، جو زیادہ پرہیزگار ہے، بیشک خدا سب کچھ جاننے والا، اور سب سے خبردار ہے۔

دوسری جگہ ہے:۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ. (سورہ روم ۲۲) اور اسی کے نشانات میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا، اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا، اہل دانش کے لئے اس میں نشانیاں ہیں۔

لیکن بنی نوع انسان کی طویل تاریخ میں جو اس قسم کے سنگین واقعات، المیوں، اور مضحکہ خیز ڈراموں سے بھری ہوئی ہے ہم کسی ایسی جنگ سے واقف نہیں، جو صرف زبان اور کلچر کے لئے لڑی گئی ہو، عرب اپنے قوت بیان، اور لسانی تعصب میں مشہور تھے، یہاں تک کہ وہ اپنے سوا تمام لوگوں کو "عجمی" (گونگا) کہتے تھے، لیکن تاریخ نے کوئی ایک واقعہ ایسا ریکارڈ نہیں کیا جس میں عرب عجم سے کبھی اپنی زبان کی بنیاد پر لڑے ہوں، اسلام نے تو اس تعصب کو حرام و ناجائز کہا تھا، اسکا نام "حمية جاهلية" رکھا تھا، اور اس پر سخت نفرین کی تھی، اس کو جاہلیت کی قابل نفرت یادگار، کفر و بت پرستی کا رمز، اور اللہ و رسول کے خلاف جنگ کے مرادف، اور اسکے جھنڈے کے نیچے مرنے کو حرام موت، یا جاہلی اور غیر اسلامی موت قرار دیا تھا، لیکن جاہلیت کی تاریخ میں بھی زبان کے مسئلہ میں ہمیں کسی ایسے معرکہ کا ذکر نہیں ملتا۔

یہ در حقیقت یورپ، اور اسکی انتہا پسندانہ قوم پرستی کا فیض ہے، جس نے زبان اور کلچر کو یہ "مقدس" لباس عطا کیا ہے، اور اسکو ایک ایسا بت بنا دیا ہے، جس کے لئے انسانوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے، اور خون بہایا جاتا ہے، اس کے نتیجہ میں اکثر ملکوں میں پرانی تہذیب کے احیاء کا شوق، زبان کا تعصب، اور اسکے لئے مر مٹنے کا جذبہ پیدا ہوا، اور لوگوں کو زبان کی ایک نئی صلیبی جنگ (CRU-SADES) یا "جاہلیت (PAGANISM)" کا سامنا کرنا پڑا، جس کا تجربہ اب تک نہ ہوا تھا، یورپ کا یہ پروپیگنڈہ جو بڑی گہرائی، اور دور بینی کے ساتھ تیار کیا گیا تھا، ان مسلم اقوام میں پوری طرح پھیل گیا، جو بہت صحیح العقیدہ، سلیم

الفطرت، اور دینی وایمانی جذبات کی حامل تھیں، اور جن سے بجا طور پر یہ توقع تھی، بلکہ یقین تھا، کہ وہ اپنے دین اسلام، اور سلامت فطرت کی وجہ سے کم از کم دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں اس لسانی وثنیت سے بہت دور رہیں گی، جس کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی سند اور دلیل نہیں اور جس کی خدا کی میزان میں رائی کے دانہ کے برابر بھی قیمت نہیں۔

لیکن اچانک عالم اسلام، اور اسلام ووحدت اسلامی پر عقیدہ رکھنے والوں کے سامنے ایک نئی صورت حال سامنے آئی، اور زبان کا یہ فتنہ ایک آتش فشاں کی طرح ایک اسلامی ملک کے قلب وجگر میں پھوٹ پڑا، یہ آفت یا قیامت جو سامنے آئی، وہ کچھ رضائے الٰہی کے لئے، یا شیطان کی سرکوبی وتذلیل کے جذبہ سے نہیں تھی، اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ اخوت اور امن واطمینان کا دور دورہ ہو، نیکیاں فروغ پائیں اور برائیاں ختم ہوں، یہ سب اس لئے ہوا کہ اس قوم کی بڑی جمیعت فرنگی شیشہ گروں، اور قومیت کے انتہا پسند پرستاروں کے ہاتھ میں کھیلنے لگی اور وہ ایک خطرناک سازش کا شکار ہو گئی۔

اسلام کی ساکھ کو زبردست نقصان

اس انسانی قتل عام، خون مسلم کی ارزانی، اور جانی ومالی نقصان پر بھی جتنے آنسو بہائے جائیں کم ہے، لیکن ان واقعات کا سب سے زیادہ شرمناک پہلو یہ ہے کہ اس سے مخالفین کو اسلام کی ناکامی کے ثبوت کے لئے ایک دلیل ہاتھ آئی، اور انھوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اسلام میں رابطہ بننے، اور مختلف قوموں، اور نسلوں کو (جن کی زبانیں اور رنگ ونسل مختلف ہیں) متحد کرنے کی صلاحیت نہیں

ہے، نیز یہ کہ اسلامی عقیدہ پر کسی معاشرے، اور کسی ریاست (STATE) کے قائم ہونے، اور اگر قائم ہو جائے تو باقی رہنے کا امکان نہیں، یہ وہ معنوی خسارہ ہے، جس کا کوئی خسارہ مقابلہ نہیں کر سکتا، آپ ہندوستان کے عظیم ترین تجارتی مرکز میں رہتے ہیں، جانتے ہیں کہ ایک تاجر کے یہاں نفع نقصان، بازار کے اتار چڑھاؤ، اور تجارتی مدو جزر کی کوئی اہمیت نہیں، اسکا اصل سرمایہ اس کی ساکھ اور اس کا اعتبار ہے، اسی وجہ سے کسی فرم کا ٹریڈ مارک بڑی اہمیت رکھتا ہے اور وہ ہزاروں، لاکھوں روپیہ میں خریدا جاتا ہے، حالیہ واقعات نے اسلام کی ساکھ کو بڑا نقصان پہونچایا اور اسلام کی تبلیغ کرنے والوں اور اس کو دنیا کی سب سے بڑی قوت جامعہ (UNIT-ING FORME) کے طور پر پیش کرنے والوں کے لئے بڑی مشکلات پیدا کر دی، اور ایک طرح سے پچھلی تاریخ کو بھی جس پر ہر مسلمان کو فخر ہے، بہت سے لوگوں کی نگاہ میں مشکوک بنا دیا، جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام نے عرب و عجم، گورے کالے، قریشی و حبشی، ایشیائی و افریقی، فقیر و غنی، اور محمود و ایاز کو ایک صف میں کھڑا کر دیا تھا، ہمارے نزدیک تو یہ تاریخ ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے، اور ساری دنیا نے ہمیشہ اسلام کی اس کامیابی پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا ہے، لیکن اب ہم کس منہ سے کہیں کہ اسلام اپنے پیروؤں میں ایسی وحدت، اور الفت پیدا کرتا ہے کہ وہ زبان اور رنگ کے اختلاف کو بالکل بھول جاتے ہیں، اور جسم واحد اور ملت واحدہ بن جاتے ہیں، یہ وہ افسوسناک پہلو ہے جس پر افسوس کرنے کے لئے ہمارے پاس الفاظ نہیں، اور جس پر خون کے آنسو رونا بھی کافی نہیں۔

بیماری کے جراثیم

ہم نے مانا کہ جو کچھ ہوا وہ سیاسی شاطروں کا ایک کھیل تھا، اور چند فتنہ پرداز، اور ناخدا ترس جماعتوں کی بازی گری، جس کا یہ سادہ لوح، اور سادہ دل قوم شکار ہو گئی، لیکن ایک پوری کی پوری قوم اور ملک کا ان سیاسی بازی گروں کے مقاصد کا اس آسانی سے آلہ کار بن جانا، اور اس سیلاب میں تنکے کی طرح بہہ جانا، اور توحید وشرک، اسلام وجاہلیت، تعمیر وتخریب، اور عقل وجذباتیت میں فرق نہ کرنا محض اتفاقی واقعہ، اور قائدین کی ذہانت وصلاحیت، اور عوام کی سادگی اور جہالت کا نتیجہ نہیں، کسی ملک اور کسی دور میں کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتی، جب تک قوم میں اسکے قبول کرنے کی صلاحیت، اور آمادگی نہ پائی جاتی ہو، اور اس کی بنیادیں اس کے قلب ودماغ میں پہلے سے موجود نہ ہوں، اگر قوم اس تحریک کیلئے پہلے سے تیار نہیں ہوتی، تو یہ آندھی اٹھتی ہے اور نکل جاتی ہے، سیلاب آتا ہے اور گذر جاتا ہے، اعصابی دورہ (ہسٹیریا) بھی ایک عارضی کیفیت ہوتی ہے، وہ زیادہ قائم نہیں رہتی، لیکن ان حالات وواقعات کا اتنے دن تک قائم رہنا، اور ان کی عمومیت ووسعت بتاتی ہے کہ ملک میں پہلے سے اس بیماری کے جراثیم موجود تھے، اور اس قوم کی اسلامی تعلیم وتربیت میں ضرور کچھ ایسی خامیاں رہ گئی ہیں جن کی وجہ سے روز بد دیکھنا پڑا۔

صحیح دینی شعور کی کمی

میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی وجہ اس قوم میں صحیح دینی شعور کی کمی تھی، قلب کے ساتھ دماغ کا مومن ہونا بھی ضروری ہے، تنہا اسلام کی محبت کافی نہیں، اسکے ساتھ خلاف اسلام فلسفوں، اور دعوتوں کی نفرت بھی لازمی ہے،

بلکہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر طاغوت اور شیطان، اور جاہلیت کے داعیوں سے بغاوت اور بیزاری کا ایمان باللہ سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَیُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی پس جو کوئی سرکش کا انکار کر کے، اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

خود کلمہ میں نفی کو اثبات پر مقدم رکھا گیا ہے، اور "الا اللہ" سے پہلے "لا الہ" کہلوا گیا ہے، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی، اور ایک مسلمان اس وقت تک حقیقی ایمان کا ذائقہ شناس نہیں ہو سکتا، جب تک اس کو کفر اور مظاہر کفر سے وحشت اور دہشت نہ پیدا ہو، صحیح بخاری میں ہے۔

ثلاث من کن فیه وجد حلاوة الایمان ان یکون الله ورسوله احب الیه مما سواهما ، وان یحب المرء لا یحبه الا الله وان یکره ان یعود فی الکفر بعد إذ ا نقذه الله منه کما یکره ان یلقی فی النار (صحیحین)

تین باتیں جس میں ہوں گی، وہ ایمان کی حلاوت محسوس کریگا ایک یہ کہ اللہ اور رسول اسکو ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں، دوسرے یہ کہ کسی انسان سے اسکو محض اللہ کے لئے محبت ہو، تیسرے یہ کہ اس کو کفر کی طرف واپس جانے کے تصور سے جبکہ اللہ نے اسکو اس سے نجات دے دی، ایسی وحشت اور نفرت ہو جیسے آگ میں ڈالے جانے کے خیال سے ہوتی ہے۔

جاہلیت کی صحیح معرفت ضروری ہے

مسلمانوں کو اسلام کے خلاف کرنے اور دشمنوں کا آلہ کار بننے سے ایسی وحشت ہونی چاہئے کہ اگر خواب میں بھی کوئی واقعہ ایسا دیکھے تو اس کے منہ سے چیخ نکل جائے اور وہ توبہ اور استغفار کرے، جاہلیت سے صرف جذباتی نفرت ہی کافی نہیں، مسلمان کے لئے جاہلیت کی صحیح معرفت ضروری ہے، وہ کبھی اس کے بارے میں دھوکہ نہ کھائے اگر جاہلیت غلاف کعبہ اوڑھ کر، اور قرآن مجید ہاتھ میں لے کر آئے، جب بھی وہ لاحول پڑھے، اور اس سے پناہ مانگے، وہ کسی بھیس میں اسکے سامنے آئے تو وہ اسکو پہچان جائے، اور اسکو مخاطب کر کے کہے

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدرت رامی شناسم

شیطان کی حکمت عملی

شیطان کی حکمت عملی، اور جنگی سیاست (STRATEGY) یہ ہے کہ وہ مسلمان میں جو کمزور پہلو دیکھتا ہے، وہ اسی طرح سے حملہ آور ہوتا ہے، وہ ہر طبقہ اور ہر فرد پر ایک ہی طریقہ، اور ایک ہی ہتھیار نہیں آزماتا، وہ دینداروں اور عابدوں کو عوام کے درجہ کے فسق وفجور کی ترغیب نہیں دیتا، کہ اس میں اسکو کامیابی کی امید نہیں وہ انکو ریا، تکبر، خود پسندی، حب جاہ، اور حسد جیسے امراض میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے قومی سربلندی، حکومت واقتدار کی ہوس، اور دوسروں کے بجائے اپنے ملک کے وسائل کا خود استعمال کرنا، اور اپنے اوپر خود حکومت کرنا، اور اپنی زبان اور کلچر کو فروغ دینا ہر قیمت پر اپنے ملک کا بول بالا کرنا، یہ وہ خوشنما اور دل فریب مقاصد، اور یہ وہ دلکش اور شیریں خواب ہیں، جن کے بڑے بڑے اہل علم، اور بعض

اوقات بڑے بڑے دیندار بھی فریفتہ ہو جاتے ہیں۔

عربوں کی فریب خوردگی، اور اسکی سزا

شیطان نے عربوں کو یہی سبز باغ دکھایا، ان سے کہا کہ قرآن مجید تمہاری زبان میں نازل ہوا، اللہ کا رسول تم میں مبعوث ہوا، خانۂ کعبہ، اور تمام عالم کا قبلہ تمہاری سرزمین میں ہے، حرم، اور رسول کی آخری آرامگاہ تمہارے ملک میں ہے، تم قرآن حدیث اور اسلام کے اسرار و حقائق کو جیسا سمجھ سکتے ہو، دنیا میں کون سی قوم ایسا سمجھ سکتی ہے، پھر اس سب کے باوجود خلافت کا مرکز تم سے ہزاروں میل دُور، سمندر پار قسطنطنیہ میں ہو، اور ترک تم پر حکومت کریں، جن کی نہ زبان عربی، اور نہ نسل عربی، یہ منطق ایسی تھی کہ بہت سے عربوں نے جن کو اقتدار کی تمنا تھی، اور وہ عرصہ سے ایک عرب امپائر کا خواب دیکھ رہے تھے، نیز ان کو ترکوں سے بہت سی شکایتیں تھیں، اور ان کے احساس برتری اور حاکمانہ رویے سے نالاں تھے، ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا، اور وہ برطانوی شاطروں کے مقاصد کا آلۂ کار بن گئے شریف مکہ نے مرکز اسلام میں بیٹھ کر اور شام و عراق کے عربوں نے اپنے اپنے ملکوں میں اتحادیوں کا ساتھ دیا، اور ان کے منصوبہ کی تکمیل میں معاون بن گئے، ترکوں کو شکست ہوئی، خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا، ملت اسلامیہ کا شیرازہ منتشر ہو گیا، وہ حصار جس کے اندر مسلمان عزت کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے، منہدم ہو گیا، مغربی طاقتوں کو اب کسی کا ڈر نہیں رہا، اور مسلمانوں کی طرف سے کوئی انگلی ہلانے والا بھی نہیں رہا، اس کے نتیجہ میں فلسطین یہودیوں کا قومی وطن (-OME NATIONAL) بنا اسرائیل کی سلطنت قائم ہوئی جو عربوں کی چھاتی پر کھونٹے

کی طرح قائم ہے، بیت المقدس یہودیوں کی قبضہ میں چلا گیا، یہ سب اس عصیبت جاہلیہ کا کرشمہ ہے، جس کا عرب شکار ہوئے، اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

قرآن وحدیث میں عصیبت جاہلیہ کی مذمت

قرآن وحدیث کا ایک ادنیٰ طالب علم جانتا ہے، کہ کسی نسل، خون، رنگ، زبان، تہذیب کی بناء پر اندھا دھند حمایت اور جتھا بندی، اس کی بنیاد پر محبت ونفرت، تعلق اور قطع تعلق، صلح وجنگ، وہ جاہلی عصبیت ہے، جسکی مذمت سے قرآن وحدیث بھرے ہوئے ہیں، قرآن شریف میں ہے۔

اِذجعلَ الّذِینَ کفرُوا فِی قلُوبِھِمُ الحَمِیَّۃَ حَمِیۃالجَاھِلِیۃِ(سورۃالفتح)

جب کافروں نے اپنے دلوں میں ضد کی، اور ضد بھی جاہلیت کی۔

اور صحیح حدیث میں آیا ہے۔

لیس منامن دعاالی عصبیۃ ولیس منا من قاتل علی عصبیۃ ولیس منا من مات علی عصبیۃ،(ابو داؤد) وہ شخص جماعت مسلمین میں سے نہیں جو کسی عصبیت کی دعوت دے، وہ شخص جماعت مسلمین میں سے نہیں ہے، جو کسی عصبیت کی بنیاد پر جنگ کرے، وہ شخص جماعت مسلمین میں سے نہیں ہے، جس کی موت عصبیت پر ہو۔

ایک مرتبہ ایک مہاجر اور ایک انصاری نے اپنی اپنی قوم کی دہائی دی، اور مہاجر نے یا للمھا جرین(اے مہاجرو)اور انصاری نے یا للأ نصار

(اے انصاریو) کا نعرہ لگایا آپؐ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا "دعوھا انھا منتنة" (ان جاہلی نعروں کو چھوڑو، یہ گندی اور بدبودار چیزیں ہیں) رسول ﷺ کو ان جاہلی نسبتوں، اور انکے نام پر اپیل کرنے، اور انکی دہائی دینے سے ایسی نفرت تھی کہ آپ نے ان سے کام لینے والوں کی ہر طرح سے ہمت شکنی، اور توہین و تذلیل کی ہدایت فرمائی، اور باوجود اس کے کہ آپ کسی بڑے سے بڑے دشمن کے لئے بھی کوئی درشت، اور نا ملائم لفظ استعمال کرنا پسند نہیں کرتے تھے، آپ نے سخت ترین الفاظ استعمال کرنے کی اجازت دی اور اس میں مطلق رورعایت کرنے، اور اشارہ، کنایہ سے کام لینے سے بھی منع فرمایا۔

زبان باعثِ رحمت، یا باعثِ زحمت؟

در حقیقت زبانوں کا اختلاف بالکل قدرتی، اور فطری ہے، بلکہ اسکو قرآن مجید میں خدا کی ایک نعمت، اور قدرت کی ایک نشانی کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اوپر یہ آیت گذر چکی ہے:۔

وَمِنْ اٰیَاتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ اِنَّ فِیْ ذَالِكَ لَاٰیَاتٍ لِّلْعَالَمِیْنَ. (سورۃ الروم) اور اسی کے نشانات میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا، اور تمہاری زبانوں، اور رنگوں کا جدا جدا ہونا، اہل دانش کے لئے اس میں نشانیاں ہیں۔

لیکن جب اس زبان کے معاملہ میں غلو و مبالغہ کیا جاتا ہے، اور اس کی تقدیس شروع ہو جاتی ہے، اس کو معبود و مسجود بنا لیا جاتا ہے، تو وہ رحمت کے بجائے عذاب، تعمیر کا ذریعہ بننے کے بجائے تخریب کا ذریعہ بن جاتی ہے، اور اس کے استعمال

پر انسان اس طرح بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں، جیسے پہلے کبھی دیویوں اور استھانوں پر انسانوں کی قربانی کی جاتی تھی، زبان اس لئے ہے کہ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑے، اس سے نکلا ہوا ایک لفظ مردوں میں جان ڈال دے، اور محبت کے پھول برسائے، بیگانوں کو یگانہ، دور کو نزدیک اور دشمن کو دوست بنائے، اس کا کام نفرت پیدا کرنا، انگارے برسانا، بھائی کو بھائی سے جُدا کرنا، نفرت کا زہر پھیلانا نہیں، اگر زبان سے یہی کام لیا جانے لگے تو اس سے گونگا اور بے زبان ہونا ہزار درجہ بہتر ہے، اور انسان اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ اگر دنیا کی سب قومیں، اور قوموں کے تمام افراد گونگے پیدا ہوتے اور اشاروں سے باتیں کرتے تو شاید انسانیت کے حق میں یہ اس سے بہتر ہوتا کہ اپنی اپنی زبان کے غرور اور عشق میں بے گناہ انسانوں کا خون بہایا جائے، بے زبان عورتوں اور معصوم بچوں کو خاک خون میں لٹایا جائے، اور ملک کو تباہی و بربادی کے عمیق غار میں ڈھکیل دیا جائے۔

انسان زبان سے زیادہ قیمتی ہے

زبانیں انسانوں کے لئے بنی ہیں، انسان زبانوں کے لئے نہیں بنے ہیں، ایک انسانی جان کی قیمت زبان وادب کے پورے ذخیرے، ہزاروں ادبی شہکاروں، شعر و شاعری کے ہزاروں دفتروں، اور فصاحت وبلاغت کے دریاؤں اور سمندروں سے زیادہ ہے، زبانیں پیدا ہوئیں، اور مٹیں، سکڑیں اور پھیلیں، ان میں ہزاروں تبدیلیاں ہوئیں، لیکن انسان سدا سے انسان ہے، اور ہمیشہ انسان رہیگا۔

مسلمانوں کے دینی عمل اور شعور میں تناسب نہیں

ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم نے دینی جذبہ، عبادت کا ذوق، اور

دینی معلومات کی ترقی کی جتنی کوشش کی، اتنا شعور صحیح اور بیدار کرنے کی کوشش نہیں کی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بہت سے اسلامی ملکوں میں عمل اور شعور میں وہ تناسب نہیں جو ہونا چاہیئے، ایک آدمی آپ کو بڑا دیندار، عابد و تہجد گزار ملے گا، لیکن اس کا دینی شعور بالکل ناپختہ اور طفلانہ ہوگا، بعض مرتبہ وہ دین کی بنیادی تقاضوں سے ناواقف نظر آئیگا، اور وہ ایسی غلطی کر بیٹھے گا، جو کسی صاحب شعور مسلمان سے حد درجہ مستبعد ہے، یہ ممکن ہے کہ وہ جاہلیت اور اسلام کا بالکل فرق نہ سمجھتا ہو، اور وہ نہایت آسانی کے ساتھ کسی جاہلی دعوت اور کسی عیار و شاطر کا شکار ہو جائے اور وہ اس کو اپنے مذموم مقاصد، اور اسلام کی بیخ کنی کے لئے استعمال کرے، ہو سکتا ہے کہ وہ نیک نیتی اور سادگی کے ساتھ اس کام کو انجام دے، اور اس عمل میں اور دین کے تقاضوں میں اسکو کوئی تضاد محسوس نہ ہو، تاریخ اسلام میں اسکی بہت سی مثالیں ملیں گی، اور حالیہ واقعات اس کا بہترین نمونہ ہیں، جن میں ان مسلمانوں نے جو اپنی دینی جذبہ میں ہندستان کی دوسری آبادی کے مقابلے میں زیادہ نیک نام تھے جن کو اللہ تعالےٰ نے اثر پزیری، اور رقت کا حصہ وافر عطا فرمایا، جو دین اور شعائر دین سے والہانہ محبت رکھتے تھے، جو وعظ کی مجالس اور دینی اجتماعات میں لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوتے تھے، اور پروانوں کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے، بہت سے مقامات میں سیاسی شاطروں کی چالاکی کا شکار ہو گئے، اور اس خونی کھیل میں شریک ہو گئے، یا کم سے کم اس فتنہ کا اس جرأت سے مقابلہ نہیں کر سکے جس جرأت سے ایک صاحب شعور قوم کو کرنا چاہیئے تھا۔

صحابہؓ کرام کی جامع تربیت

لیکن صحابہ کرام کا معاملہ اس سے بلکل الگ تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی مکمل اور جامع تربیت فرمائی تھی، جہاں ان کے اندر عمل کا وہ جذبہ پیدا کیا تھا، جس کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں ناپید ہیں، وہاں ان کے اندر ایک ایسا شعور پیدا کر دیا گیا تھا، کہ وہ صحیح اور غلط، ظلم وعدل، اور جاہلیت واسلام میں ہر وقت امتیاز کر سکتے تھے، ان کا ذہن اتنا سلیم اور مستقیم بنادیا گیا تھا، کہ کوئی ٹیڑھی چیز اس میں گھس نہیں سکتی تھی، جیسے کسی نلکی میں کوئی ٹیڑھی چیز ٹیرھی ہو کر داخل نہیں ہو سکتی، اسی طرح ان کا ذہن سلیم کسی کج چیز کو قبول نہیں کرتا تھا۔

میں اس کی ایک بہت واضح اور طاقتور مثال پیش کرتا ہوں، آپ کو معلوم ہو کہ صحابہ کرام کا تعلق ذات نبویؐ سے کیا، اور کیسا تھا؟ مختصر یہ ہے کہ توحید کے دائرہ میں رہتے ہوئے کسی انسان کو کسی انسان سے جتنی عقیدت اور تعلق ہو سکتا ہے، وہ صحابہ کرام کو آپ ﷺ کی ذات مبارک سے تھا، اور جس کو فارسی کے کسی شاعر نے اس الہامی مصرعہ میں بیان کیا ہے کہ :-

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آپ کے مبارک لبوں، اور زبان سے جو چیز نکلتی ہے اس کا منبع اور سر چشمہ وحی اور ہدایت الٰہی ہے اور آپ کوئی بات اپنے نفس کے تقاضہ سے نہیں فرماتے تھے، انکا ایمان تھا کہ :-

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں، یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے، جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے۔

ان خصوصیات کو سامنے رکھ کر اب یہ سنئے، کہ آپ نے ایک مرتبہ صحابہ کرام کی مجلس میں فرمایا "انصر اخاك ظالماً او مظلوماً" (اپنے بھائی کی مدد کرو

ظالم ہونے کی حالت میں بھی اور مظلوم ہونے کی حالت میں بھی) اس عقیدت، اور عشق کا تقاضہ جس کا اوپر ذکر ہوا، یہ تھا کہ وہ اس ارشاد کو بے چون وچرا مان لیتے، اور آنکھ بند کر کے اس پر عمل کرتے، ایسے واضح الفاظ میں فرمادینے، اور اہل زبان ہونے کے بعد ان کے کچھ دریافت کرنے، اور وضاحت چاہنے کا کوئی موقعہ نہ تھا، لیکن جس انداز پر انکی اسوقت تک تربیت ہوئی تھی، ظلم کی جو مذمت وہ اس زبان مبارک سے ابھی تک سنتے آئے تھے، اور ظالم کا ساتھ نہ دینے کی انکو جس طرح تلقین کی گئی تھی، انکو اس میں اور آج کے ارشاد میں ایک کھلا ہوا تضاد محسوس ہوا، وہ خاموش نہ رہ سکے انھوں نے ادب سے عرض کیا۔"یا رسول اللہ ھٰذا انصرته مظلوما فکیف انصره ظالما؟" (اے خدا کے پیغمبر مظلوم ہونے کی حالت میں تو مدد کی جائے ظالم ہونے کی حالت میں کیسے مدد کی جاسکتی ہے) ؟آپ نے قطعاً اس پر اپنے کسی تکدر کا اظہار نہیں فرمایا، اور نہ ان پر سرزنش کی، بلکہ نہایت بشاشت کے ساتھ اپنے اس فرمان کی تفصیل، اور اپنے اس ارشاد کی تشریح فرمائی، فرمایا ہاں! ظالم کی بھی مدد کی جاسکتی ہے، اور کرنا چاہئے، مگر اس کا طریقہ کیا ہے؟ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ لو، اس کو ظلم نہ کرنے دو، اب آنکھوں پر سے پردہ اٹھ گیا تھا، اور جو گرہ پڑگئی تھی، کھل گئی تھی۔

کسی مخلوق کی ایسی اطاعت جائز نہیں جس میں خالق کی نافرمانی ہوتی ہو

اس شعور کی ایک دوسری مثال سنئے، رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی عبداللہ بن حذافہ کی سرکردگی میں مسلمانوں کا ایک دستہ بھیجا، جس کو سیرت وتاریخ

کی اصطلاح میں (سریہ) کہتے ہیں، آپ نے ساتھ جانے والوں کو حکم دیا کہ اپنے امیر کی پوری اطاعت کرنا، ایک موقعہ پر امیر نے کسی بات کا حکم دیا، اسکی تعمیل میں ذرا تاخیر ہوئی، انھوں نے اس پر غضبناک ہو کر لکڑیوں کے جمع کرنے کا حکم دیا، جب لکڑیاں جمع ہو گئیں، تو انھوں نے اس کو آگ دکھائی، اور ایک الاؤ روشن ہو گیا انھوں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ اس میں کود پڑو، انھوں نے انکار کر دیا، انھوں نے کہا کہ کیا تم کو رسول اللہ ﷺ نے میری بات ماننے کا حکم نہیں دیا تھا؟ انھوں نے کہا کہ بیشک دیا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا، ہم نے اسی آگ سے بچنے کے لیے اسلام کو قبول کیا، اور آپ کا دامن تھاما ہے، اب ہم اس میں کیسے پھاند پڑیں؟ بات ختم ہو گئی، یہ فوج جب مدینہ پہونچی تو امیر لشکر نے آپ کی عدالت میں یہ مقدمہ پیش کیا، اور اپنے ساتھیوں کی شکایت کی، آپ نے ان کے عمل کی تصویب فرمائی اور فرمایا کہ اگر یہ اس آگ میں گھس جاتے تو پھر کبھی یہ نکل نہیں سکتے تھے، آپ نے فرمایا کہ "انما الطاعة فی المعروف" (اطاعت نیک کام ہی میں جائز ہے) آپ نے امت کو یہ زریں اصول دیا، جو اسکی ہر دور میں رہنمائی کرتا رہا ہے، اور جس نے بڑے نازک موقعوں پر جابر اور مستبد بادشاہوں کی اندھا دھند اطاعت، اور گمراہ کن قائدوں اور رہنماؤں کی غیر مشروط پیروی، اور رفاقت سے روکا ہے، وہ اصول یہ تھا کہ "لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق" (کسی مخلوق کی ایسی اطاعت جائز نہیں، جس میں خالق، (خدا) کی نافرمانی ہوتی ہو، اور اسکا کوئی حکم ٹوٹتا ہو، تاریخ اسلام میں مسلمانوں نے بڑے بڑے نازک موقعوں پر اپنے دماغی توازن، اور اپنی قوت تمیز کو برقرار رکھا، اور وہ ہر فتنہ کی آگ کا ایندھن نہیں بن سکے، ان میں ایسے ایسے جری اور ذہن مصلح اور عالم پیدا ہوئے، جنھوں نے وقت

کے دھارے میں بہنے سے انکار کر دیا، اور اس اصول کے ماننے سے انکار کیا کہ ؎

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

وہ واقعات جن کی تاریخ کربلا کے میدان سے شروع ہوتی ہے، اور کسی نہ کسی شکل میں اس وقت بھی اس کی جھلک نظر آسکتی ہے، یہ سب اسی زریں اصول کا نتیجہ تھا کہ "لا طاعة لمخلوقٍ في معصية الخالق"

زخم کا مرہم

عزیز نوجوانو! زخم بہت گہرا ہے، لیکن کوئی زخم نہیں جس کا مرہم نہ ہو، اور جو مندمل نہ ہو سکے، عقل اور عزم شرط ہے، کھوئی ہوئی دولت کی بازیافت، اور بچھے ہوئے گلے، اور کھوئے ہوئے ریوڑ کو گھر لانے کی کوشش میں لگ جاؤ، زبانوں سے اگر زہر پھیلایا جاسکتا ہے، تو تریاق بھی مہیا کیا جاسکتا ہے، بلکہ یہ کام پہلے کام سے زیادہ فطری اور آسان ہے کہ زبان کے لیے بھی فطرت کا منشاء اور خدا کا حکم یہی ہے کہ ؎

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

کسی زبان کا اسلامی روح سے محروم رہنا، اور جاہلی تصورات اور عقائد کا غلام ہونا بہت بڑا خطرہ ہے

یاد رکھو! کسی زبان، اور لٹریچر کا اسلامی روح، اسلامی تخیلات اور تعبیرات، اسلامی حقائق، اور اصطلاحات سے ناآشنا ہونا، اور دینی علوم کے خزانے سے محروم رہنا بہت بڑا خطرہ ہے، زبان کا دل ودماغ، اور روح وضمیر سے قریبی

تعلق ہے جس زبان پر غیر اسلامی فکر، اور غیر اسلامی ادب کا تسلط ہو، جس زبان پر غیر اسلامی چھاپ ہو، جس زبان کے بولنے والوں کے سوچنے کا طریقہ، اور اپنے مطالب کے ادا کرنے کا انداز دوسرا ہو، جس زبان کے استعارات وتشبیہات، محاورات وتلمیحات کسی مشرکانہ تہذیب یا فلسفہ سے ماخوذ ہوں، اور وہی شخصیتیں، وہی کردار، وہی ادیب وشاعر، اسی کے مصلح اور داعی، اسی کے فلسفی اور مفکر، اسکے لئے قابل تقلید اور آئیڈیل ہوں، اسکو اسلامی شخصیتوں سے اور جس فضا میں اسلام پھلا پھولا اس سے بیگانگی ہو، وہ قوم ہمیشہ ذہنی اور تہذیبی ارتداد کے خطرہ میں مبتلا رہے گی، اور اس کی جاہلی عصبیت کو ہر وقت بیدار کیا جا سکے گا، نسل پرستی اور زبان پرستی کا ایک نعرہ اسکو مجنون، اور از خود رفتہ بنا دینے کے لئے کافی ہے، حالیہ واقعات میں ہم نے اسکا نمونہ دیکھ لیا، اب آپ کا فرض ہے کہ آپ اس خطرہ کا سدِباب کریں، ان زبانوں میں مہارت پیدا کریں، انکی زبان وادب کو نہ صرف اسلامیت سے مالا مال کردیں، بلکہ انکی روح اور ضمیر کو مسلمان بنائیں، اور انکا مزاج اسلامی بنانے کی کوشش کریں، ان شخصیتوں کا رعب، اور انکا ذہنی تفوق دور کرنے کی کوشش کریں، جو انکو اسلام سے دور اور مشرکانہ تخیلات سے قریب کرتی ہیں، امیں اسلام اور جاہلیت کے درمیان امتیاز کرتے، اول الذکر سے محبت، اور آخر الذکر سے نفرت کرنے کی ایسی صلاحیت پیدا کردیں کہ آئندہ کوئی جاہلی نعرہ، اور زبان ونسل، ملک ووطن کی دہائی ان کو اسلام اور مسلمانوں سے کاٹ نہ سکے۔

ایک نئے دور کا آغاز ہوگا

اگر توفیق الٰہی سے آپ نے یہ فرض انجام دیا تو ہماری سابقہ غلطی جس کے

نتیجہ میں یہ ناشدنی واقعات پیش آئے، وہ ایک بڑی کامیابی کا پیش خیمہ بن جائے گی اور ملت اسلامیہ کے اس قیمتی خاندان کو جس میں ہزاروں کی تعداد میں علماء اور سیکڑوں کی تعداد میں اولیاء پیدا ہوئے، اور جنکے اندر اب بھی اسلام سے محبت اور دین کے لئے حمیت پائی جاتی ہے، اور جن کے اسلاف نے ماضی قریب میں تیرہویں صدی کے مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہید کے ساتھ وہ جانبازیاں، اور سر فروشیاں دکھائیں، جنھوں نے ڈاکٹر ہنٹر جیسے نقادوں کو بھی انگشت بدنداں بنادیا، ایک جدید استحکام حاصل ہوگا، اور ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔

وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ بِنَصْرِ اللّٰهِ يَنْصُرُ مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ

اور اس روز مومن خوش ہو جائیں گے (خدا کی مدد سے) وہ جسے چاہتا ہے، مدد دیتا ہے، اور وہ غالب (اور) مہربان ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمين

☆☆☆☆

ترکی کی مجاہد ملتِ اسلامی

۱۲/ اگست ۱۹۸۹ء تا ۱۸/ اگست کے دوران ترکی کے دارالسلطنت استنبول کے ایک نواحی محلّہ کی ایک وسیع و عریض مسجد ومدرسہ میں کی گئی ایک شاہکار تقریر۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترکی کی مجاہد ملتِ اسلامی

میرے دینی بھائیو اور دوستو!

میرے لئے بڑی مسرت اور عزت کی بات ہے کہ میں فاتحین اور شہداء کے شہر میں ہوں، حرمین شریفین کی زیارت کے بعد میری سب سے بڑی آرزو شام وترکی کو دیکھنے کی تھی، اللہ تعالیٰ نے کئی بار مجھے اس کا موقعہ عطا فرمایا، اس ملک کے لئے سب سے بڑے شرف کی بات یہ ہے کہ اسے میزبان رسولؐ (اور عصر حاضر کے عظیم سیرت نگار نبویؐ علامہ شبلی نعمانی کے الفاظ میں "میزبان عالم کے میزبان" سیدنا ابو ایوب انصاری ـــــ رضی اللہ عنہ کی آرام گاہ ہونے کا فخر حاصل ہے، یہ میزبانی اتنا بڑا اشرف تھا کہ یہی تنہا ان کی عزت و جلالت شان کے لئے کافی ہو سکتا تھا، اس کے بعد صرف فرائض اور واجبات کی ادائیگی کافی ہوتی، لیکن آپ کی ہمت بلند نے (جو صحبت نبویؐ اور قرب خاص کا ثمرہ تھا) اس پر قناعت نہیں کی، آپ عہد نبویؐ کے تقریباً تمام اہم غزوات اور خلفائے راشدین کے زمانہ کی اہم بدری اور

بعض بحری جنگوں میں شریک ہوئے، اور یہ روح جہاد مرتے دم تک باقی رہی، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب قسطنطنیہ فتح کرنے کے لئے مہم بھیجی گئی، تو آپ اس مہم میں شریک ہوئے، اس وقت آپ کی عمر شریف پچھتر سال کے قریب تھی، اس وقت قسطنطنیہ کے فتح کی نوبت نہیں آئی، آپ اسی حالت حصار میں بیمار ہوئے، مسلمانوں کے لشکر کی فرودگاہ میں جب آپ کے انتقال کا وقت قریب آیا، تو امیر جیش (یزید) عیادت کے لئے آئے، اور آپ سے دریافت کیا کہ ما حاجتك ؟ (آپ کی کیا خواہش ہے ؟) آپ نے جواب میں فرمایا:

حاجتی اذا انا مت فارکب ثم اسع فی ارض العدو، وما وجدت مساغا فادفنی ثم ارجع۔ میرے دل کا تقاضہ اور خواہش یہ ہے کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو مجھے گھوڑے پر سوار کر کے لے جایا جائے اور دشمن کی سرزمین میں جتنی دور لے جایا جا سکے لے جایا جائے، پھر اگر اس کے آگے جانے کا موقعہ نہ ہو تو مجھے وہیں دفن کر دیا جائے، اور واپس آجایا جائے۔

چنانچہ آپ کو موجودہ شہر قسطنطنیہ کی فصیل کے سامنے دفن کر دیا گیا۔ یہ بات پورے ملک کی آبادی کے لئے عزت و افتخار کی بات ہے کہ اس کو میزبان رسول ﷺ کی آرام گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے، لیکن اسی کے ساتھ بڑی ذمہ داری اور امتحان کی بھی، جس شہر کے دروازہ پر میزبان رسول ﷺ کی قبر مبارک ہو، اس شہر کے اندر کفر و الحاد اور فسق و فجور کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔

اس شہر قسطنطنیہ (اور موجودہ عرف و رواج کے مطابق استنبول) کے لئے دوسرے شرف و امتیاز کی بات یہ ہے کہ تنہا اس شہر و دار السلطنت کے لئے آنحضرت ﷺ نے نام لے کر فتح کی پیشین گوئی فرمائی اور اس کی بشارت دی، اور اس کے امیر

لشکر کی تعریف کی۔ حدیث ہے۔لتفتحن القسطنطنية، فنعم الامير اميرها ولنعم الجيش ذالك الجيش۔تم ضرور قسطنطنیہ فتح کرو گے، اس مہم کا امیر بہترین امیر ہے، اور یہ لشکر بہترین لشکر۔

قسطنطنیہ عہد نبویؐ میں اور اس کے عرصہ بعد تک قیاصرہ کی عظیم الشان سلطنت رومۃ الکبری (THE GREAT ROMAN EMPIRE) کی جانشین مشرقی شاخ بازنطینیہ (BYZANTINE EMPIRE) کا دارالسلطنت تھا، جس کی مملکت اور نوآبادیات (ماتحت صوبوں) میں شام، فلسطین، مصر وحبشہ وغیرہ مشرقی ممالک بھی تھے، اسی کے حکمراں شہنشاہ، ہرقل اول (HERA-CLIUS THE FIRST) کے نام وہ فرمان نبویؐ گیا تھا، اور اس کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی، جس کا ذکر احادیث وسیر کی مستند کتابوں میں آتا ہے، اور جس پر اس کا ابوسفیانؓ کے ساتھ (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) مفصل مکالمہ ہوا، اس نے اپنی معلومات کیلئے کچھ سوالات کئے اور ابوسفیان نے ان کا صحیح جواب دیا، صحیح بخاری کی کتاب الوحی میں اس کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔

اسی بازنطینی سلطنت کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں جنگیں ہوئی، جن کے نتیجہ میں پورا ملک شام اور مصر وحبشہ فتح ہو کر اسلامی سلطنت اور خلافت راشدہ کے قلمرو میں شامل ہوئے، بعد کی صدیوں میں بازنطینہ کی وسعت وقوت بہت گھٹ گئی، لیکن اس حالت میں بھی اس کے دارالسلطنت قسطنطنیہ (استنبول) کا وجود بجائے خود نہایت اہم تھا، اس سے مسیحی یورپ اور ایشیا، بلکہ پوری مسیحی دنیا کی عزت وآبرو قائم اور اس کو اس کے دینی وسیاسی مرکز ہونے کی حیثیت حاصل تھی، مسیحیت کے قصر سلطنت کی یہ پہلی اور آخری اینٹ اپنی جگہ قائم

تھی، عربوں اور مسلمان فاتحین نے گیارہ بار اس کو فتح کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بے نظیر اور قابل صد فخر و موجب ہزار شکر سعادت و عزت جواں سال عثمانی سلطان محمد الثانی الفاتح ابن مراد الثانی (۸۳۳ھ-۸۸۶ھ ۱۴۲۹ء-۱۴۸۱ء) کے حصہ میں رکھی تھی، انتظامی، سیاسی و حربی مصالح و ضروریات کے علاوہ جن کا تقاضہ تھا کہ ایشیائے کوچک اور یورپ میں نوزائیدہ عثمانی سلطنت کے بقا و استحکام کے لئے قسطنطنیہ کو عثمانی سلطنت کے زیر نگین لایا جائے کہ وہ اس کا فوجی اور سیاسی لحاظ سے موزوں ترین اور ضروری حد تک دارالسلطنت بن سکتا ہے، بلکہ نپولین کے بقول "اگر دنیا کبھی ایک متحدہ سلطنت کی حیثیت اختیار کرلے گی، تو قسطنطنیہ اس کا (اپنی قدرتی قلعہ بندی اور جائے وقوع کی بناء پر) بہترین دارالسلطنت ہوگا" سلطان محمد کے لئے جس کی عمر ابھی تئیس چوبیس سال ہی کی تھی قسطنطنیہ فتح کرنے کا سب سے بڑا محرک اور قلبی و ایمانی داعیہ (جو بعض اوقات سیاسی مصالح و منافع پر بھی فوقیت رکھتا ہے) اس بشارت اور پیشین گوئی کا مصداق بننا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے والے لشکر کا امیر بہترین امیر ہوگا، اور وہ لشکر بہترین لشکر ہوگا، اس نے ۱۱ ربیع الثانی ۸۵۷ھ (اپریل ۱۴۵۳ء) میں قسطنطنیہ پر اپنے اس وقت کے دارالسلطنت ادرنہ (اڈریانوبل) سے چل کر حملہ کیا اور اس کے لئے وہ پوری حربی و انتظامی تیاری کی جو اتنی بڑی حربی مہم کے لئے کرنی چاہیے تھی، اور اس وقت کے جدید ترین آلات حربی استعمال کئے، اور خاص طور پر سب سے بڑی دُور مار اور طاقت ور توپ جو اس وقت تک ایجاد ہوئی تھی، اور یہی قرآن مجید کی تعلیم اور ایک حقیقت پسند اور تجربہ کار مجاہد کا شیوہ ہے" وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ" (سورۃ الانفال ۶۰) اور جہاں تک ہو سکے

(فوج کی جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلہ) کے لئے مستعد رہو۔

محمد الثانی کے اس دینی جذبہ، بشارت نبویؐ پر اعتماد اور اس کا مصداق بننے کے شوق کا اندازہ، اس کے طرزِ عمل اور جذبات سے ہوتا ہے جو اس جنگ میں ظاہر ہوئے۔

مؤرخ لکھتا ہے کہ!" فاتح اپنے خیمہ میں آیا فوج کے سپہ سالاروں اور لشکر کو جمع کیا اور ایک تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر قسطنطنیہ کی فتح ہمارے ہاتھوں تکمیل پائی تو رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی پوری ہوگی، آپؐ کے ایک معجزہ کا ظہور ہوگا، اور ہمارے حصہ میں یہ عزت وشرف آئے گا، ہمارے فرزندوں (اہل لشکر) کو فرداً فرداً سنادیجئے، اور تاکید کیجئے کہ شریعت غراء کی تعلیمات کو ہر شخص مدِّ نظر رکھے، اور کوئی کارروائی اس کے خلاف نہ ہو، گرجوں اور عبادت گاہوں کے ساتھ کوئی اہانت آمیز سلوک نہ ہو، پادریوں، کمزوروں اور معذور لوگوں سے جو جنگ نہیں کر رہے ہیں تعرض نہ کیا جائے۔"

محمد فاتح جب قسطنطنیہ میں فاتحانہ داخل ہوا اور اس نے وہاں کے تاریخی اور مقدس مرکز طوپ قاپو سی(TOP KOPI) پر ترکی جھنڈا لہراتے ہوئے دیکھا تو اپنے گھوڑے سے اتر آیا، زمین پر سر رکھ کر سجدۂ شکرانہ ادا کیا، اور اپنے ہاتھوں رسول ﷺ کی پیشن گوئی کی تکمیل پر اللہ کی حمد وثنا کی، بعض مؤرخین نے لکھا ہے: کہ فاتح نے زمین پر سجدہ کیا اور اپنے سر پر اس شکر میں مٹی ڈالی کہ اللہ نے یہ شرف اس کو نصیب فرمایا۔

محمد الفاتح ظہر کے قریب اپنے وزراء وامرائے سلطنت کے ساتھ شہر

میں داخل ہوا تھا، سینٹ صوفیا کے گرجے کے پاس پہونچکر وہ گھوڑے سے اترا، اس عالی شان معبد میں داخل ہو کر، جس میں گیارہ سو برس سے تین خداؤں کی پرستش ہوتی تھی، خدائے واحد کی تقدیس کے لئے سر بہ سجود ہوا، اس نے ایک عالم کو جو اس وقت اس کی رفاقت میں تھے، حکم دیا کہ وہ بلند آواز سے اذان دیں، نماز عصر پڑھی گئی اور اعلان ہوا کہ جمعہ کی پہلی نماز جامع ایا صوفیا میں پڑھی جائے گی۔

حاضرین اور ترک نژاد بھائیوں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ محمد الفاتح مرحوم کا قسطنطنیہ میں فاتحانہ داخلہ کس طرح ہوا؟ لیکن اس کو پھر یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ خلیج کو زنجیروں سے ناقابل عبور بنادیا گیا تھا، اب جو حصہ غلطہ کہلاتا ہے، اس پر اہل وینس کا قبضہ تھا، قدیم قسطنطنیہ پر بیز نطینیوں کا ادھر حصار سخت تھا، محمد الفاتح کا بحری بیڑا بحر اسود کی طرف سے بحیرہ مرمرہ (MARMARA) سے آرہا تھا، خلیج القرن الذہبی کے دہانہ کو بیز نطینیوں نے اس ڈر سے لوہے کی زنجیروں سے بند کر دیا تھا کہ ان کو بحیرۂ مرمرہ کی طرف سے محمد الفاتح کی فوجوں کے آنے کا ڈر تھا، محمد الفاتح نے غلطہ کی خشکی پر پچاس کشتیوں کو پھسلا کر قاسم پاشا کی طرف سے خلیج القرن الذہبی GOLDEN HORN میں اتار دیا۔ اور اس طرح ایک ناممکن عمل کو ممکن کر کے دکھادیا، صبح بیز نطینیوں کو اچانک معلوم ہوا، کہ محمد الفاتح کی کشتیاں خلیج میں موجود ہیں، لیکن یہ بات قسطنطنیہ کی فتح کے لئے کافی نہ تھی، محمد الفاتح سخت مزاحمت کر کے تقریباً ایک ہفتہ میں اپنی فوجوں کے ذریعہ سیدنا ابو ایوبؓ کی طرف سے قسطنطنیہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا، شہنشاہ قسطنطین خود معرکہ کی قیادت کر رہا تھا، اس نے اپنی سرخ عبا جو قیاصرہ کی امتیازی پوشاک تھی، اتار کر پھینک دی، اور ترکی فوج کے بڑھتے ہوئے طوفان میں

گھس کر لڑتا ہوا مار آگیا۔

حضرات!

مجھے بڑی خوشی ہے کہ ابھی ترکی میں محمد فاتح کا نام زندہ ہے اور شاید کسی ترکی سلطان اور ترک شخصیت کا وہ احترام اور اس سے وہ محبت نہیں جو سلطان محمد فاتح سے ہے، میں نے جب بچوں کا نام پوچھا تو اکثر "محمد فاتح" سننے میں آیا، میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اس نام کو زندہ رکھیں، اور اپنے بچوں کا نام بتمنّاو تبرکاً محمد فاتح رکھا کریں، شاید کسی سعید بچہ اور نوجوان کے دل میں وہ جذبہ پھر انگڑائی لے اور فوجی وسیاسی حیثیت سے نہ سہی، دینی ودعوتی اور فکری واصلاحی راستہ سے پھر وہ اس ملک کا محمد فاتح ثابت ہو، ایک فرانسیسی مورخ جیسے GIYAH نے سلطان محمد فاتح کے دو سو سال بعد اس کی حکومت کی تاریخ پر کتاب لکھی ہے، اس میں لکھا ہے کہ "دنیا کی تمام مسیحی اقوام کو یہ تمنا اور دعا کرنی چاہئے کہ دوبارہ روئے زمین پر سلطان محمد فاتح جیسا حکمراں اور فاتح نہ پیدا ہو" محمد الفاتح کتاب کے مصنف ڈاکٹر سالم الرشیدی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس کے مقابلہ میں ہر مسلمان کو یہ تمنا اور دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دوبارہ سلطان محمد فاتح جیسا طاقتور اور عبقری شخص نصیب فرمائے۔"

دوستو اور بزرگو!

محمد فاتح کی اس تاریخ ساز اور عہد آفریں کامیابی اور فتح کے بعد پھر وہ دور آیا کہ اس ملک نے پورے عالم اسلام کی تولیت کی ذمہ داری اٹھائی، تاتاریوں کے حملہ (ساتویں صدی ہجری، تیرھویں صدی عیسوی) سے عالم اسلام پامال ہو گیا

تھا، اس وقت تاتاری خود مسلمان ہو گئے، وسط ایشیا کی تاتاری النسل قوم کی ایک شاخ نے ترکی میں اسلامی حکومت قائم کی، یورپ کے ایک بڑے رقبہ پر آل عثمان نے قبضہ کر لیا، سلطان سلیم اول (۹۱۸ھ - ۹۲۶ھ ۱۵۱۲ء - ۱۵۲۰ء) کے زمانہ میں مصر کی فتح کے بعد ترکوں کا حجاز پر بھی قبضہ ہو گیا، اور اس نے خادم الحرمین الشریفین کا لقب حاصل کیا، یہ شرف سلیم کے بعد اس کے جانشینوں کو چار سو برس تک حاصل رہا، حرمین شریفین کی خدمت کا شرف جب سلیم کو حاصل ہو گیا، تو آخری عباسی خلیفہ المتوکل نے جو قاہرہ میں مملوک سلاطین کے زیر سایہ ظاہری شان و شوکت کے ساتھ مگر حقیقتاً بغیر کسی اختیار و اقتدار کے زندگی بسر کر رہا تھا، خلافت کے تمام حقوق و امتیازات بھی اسے تفویض کر دیئے، اور مقامات مقدسہ، و حرمین شریفین کی کنجیاں، نیز آثار نبویہ (تلوار، علم اور چادر) بطور سند خلافت اس کے حوالہ کر دیئے، اس تاریخ سے سلاطین عثمانی "خلیفہ" کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے، اور خطبوں میں ان کا ذکر بحیثیت امیر المؤمنین کے ہونے لگا۔

ڈاکٹر عزیر صاحب مصنف "دولت عثمانیہ" لکھتے ہیں کہ !"اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت دنیائے اسلام کی خلافت کا حق بھی ترکوں کو پہونچتا تھا، کوئی دوسری اسلامی سلطنت طاقت و وسعت میں دولت عثمانیہ کے برابر نہیں تھی، یہی سلطنت تمام دوسری سلطنتوں سے زیادہ شرع و ملت کی حفاظت کی طاقت رکھتی تھی' اور تقریباً ڈیڑھ صدی سے جہاد کا فرض ادا کرتی آرہی تھی، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جب سلطان سلیم کی خلافت کا اعلان کیا گیا، تو دنیائے اسلام کے کسی گوشہ سے اس کی مخالفت نہیں ہوئی۔"

اس وقت سے مصر و شام، فلسطین، حجاز، و یمن اور عراق سب خلافت

عثمانیہ کے دائرہ میں داخل ہو گئے، اس چار سو پانچ سو برس میں ساری دنیا میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، سلطان عبد الحمید ثانی کے وقت تک کوئی مقامات مقدسہ پر نظر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا، ترکوں نے حجاز مقدس کی بھی خدمت اور تولیت کا فرض انجام دیا، مکہ مکرمہ میں بیت اللہ شریف کی موجودہ عمارت سلطان مراد کی بنائی ہوئی ہے، اور مسجد نبویؐ کی تعمیر و تزئین سلطان عبد الحمید اول کا کارنامہ ہے، جو ۱۲۶۵ھ اے ۱۲ اھ میں انجام پایا۔

حرمین شریفین کے ساتھ ترکوں نے مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کی بھی حفاظت کا فرض انجام دیا، میں نے الحاج سید امین الحسینی مفتیٔ اعظم فلسطین سے خود سنا ہے کہ ایک مرتبہ یہودیوں کا ایک وفد سلطان عبد الحمید خاں سے ملا، اور اس نے کہا کہ اگر آپ قدس اور فلسطین میں ہمیں اپنا مرکز و وطن بنانے کی اجازت دے دیں تو ہم ترکی سلطنت کا سارا قرضہ ادا کر دیں گے، سلطان عبد الحمید خاں نے زمین سے مٹی کی ایک چٹکی اٹھائی اور کہا کہ ہم فلسطین کی خاک میں سے اتنا بھی تم کو دینے کے لئے تیار نہیں، پھر اپنے محافظ افسر پر عتاب آمیز نظر ڈالی اور کہا کہ اس کتے کو کس نے میرے پاس آنے کی اجازت دی؟

آپ یاد رکھیں کہ یورپ نے ترکی کو کبھی قبول نہیں کیا، یہ وہ نوالہ ہے جو اس سے نہ نگلا گیا، نہ اگلا گیا، پہلے اس نے بلقان کی ریاستوں کو بغاوت اور اس سے جنگ پر آمادہ کیا، اور ترکی کے بہت سے علاقے یورپ کے قبضہ میں چلے گئے، پھر جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء ۱۹۱۸ء) میں اتحادیوں نے ترکی کو اپنے ساتھ شامل نہیں ہونے دیا، وہ مجبوراً جرمنی کے ساتھ شامل ہوا، اتحادیوں نے اس کے حصے بخرے کر لینے اور اس کے بیرونی مقبوضات پر قبضہ کر لینے کا پورا منصوبہ بنایا، جس کے نتیجہ

میں شام، فلسطین، لبنان، اردن (جو سب شام کا جزء تھے) اور عراق پر اس کا اقتدار قائم ہو گیا، لیکن ترکی کا مرکز براہ راست یورپ کے قبضہ میں کبھی نہیں گیا۔

لیکن اب یورپ نے اپنا نقشۂ جنگ بدل دیا ہے، اب اس نے حملہ اسلحۂ جنگ اور فوجی طاقت کے ذریعہ سے نہیں، کلچر، ذرائع ابلاغ (PUBLIC ME-DIA) نظام تعلیم، اور افکار و نظریات کے ذریعہ شروع کیا ہے یورپ، ترکی کو مسلمان نہیں دیکھنا چاہتا، اس نے زیر زمین سرنگ بچھا رکھی ہے، اور جو کام وہ اپنی فوجوں اور توپوں کے ذریعہ نہیں کر سکا، وہ اندرونی ذرائع سے کر رہا ہے، عصر حاضر کے مشہور فلسفی مؤرخ (ARNOLD TOYNBE) نے لکھا ہے کہ عربوں کے کتب خانہ اسکندریہ جلانے کی روایت تاریخی طور پر صحیح ہو یا بے بنیاد، اب کسی کو کتابی ذخیرہ کو جلانے یا کسی زبان و ثقافت کے مٹانے کی ضرورت نہیں، رسم الخط کا بدل دینا کافی ہے، اس طرح ملک و قوم کا رشتہ ماضی سے کلی طور پر منقطع کیا سکتا ہے۔ یورپ و امریکہ اور اس کے ایجنٹوں کی کوشش ہے کہ ترکی کو دوسرا اسپین بنا دیا جائے، اس لئے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، فاتح مصر صحابی رسول سیدنا عمرو بن العاصؓ کی اس حکیمانہ وصیت اور تلقین کو ہمیشہ ہر زمانہ اور ہر اسلامی ملک میں یاد رکھنے کی ضرورت ہے جو انہوں نے مصر کو کلیۃً فتح کر لینے کے بعد ایسی حالت میں کی کہ مصر کے قدیم باشندے جوق در جوق اسلام قبول کر رہے تھے، اور "یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجاً" کا منظر آنکھوں کے سامنے تھا، ملک کی زبان، تہذیب اور بالآخر رسم الخط بھی بدل رہا تھا، مساجد تعمیر ہو رہی تھیں اور شعائر اسلام بلند، جزیرۃ العرب سے قریب ہونے، اسلامی فتوحات کے سیلاب اور اس کی پے در پے کامیابیوں کے پیش نظر بظاہر اس کا کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ مصر اسلامی اقتدار کے دائرہ سے

خارج ہو جائے گا، لیکن انہوں نے اپنی ذہانت، دوُر بینی اور اس فراست کی بنا پر جو صحبت نبویؐ کی برکت سے ان کو حاصل ہوئی تھی، مسلمانوں اور عرب فاتحین سے کہا "انتم فی رباط دائم" "تم دائمی طور پر سرحد و محاذ جنگ پر کھڑے ہوئے ہو، اور دائمی ناکہ بندی کی حالت میں ہو، اس لئے کہ براعظم افریقہ کی ساری قوموں، غیر مسلم حکومتوں اور آبادی کی نگاہیں تمہارے اوپر ہیں، اور ان کے دل اس طرف لگے ہوئے ہیں کہ ملک کو پھر قدیم حالت میں لے آیا جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس ملک و ملت کو اسلام سے وابستہ پیوستہ رکھنے کی ترکیب کیا ہے؟ اس کے لئے دعوت کے میدان کے تجربہ، قرآن کے تدبر اور تاریخ کے وسیع و عمیق مطالعہ کی بنا پر تین باتیں عرض کرتا ہوں، ان کو غور سے سنئے۔

(۱) ترکی کے مسلم عوام میں ایمان و عقیدہ کی طاقت کو طاقت پہونچایئے (جس کی چنگاریاں اس کے خاکستر میں بہر حال موجود ہیں) ان کے دینی شعور کو بیدار اور متحرک بنانے کی ضرورت ہے، ان مسلم عوام کی اسلام کے ساتھ وابستگی اور اس کے لئے گرم جوشی، ایک ایسی بلند اور مستحکم فصیل اور اسلام کا آہنی حصار ہے، جس کی بدولت بہت سی مسلم (یامدعی اسلام) قیادتوں اور حکومتوں کو کھل کر کفر کا راستہ اختیار کرنے اور اپنے ملکوں اور ماتحت مسلم قوموں کو کفر والحاد کے آغوش میں ڈال دینے کی ہمت نہیں ہو سکتی، خدانخواستہ اگر کسی دن یہ حصار ٹوٹ گیا اور مسلم عوام کا رشتہ اور ان کی روحانی اور جذباتی وابستگی اسلام سے ختم ہو گئی، تو پھر ان ملکوں میں اسلام کے بقا اور تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں، اور ان ملکوں کو اسپین اور روسی ترکستان بنا دینے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی، یہ وہ خام مال (RAW MATE-

RIAL) ہے، جس سے بہترین انسانی مصنوعات تیار کی جاسکتی ہیں، اور مردم سازی اور آدم گری کا کام لیا جاسکتا ہے، صدہا خامیوں اور قابل اصلاح پہلوؤں کے باوجود یہ وہ انسانی مجموعہ ہے، جس پر پیغمبرانہ توجہات اور اہل قلوب اور اہل خلوص کی محنتیں صرف ہوئی ہیں، اور وہ آج بھی اپنے خلوص قلب، اپنی محبت، گرم جوشی اور ایثار و قربانی کے جذبہ اور صلاحیت میں دوسری انسانی جماعتوں اور مذہبی قوموں سے فائق و ممتاز ہے۔

اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ ان عوام کی زندگی میں اسلام پورے طور پر کار فرما اور حکمراں ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً ص وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ ط اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ" (سورہ بقرہ ۲۰۸) مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی زندگی میں سو فیصد مسلمان ہونا چاہئے، دس فیصدی بیس فی صدی اسلام پر عمل کرنے سے کام نہیں چلے گا، یہ نسبت تعلیم میں، ملازمتوں میں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں چل سکتی ہے، عقائد پر مضبوطی سے قائم رہنا، فرائض و عبادات کا پابند ہونا، اور بعض اسلامی شعائر و علامتوں کا حامل ہونا کافی نہیں، ضروری ہے کہ معاشرت بھی اسلامی ہو، تمدن بھی اسلامی ہو، عائلی قانون (PERSONAL LAW) میں بھی شریعت کے احکام پر عمل ہو، حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد بھی ادا کئے جائیں، پھر اسکے ساتھ دین کی محبت کے ساتھ دین کی حمیت بھی ہونی چاہئے۔

ایمان عوام کا بڑا محافظ اور فصیل ہے، یہ وہ قلعہ ہے جو آسانی سے فتح نہیں

ہو سکتا، اس لئے پہلا کام یہ ہے کہ پوری قوم کو پوری طرح مسلمان بنانے کی کوشش کیجئے، اس کے لئے دعوت عام کا راستہ اختیار کیجئے، نقل و حرکت، خطاب و دعوت، اور سفروں کی صعوبت برداشت کیجئے، اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے عمل سے سبق لیجئے کہ انہوں نے (جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے) آنحضرت ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل ہونے، اور ہمہ وقت صحبت اور عبادات جلیلہ کے ساتھ (جن کی اللہ نے ان کو توفیق دی) اعلاء کلمۃ اللہ اور دین کی اشاعت کے لئے بڑی عمر میں بھی باہر نکلنا ضروری سمجھا، اور مدینہ سے چل کر (جس میں ہر مسلمان کو مرنے اور اس کی خاک پاک میں جگہ پانے کی آرزو ہوتی ہے) بحر و بر طے کر کے قسطنطنیہ جیسے دُور دراز مقام پر تشریف لائے، اور اس کو اپنا آخری مرقد بنایا۔

(۲) دوسرا کام یہ ہے کہ اپنی آئندہ نسل کو مسلمان رکھنے کی کوشش کیجئے، ایسا نہ ہو کہ آپ کی آئندہ نسل صرف ترکی زبان جانے، صرف سرکاری اسکولوں میں اس نے تعلیم پائی ہو، دین کے بارے میں اس کی کچھ معلومات نہ ہوں، اگر آپ سب کے سب ولی اللہ اور تہجد گذار بن جائیں (اور خدا ایسا کردے) لیکن اگر آپ نے اپنے بچوں کی دینی تعلیم سے غفلت برتی تو خطرہ موجود ہے، آپ کے بعد مسجدوں کو کون آباد کرے گا، اسلامیت کا یہ تسلسل جو آپ کو من جانب اللہ اور حقانی داعیوں اور مبلغوں، علمائے ربانیین، اور مخلص و سرفروش مجاہدین اور فاتحین کے ذریعہ حاصل ہوا، کیسے قائم رہے گا؟ آپ دیکھئے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام جو خود انبیاء کی تیسری پشت میں تھے، ان کے والد ماجد حضرت اسحاقؑ پیغمبر، ان کے عم نامدار حضرت اسماعیلؑ پیغمبر، اور ان کے جد بزرگوار حضرت ابراہیم (علیہ وعلی نبینا السلام) عالی مرتبت پیغمبر اور ابو الانبیاء تھے، ان کے گھر میں سوائے توحید خالص اور

عبادتِ الٰہی کے اور کسی چیز کی فضا اور ہوا نہ تھی، شرک اور بُت پرستی کا سایہ بھی اس گھر پر ایک صدی سے نہ پڑا ہوگا، لیکن بقول شاعر ؎

عشق است و ہزار بدگمانی

انہوں نے اس کو کافی نہ سمجھا، اپنے فرزندوں، نواسوں اور پوتوں کو جمع کیا، اور ان سے کہا "مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ" (تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے) گویا زبانِ حال سے کہا، میرے پیارو! میری پیٹھ قبر سے نہ لگے گی، جب تک میں یہاں سے یہ اطمینان لے کر نہ جاؤں کہ تم میرے بعد کس کی بندگی کروگے؟

مجھے یقین ہے کہ ان کے ان سب فرزندوں اور فرزندوں کے فرزندوں نے یہی کہا ہوگا کہ والد صاحب! دادا جان! نانا جان! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ آپ نے ہمیں تعلیم کیا دی؟ اور ہم نے ساری عمر کیا دیکھا اور کیا کیا؟ "نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيْمَ وَ إِسْمَاعِيْلَ وَ إِسْحَاقَ إِلٰهاً وَّاحِداً وَّنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ" (ہم آپ کے معبود، آپ کے چچا و والد اسماعیلؑ و اسحاقؑ اور آپ کے دادا جان حضرات ابراہیمؑ کے معبود کی پرستش کریں گے، جو اکیلا پرستش کے قابل ہے، اور ہم اس کے آگے سر جھکانے والے اور فرماں بردار ہوں گے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد سے اس نازک وقت میں کوئی ایسی بات نہیں کہی جو عام طور پر بزرگ خاندان اپنے وارثوں سے سکرات کے ایسے نازک وقت میں کہا کرتے ہیں، نہ اتحاد و اتفاق کی بات، نہ کسی دفینہ اور خزانہ کی خبر، نہ قرض و مطالبات کے بارے میں ہدایت، نہ شریفانہ زندگی گذارنے کی تلقین، بس ایک بات "مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ؟" انہیں صرف ایک بات کی فکر تھی کہ ان کے بعد ان کی اولاد ایمان اور دینِ صحیح پر قائم رہے، اور خدائے واحد کی بندگی

کرے، اور انہیں اس وقت تک اطمینان نہیں ہوا، جب تک کہ انہوں نے اپنی اولاد سے اس پر قائم رہنے کا اقرار نہیں کروالیا، ہر ملک کی موجودہ مسلمان نسل کے لئے یہی اسوۂ نبویؐ، سنت انبیاء اور دین وایمان کا تقاضہ ہے۔

۳۔ تیسری بات جو مجھے کہنی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کا دین پر عمل کرنا مبارک، یہ نقل وحرکت، دعوت و تبلیغ مبارک، دینی مدارس میں فقہ وحدیث اور عربی کی تعلیم پانا، اور قرآن مجید کا حفظ و تجوید مبارک، اور اپنے بچوں کے دین وایمان کی حفاظت کی فکر کرنا بھی مبارک، لیکن ایک بات اور ہے جو کچھ کم اہم نہیں، اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جو طبقہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پارہا ہے، (اور وہی تعداد میں زیادہ اور اثر ورسوخ میں بڑھا ہوا ہے) اور جو نوجوان یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے واپس آرہے ہیں، یہی طبقہ ہر ملک میں ملک پر حاوی اور بااثر ہوتا ہے، وہی قیادت کرتا ہے، وہی پلاننگ (منصوبہ بندی) کرتا ہے، وہی ملک کا رخ متعین کرتا ہے، اسی کا طرزِ زندگی ملک کا عوامی فیشن بنتا ہے، ملک کا نظام تعلیم اور ذرائع ابلاغ اسی کے قبضہ میں ہوتا ہیں، وہی خوب کو ناخوب اور "ناخوب" کو خوب بنادیتا ہے، اور آخر میں ملک کے نظم ونسق پر حاوی ہوکر اور آئین سازی اور یقین LEGISLATION کے منصب پر فائز ہوکر وہ جس چیز کو چاہتا ہے، اس کی اجازت دیتا ہے، اور جس چیز کو چاہتا ہے، اس کو ممنوع اور خلاف قانون قرار دے دیتا ہے، اس طرح پوری قوم اور اس کی معاشرت وتمدن، اس کی نسل کا مستقبل، یہاں تک کہ (اللہ محفوظ رکھے) دینی فرائض کی ادائیگی، شعائر اسلامی اور مدارس و مساجد اور اس کا عائلی قانون (PERSONAL LAW) اس کے رحم وکرم پر رہ جاتا ہے، یہ بہت سے آزاد مسلم ممالک کا تجربہ ہے جن کی اکثریت مسلمان ہے،

بلکہ وہ ملک تقریباً کلیۃً پشتینی مسلمان ہے، اور کبھی وہ ممالک علم دین اور دعوت اسلامی کا عظیم ترین مرکز رہ چکے ہیں، اور اب بھی وہاں بڑی بڑی دینی جامعات قائم ہیں، ان کے نام لینے کی ضرورت نہیں آپ خود ان کو سمجھ سکتے ہیں۔

اس لئے آخر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ آپ اس طبقہ کو ہرگز ہرگز نظر انداز نہ کیجئے، علمی و فکری غذا کے ذریعہ مؤثر لٹریچر اور ان کی نفسیات اور علمی درجہ کے مطابق اسلام کی تفہیم اور اس کی ضرورت و عظمت کو ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کیجئے، اور ان کے دلوں اور دماغوں کو ایمانی و شعوری طریقہ پر اسلام کی ابدیت، اس کی تعلیمات کی صداقت اور اس کے ہر زمانہ میں قیادت کی صلاحیت پر مطمئن کیجئے، یاد رکھئے یہ زمانہ نظریات وافکار اور بین الاقوامی تعلقات کا زمانہ ہے، اس لئے علمی و فکری سطح پر کام کرنے اور جدید طبقہ کو (جو برسر قیادت ہونے کو ہے) اس بات پر مطمئن اور اس کا قائل کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام ہی دنیا کا نجات دہندہ اوا اسلام ہی صحیح زندگی گذارنے کا واحد راستہ ہے، ورنہ یہ دنیا خدا فراموشی کے راستہ پر چل کر خود فراموشی اور بالآخر خودکشی کی منزل کی طرف جا رہی ہے۔

وصدق الله العظيم.

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ ۚ أُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ" (اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے ایسا کردیا کہ خود اپنے تئیں بھول گئے یہ بدکردار لوگ ہیں۔

کُل مسلمان اور مکمل اسلام

یہ تقریر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تجویز پر "اصلاح معاشرہ" کانفرنس منعقدہ ۳۰، ۳۱ر جولائی ۱۹۹۴ء کو ایک نمائندہ اور منتخب مجمع کے سامنے کی گئی تھی، جس میں پورے ہندوستان سے دو ہزار مندوبین نے شرکت کی تھی۔

مندوبین کی یہ تعداد علماء، ائمہ مساجد، مدارس کے ذمہ دار، مختلف جماعتوں کے سربراہ، وکلاء اور ماہرین قانون پر مشتمل تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کل مسلمان اور مکمل اسلام

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ، وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَمَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ وَّدَعَاہُ بِدَعْوَتِھِمْ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ .

أما بعد !

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً ص وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ط (سورہ بقرہ—۲۰۸) اَفَحُکْمَ الْجَاھِلِیَّۃِ یَبْغُوْنَ ط وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ط سورہ المائدہ— ۵۰)

ترجمہ : اے ایمان والو! اسلام میں سارے کے سارے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔

تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں حالانکہ جو لوگ یقین رکھنے والے ہیں ان کے یہاں اللہ سے بہتر اور کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں۔

حضرات ! میں نے آپ کے سامنے قرآن شریف کی دو آیتیں پڑھی ہیں،

بہت سے تعلیم یافتہ حضرات کو اور خاص طور سے جو قرآن مجید سے تعلق رکھتے ہیں، وہ شاید سوچتے ہوں کہ ان آیتوں کا انتخاب کیوں کیا گیا، اور اس مقصد سے اس کا کیا تعلق ہے، لیکن یہ دو آیتیں زندگی کیلئے بلکہ پوری کائنات کے لئے اور زندگی کی اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ اور خاص طور سے امت اسلامیہ کے لئے یہ دو آیتیں مستقل ایک درس گاہ ہیں اور مستقل ایک دعوت فکر ہیں۔

حضرات! سارا مسئلہ اسلام اور جاہلیت کے فرق کا ہے اب میں معذرت کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں ہمارے بہت سے پڑھے لکھے بھائی بھی "اسلام" و "جاہلیت" کے فرق کو بھول چکے ہیں، چونکہ جاہلیت ان کے نزدیک ختم ہو چکی ہے، زیادہ تر "جاہلیت عربیہ" ان کے ذہن میں ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ جاہلیت اور اسلام کی کوئی کشمکش اب نہیں ہے، اور اسلام و جاہلیت کے فرق کو سوچنا اور اس کا جائزہ لینا گویا ایک طرح سے تضییع اوقات ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ملت میں جو بھی کمزوریاں اور خرابیاں ہیں وہ سب اس فرق کو فراموش کر دینے کا نتیجہ ہے جو اسلام اور جاہلیت کے درمیان ہے، پہلی جو آیت پڑھی وہ سورۂ بقرہ کی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ص وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ إِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ط" اے ایمان والو! اسلام میں سارے کے سارے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، کیونکہ وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔

اے ایمان والو! تم "سلم" میں داخل ہو جاؤ اور "سلم" کا ترجمہ میں نے

مستند اور معتبر تراجم میں دیکھا ہے، حضرت شاہ عبد القادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادیؒ، مولوی فتح محمد صاحب جالندھریؒ تک، سب میں "مسلم" کا ترجمہ اسلام سے کیا گیا ہے، شاہ صاحبؒ کے ترجمہ میں "مسلمانی" سے کیا گیا ہے، یعنی اے ایمان والو! مسلمانی اور اسلام میں داخل ہو جاؤ" وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ" اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ پہلے اسلام کو سمجھنے کی ضرورت ہے، میں معذرت کے ساتھ یہ بات عرض کروں گا، بہت سے حضرات کے ذہن میں جنہوں نے تقابلی مطالعہ نہیں کیا ہے، اور مذاہب کی تاریخ پر ان کی نظر نہیں ہے، ان کے ذہن میں شاید یہ بات مستحضر اور تازہ نہیں ہوگی کہ اسلام وہ واحد مذہب ہے دنیا کا، جو ایک اصول و عقیدہ اور مسلک زندگی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، ورنہ جتنے مذاہب ہیں وہ سب (مذاہب کے بانی نہیں کہتا اور نہ کوئی مذہب کا بانی ہوتا ہے) مذاہب کے داعیان اول کے نام پر یا ملکوں کے نام پر، یا طبقوں اور نسلوں کے نام پر وہ مذاہب ہیں، مثال، کے طور پر (مجھے معاف کیا جائے) یہودی مذہب ہے، اس کی نسبت یہودا کی طرف ہے جو خاندان نبوت کے ایک فرد تھے، عیسائی، اس کی نسبت حضرت عیسیٰ کی طرف ہے، پھر مجوسی، وہ پارسی کہلاتے ہیں، فارس (ایران) ایک ملک ہے، کوئی عقیدہ یا کوئی طرز زندگی یا دعوت الٰہی نہیں ہے، ہندویت، ہند ایک ملک ہے اور وہ اس کی طرف منسوب ہے، برہمنیت، الگ طبقہ اور ایک خاص نسل کی طرف منسوب ہے، بدھ مت گوتم بدھ کے نام سے موسوم و مشہور ہے، ایسے ہی جینی مذہب۔

واحد مذہب جو ایک مسلک زندگی، عقیدہ اور نبوت کی طرف منسوب ہے، وحی الٰہی اور اللہ کی براہ راست رہنمائی اور اس کے دیئے ہوئے احکام اور شریعت کی طرف منسوب ہے، وہ اسلام ہے، تو اسلام کا پورا دارومدار عقیدہ پر ہے، شریعت پر ہے، اور وہ بالکل ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔

اب اس کے بعد سوچنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یٰآیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَافَّةً" اے ایمان والو! اسلام اور مسلمانی میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

اس میں یہ بات لحاظ کرنے کی ہے کہ اس میں بتایا گیا ہے کہ سو فی صدی اسلام میں داخل ہو جانا چاہیئے، مسلمان بھی سو فی صدی ہوں، اور اسلام بھی سو فیصدی ہو۔ نہ مسلمانوں میں کوئی تحفظ یا ریزرویشن (RESERVATION) ہے، نہ اسلام میں کوئی تحفظ، استثناء یا ریزرویشن ہے، یہ ایک نکتہ ہے جس کو آپ ساتھ لے کر جائیں، اور اس کی اشاعت کریں، خدا کا مطالبہ اور قرآن مجید کی صریح آیت ہے، کہ سو فی صدی مسلمانوں کو سو فی صدی اسلام میں داخل ہونا چاہیئے اور مذاہب کی طرح نہیں کہ عقائد لے لئے اور سب کچھ چھوڑ دیا، یا عبادات لے لئے اور اسکی زندگی کے قانون اور زندگی کے طرز حیات اور طرز معاشرت سے اور باہمی حقوق اور فرائض سے اور شرعی قانون پر چلنے سے تعلق نہیں ہے، ہر مذہب نے ایک ایک حصہ لے لیا ہے، کسی نے دو لیا ہے کسی نے تین، یہاں مطالبہ یہ کیا جارہا ہے، کہ سو فی صدی مسلمانوں کو سو فی صدی اسلام میں داخل ہو جانا چاہیئے، مسلمانوں میں تحفظ اور ریزرویشن نہیں ہے کہ مسلمان پچاس فی صدی کے پابند ہیں اور قائل ہیں، اور عامل ہیں، اور پچاس فی صدی سے مستثنیٰ ہیں، یا پچھتر فی صدی رکھ

لیجئے، یہاں تو مطالبہ ہے کہ سو فی صدی اسلام ہونا چاہئے، ایک فی صدی بھی خارج نہیں ہونا چاہئے، کسی قسم کے استثناء یا رعایت یا کسی قسم کا خصوصی معاملہ نہیں کیا گیا ہے، ہم کو ملت اور اپنا جائزہ لینے کا ایک رہنما اصول دیا گیا ہے، بلکہ پیمائش کا آلہ دیا گیا ہے، پہلا مطالبہ اللہ کا یہ ہے اور قرآن مجید کا صریح حکم یہ ہے کہ سو فی صدی مسلمانوں کو سو فی صدی اسلام میں داخل ہونا چاہئے نہ تو یہ کہ پڑھا لکھا طبقہ مستثنیٰ ہے، شریف النسب اور عالی نسب لوگ مستثنیٰ ہیں، یہاں تک کہ حاکم مستثنیٰ ہیں، کسی بڑے سے بڑے حاکم (جو تصور اسلام میں حاکم یا خلیفہ کا ہے) کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ وقت، کسی بڑے سے بڑے سربراہ مملکت اور کسی بڑے سے بڑے قانون ساز، کسی بڑے سے بڑے فاتح اعظم، کسی کے لئے بھی کوئی استثناء نہیں ہے کہ اس کو نماز پڑھنے کی فرصت نہیں اس کو نماز سے مستثنیٰ کیا جائے، فلاں کو حج سے مستثنیٰ کیا جائے کسی کو ہرگز یہ اجازت نہیں کہ جس پر حج فرض ہے اور وہ اس کی استطاعت رکھتا ہے وہ حج چھوڑے۔

اسی طریقہ سے "عائلی قانون" کہ سب مسلمان اس کے پابند ہیں، ترکہ اور میراث کے قانون کے سب مسلمان پابند ہیں، یہ بات چونکا دینے والی ہے، ایک تازیانہ ہے ہمارے لئے اس وقت ساری چیزیں اس کے ماتحت آجاتی ہیں، ہمارا یہ اصلاح معاشرہ کا اجلاس، اس کی تقریریں اور اس کی وضاحتیں، اس کے مشورے سارے کے سارے اس کے اندر آجاتے ہیں کہ " یٰآیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً ." "اے ایمان والو! اسلام مسلمانی میں پورے پورے داخل ہو جاؤ" اس کا مطلب یہ ہے کہ سو فی صدی مسلمان اور سو فی صدی اسلام ہونا چاہئے، اگر آپ آزادانہ مطالعہ کریں، منصفانہ مطالعہ کریں، اور تقابلی مطالعہ کریں تو آپ کو

معلوم ہوگا کہ آج مسلمانوں میں اس طرح کی تقسیم پائی جاتی ہے کہ اس دین کے قبول کرنیوالوں میں بھی استثناء اور تحفظ ہے، ریزرویشن ہے، اور رعایتیں ہیں، اور اس دین میں بھی تقسیم ہے، اس طبقہ کے لئے دین کا فلاں حصہ مناسب ہے، اس طبقہ کے لئے مناسب نہیں، اس پر وہ عمل نہیں کرسکتا، تنہا یہ بات کافی ہے، اس آیت کی رُو سے اس کی گنجائش ہی نہیں کہ عقائد ہم لیں گے، اور عبادات چھوڑیں گے، عقائد اور عبادات بھی لیں گے لیکن معاملات چھوڑیں گے، معاملات بھی لیں گے، لیکن عائلی قانون کو چھوڑیں گے، اس میں کسی چیز کی اجازت نہیں، اگر آپ اس نکتہ کو سمجھ جائیں اور اس کو اپنے ساتھ لے کر جائیں تو یہ عمر بھر کے لئے کافی ہے، مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ سو فی صدی اسلام میں داخل ہوں، اب آپ اپنا محاسبہ کرلیجئے اور کرتے رہئے کہ کیا آپ نے سو فی صدی اسلام کو قبول کیا، اور سو فی صدی آپ اسلام پر عمل کررہے ہیں؟ کیا آپ کی معاشرت بھی اسلام کے مطابق ہے، آپ کا معاشرتی نظام، آپ کے رواجات، آپ کی رسوم، اور آپ کا جو معاشرتی، اجتماعی، خانگی نظام ہے، خانگی روایات ہیں، تاریخ ہے، اور آپ کے خاندانوں میں جو رسمیں اور معمولات رائج ہیں، آپ صرف ان کا خیال رکھیں کہ آپ اس معیار پر اترتے ہیں، اور آپ اس کو پورا کرتے ہیں؟ آپ اس کے بعد احکام شریعت کو نظر انداز کردیں گے؟ جو معیاری و مثالی مسلمان تھے اور جو قیامت تک نمونہ رہیں گے، وہ ان احکام اور ہدایات کو کس طرح پورا کرتے تھے، ان تقریبات اور زندگی کے ان مواقع سے کس طرح سے گذرتے تھے؟

میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ صحابہ کرامؓ کی جماعت کوئی خالص روحانی جماعت نہیں تھی، یہ بات نہیں تھی کہ ان کو صرف عقیدہ کی ضرورت

تھی، آپ ان کا مطالعہ کریں، سیرت اور احادیث کی کتابوں میں مساجد کا حال پڑھیں، ان کی نمازوں کا حال پڑھیں، انکی تہجد گذاری اور شب بیداری کو تو دیکھیں، لیکن ان کی تقریبات کو نہ دیکھیں، یہ بھی اس روح کے خلاف ہوگا جو روح ہمیں اس آیت سے ملتی ہے کہ " اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً" دین کو ہمیں پورے طور پر اپنے اندر جذب کرنا چاہئے اور اپنے کو دین کے تابع بنانا چاہئے، ہمیں رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ، حیات مبارکہ اور صحابہ کرامؓ کے حالات اور سیرت کا مطالعہ بھی اسی وسیع نظر سے کرنا چاہئے۔

عرصہ سے یہ غلطی ہو رہی ہے، پورے عالم اسلام میں اور خاص طور پر ہمارے ملک میں کہ ہم صحابہ کرامؓ اولیاء کرامؒ، علماء ربانیینؒ، اور مصلحین و مجددین سب کے حالات میں صرف اس حصہ کو پڑھتے ہیں، جس کا تعلق عقیدہ سے ہے، عبادات سے ہے، ہم ان کے شادی بیاہ کی تقریبات کا مطالعہ نہیں کرتے کہ کس طرح انہوں نے انجام دیں ہم ان کی عائلی زندگی کا، خانگی زندگی کا، مطالعہ نہیں کرتے کہ وہ گھر میں کیسے رہتے تھے، اسی طرح نکاح و طلاق کے جو مسئلے ان کو یا ان کی اولاد کو پیش آتے تھے، وہ ان کو کس طرح حل کرتے تھے، جس طرح ان مسلمانوں کے بارے میں ایک تحفظ اور ریزرویشن ہے، ویسے ہی تاریخ کے بارے میں بھی الگ ریزرویشن ہے کہ ہم کتاب کے صرف ان ابواب کو کھولتے ہیں، جس کا تعلق عبادات سے ہے، ذکر و افکار سے ہے، یاد الہی سے ہے، انکے روحانی اثرات سے ہے، ان کی تبلیغ اور انفرادی کارناموں سے ہے، ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی شادیاں کیسے ہوتی تھیں، ان کا ترکہ کیسے تقسیم ہوتا تھا، جب طلاق کی ضرورت ہوتی تو وہ کس طرح طلاق دیتے تھے؟

میں ایک واقعہ صحابۂ کرامؓ کے صدہا واقعات میں سے بیان کرتا ہوں، وہ واقعہ آنکھ کھول دینے والا، اور ایک طرح سے چونکا دینے والا ہے، بلکہ ایک طرح سے وہ ایک ذہنی زلزلہ پیدا کرتا ہے، آپ خیال فرمایئے حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ مہاجر ہیں، اور اتنا ہی نہیں بلکہ عشرۂ مبشرہ میں داخل ہیں، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ایک مرتبہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، آپ ﷺ فرماتے ہیں، عبدالرحمٰن خیریت تو ہے! آج تمہارے کپڑوں پر خوشبو نظر آرہی ہے، فرمایا ہاں اللہ کے رسولؐ میں نے شادی کرلی ہے، حیرت کی بات یہ ہے (میں حدیث کے ایک طالب علم کی حیثیت سے، اور جو مستند علماء بیٹھے ہوئے ہیں، ان کی تصدیق بالکل کافی ہے) یہ عرض کررہا ہوں، پہلے آپ اپنے ذہن کو متوجہ اور بیدار کیجئے، یہ ایک ہلادینے والا واقعہ ہے، ایک زلزلہ لے آنے والا واقعہ ہے کہ اللہ کے رسول، خاتم النبیین، سید المرسلین، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین مدینہ طیبہ کے اندر موجود ہیں، اور میں آپ کو اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر بتاتا ہوں، سیاحتوں کی بنا پر کہ جب کوئی برادری کہیں ترک وطن کرتی ہے تو عام طور پر ایک جگہ رہنا پسند کرتی ہے، مثلاً ہندوستان کے میمن اور خوجے جو بمبئی میں تجارت کرتے تھے، ان کو آپ تلاش کریں تو وہ سب آپ کو کراچی میں ملیں گے، اگر آپ ان کو تلاش کرنا چاہیں تو کراچی میں تلاش کرلیجئے، پڑھے لکھے لوگ، ادیب و شاعر اگر ملیں گے تو لاہور، اسلام آباد، اور راولپنڈی میں ملیں گے، جو علمی مرکز ہیں، تو اس میں شہر نہیں بلکہ محلّہ کی تخصیص کرکے کہتا ہوں کہ یہ مہاجرین جو مکہ معظمہ سے آئے تھے، وہ مدینہ طیبہ کے خاص حصہ اور علاقہ بلکہ ایک جوار میں سکونت پذیر ہوئے ہوں گے، کچھ روایات ہوتی ہیں کچھ عادتیں ہوتی ہیں، مستورات کا ملنا جلنا

ہوتا ہے، اور کچھ پچھلے واقعات ہوتے ہیں، یہ سب چیزیں مشترک ہوتی ہیں، اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے کہ قریب ہی رہیں، تو یہ بھی یقینی بات ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ رسول اللہ ﷺ سے مکانی فاصلہ کے لحاظ سے بھی زیادہ دُور نہیں رہے ہوں گے، لیکن حیرت کی بات ہے، جس پر آدمی محو حیرت ہو جائے، اور اس پر ایک سکتہ طاری ہو جائے کہ مدینہ طیبہ میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ جیسا مہاجر اور جلیل القدر صحابی نکاح کرتا ہے، اور اللہ کے رسول موجود ہیں، کم فاصلہ پر اور آپ ﷺ کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں سمجھا کچھ نہیں تو برکت ہی کے لئے، آج حال یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ بھائی برکت کے لئے آجایئے، آپ کا قدم پہونچ جائے، یہ مولویوں سے کہا جاتا ہے، اور نیک دیندار لوگوں سے کہا جاتا ہے۔ آخر عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو یہ خیال کیوں نہیں ہوا کہ میں نکاح کر رہا ہوں اور اللہ کے رسولؐ یہاں اتنے قریب موجود ہیں، اور آپؐ کو زحمت نہ دوں، اس سے بڑھ کر ناشکری کیا ہو سکتی ہے، ناقدری کیا ہو سکتی ہے، بے ادبی کیا ہو سکتی ہے، لیکن یہ واقعہ ان کی نظر میں ایسا تھا کہ ان کو ایک لفظ بھی معذرت کا کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، اور انہوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ کہیں کہ یا رسول اللہ معاف فرمایئے، مجھے بالکل خیال نہیں رہا، یا فلاں بات مانع ہوئی، اور اسی طرح حیرت کی بات یہ ہے کہ حضور ﷺ نے بھی ایک لفظ شکایت کا نہیں فرمایا، حدیث کا دفتر موجود ہے، ہندوستان کے عظیم کتب خانوں میں یہاں کا کتب خانہ بھی ہے، میں دعوت دیتا ہوں کہ وہ بتائے کہ حضور ﷺ نے شکایت کی ہو کہ عبدالرحمٰن تم ہمیں بھول گئے، بات کیا تھی، عبدالرحمٰن کا تفقہ اور ان کی فراست تھی، ان کی ذکاوت تھی، اور ان کی حقیقت شناسی تھی کہ انہوں نے سوچا کہ جتنی دیر میں حضورؐ کو

تکلیف دوں گا، معلوم نہیں کتنے لوگ آئیں اور اسلام قبول کریں، اور سب سے بڑی دولت جو نجات کا باعث ہے وہ اس کو حاصل کریں، ہم اس کے بجائے کہ آپ کو زحمت دیں آپ کو تکلیف دیں، اور وہ لوگ چلے جائیں کہ ہم پھر کبھی آئیں گے تو اس سے بہتر یہ ہے کہ آپؐ اپنے مقام عالی پر تشریف رکھیں، اور لوگ آئیں، ہدایت پائیں، کلمہ پڑھیں، آپ ﷺ کے دست مبارک پر اسلام لائیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر قرآن مجید کے نزول کی کوئی ڈائری، روزنامچہ ہوتا، وہ روزنامچہ اس طرح تو ہے کہ یہ سورہ کہاں نازل ہوئی، کتنا پہلے نازل ہوا اور کتنا بعد میں، اگر ایسا ہوتا کہ (وقت شماری کے ساتھ، آیت شماری کے ساتھ) فلاں وقت یہ آیت نازل ہوئی اور فلاں وقت یہ آیت نازل ہوئی، کوئی اگر روزنامچہ لکھنے والا ہوتا تو یقین دلاتا ہوں کہ جتنی دیر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے نکاح کی مجلس میں شرکت میں گذرتی، اس مین اتنی آیتیں نازل ہوئیں۔

تو ایک بات یہ ہے کہ اس آیت کو اپنے ساتھ لیکر جایئے، دماغ پر نقش کر کے لے جایئے کہ مطالبہ صرف اتنا نہیں ہے کہ اسلام قبول کرو، اور اسلام میں داخل ہو جاؤ، بلکہ مطالبہ یہ ہے کہ اسلام میں سو فی صدی داخل ہو، تم بھی سو فیصدی ہو اور اسلام بھی سو فی صدی ہو، نہ اس میں ریزرویشن، اور آج کیا ہے جو لوگ اسلام کی دولت سے مشرف ہیں، انہوں نے بھی تقسیم کر رکھی ہے کہ دین کا وہ شعبہ لیں گے، اور دین کا وہ شعبہ چھوڑیں گے، اس کے وہ مکلف نہیں، وہ ان کی طاقت سے باہر ہے۔

"اصلاح معاشرہ" کی دعوت کا ایک اجمالی پیغام اور زندگی کا ایک رہنما اصول (جو زندگی کے تمام سرد و گرم اور نشیب و فراز، اور مختلف النوع مرحلوں پر

حاوی ہے) وہ یہ ہے "یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً" اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اسلام میں داخل ہو جاؤ، مسلمانی میں شامل ہو جاؤ، "کافۃ" کا تعلق دونوں سے ہے، داخل ہونے والوں سے بھی ہے، اور جس دائرہ میں داخل ہو رہے ہیں، اس سے بھی ہے، وہ بھی کافۃ یہ بھی کافۃ اس طرح نہیں کہ مسجد جائیں اور ایک قدم مسجد کے اندر رکھا، بس ہم مسجد میں داخل ہو گئے، یا دونوں قدم اندر رکھ دے اور اندر نہ جائے، یا اندر تو جائے لیکن نماز نہ پڑھے، یہ نہیں "ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً" پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، اور عامل بن جاؤ، "داخل" بھی بنو اور "عامل" بھی بنو۔

اس کے بعد دوسری آیت میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے، سورۂ مائدہ کی آیت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "اَفَحُکْمَ الْجَاھِلِیَّۃِ یَبْغُوْنَ ط وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ". کیا وہ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں، میں حکم کے متعلق عرض کر دوں، عربی زبان سے ایک خصوصی تعلق رکھنے والے انسان کی حیثیت سے، اور عربی ذخیرہ کی چھان بین کرنے والے طالب علم کی حیثیت سے بھی "حکم" کا لفظ قرآن مجید میں بڑا وسیع اور بلیغ ہے، حکم کے معنی صرف قانونی فیصلہ کے نہیں "ترجیح" و "اختیار" کے بھی ہیں، کسی چیز کو ترجیح دینا اور کسی چیز کو اختیار کرنا یہ بھی حکم میں شامل ہے، حکم کا لفظ ان سب معانی پر حاوی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا جاہلیت کے فیصلہ کو، کیا جاہلیت کے انتخاب کو، کیا جاہلیت کے رجحان کو، کیا جاہلیت کے اصول کو وہ ترجیح دیتے ہیں؟ وہ چاہتے ہیں "وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ" اللہ تعالیٰ سے بہتر حکم دینے والا ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں کون ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ جاہلیت کے معنی بھی اب بہت فراموش ہو گئے ہیں، بہت گہرا مطالعہ کرنے والوں اور جن کو سیرت نبوی پر اللہ تعالیٰ کچھ لکھنے اور تالیف کرنے کی سعادت عطا فرماتا ہے، وہ اس سے بحث کرتے ہیں، اور اس کا حق ابھی بہت کم ادا ہوا ہے، جاہلیت کے دور کی وسعت کو بہت کم لیا گیا ہے، میں کہتا ہوں ایک سیرت نگار کی حیثیت سے، اور ایک ایسے خوش قسمت انسان کی حیثیت سے جس کو اللہ نے سیرت کے موضوع پر لکھنے کی توفیق دی کہ جاہلیت کے مفہوم سے بھی ہمارا ذہن بہت نا آشنا ہو گیا ہے، جاہلیت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف جاہلیت عربیہ مراد ہے، اور جاہلیت عربیہ سے مراد ہے بُت پرستی کا دَور، دختر کشی کا دَور، شراب نوشی کا دَور، اور رہزنی کا دَور، ان کے سامنے صرف یہ آتا ہے، لیکن معاشرت، طرزِ معیشت، طرز زندگی، فیصلے کرنے کے معیار و اصول، اور رغبات اور نفرتیں، یہ چیزیں جاہلیت کے تصور کے ساتھ ذہن میں نہیں آتیں، حالانکہ جاہلیت ان سب پر مشتمل ہے، اگر جاہلیت کا ترجمہ اردو میں کیا جائے تو اس کا جو ترجمہ حاوی ہے اور ان سب چیزوں کو اپنے ضمن میں لے لیتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ دَور ہے جو نبوت کی روشنی اور ہدایت سے محروم رہا ہے، قوم کا وہ دور جو نبوت کی روشنی اور ہدایت سے محروم رہا ہے، چاہے وہ یورپ ہو یا ساسانی مملکت ہو، چاہے وہ ہندوستان ہو، چاہے وہ عرب ہو، میں اس کا ایک دوسرا ترجمہ کرتا ہوں "من مانی زندگی" جاہلیت کیا ہے؟ من مانی زندگی گذارنا، یہ روح ہے جاہلیت کی، جاہلیت کی اسپرٹ ہے، جو چیز اسلام کی مخالف اور متوازی ہے اور آسمان سے اللہ کے نازل کئے ہوئے ادیان سے، اور صحف سماوی سے، اور تعلیمات ربانی سے بے نیاز ہے، وہ یہ ہے کہ نبوت اور ہدایت آسمانی کی روشنی سے جو دَور محروم ہو وہ جاہلیت

ہے، اور اس میں پھر کیا ہوتا ہے، زندگی کیسے گذاری جاتی ہے، من مانی زندگی، یعنی جو دل میں آئے، جو ہماری سوسائٹی، ہمارا ماحول چاہتا ہے، اور جو معیار اس وقت مقرر ہو چکے ہیں، اور "حیثیتِ عرفی" کے اظہار کے جو اصول مقرر ہو گئے ہیں، ہم تو اس پر چلیں گے، یہ ہے من مانی زندگی، اور اس کو قرآن اور حدیث کی اصطلاح میں "جاہلیت" کہا گیا ہے، دیکھئے اگر آپ احادیث کا جائزہ لیں تو آپ کو کئی جگہ ایسا معلوم ہوگا کہ حضور ﷺ نے ایسی چیز پر بھی جس کا تعلق عقیدہ سے نہیں تھا، جاہلیت کا اطلاق فرمایا، ایک صحابی ہیں (جن کا نام نہیں لوں گا) ان کا معاملہ اپنے ملازم کے ساتھ کوئی مساویانہ نہیں تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: "انك امرؤٌ فيك جاهلية" تم ایک ایسے آدمی ہو، تمہارے اندر جاہلیت کی بُو ہے، اب عقائد تلاش کرنے ضرورت نہیں، خادم کے ساتھ ایسا معاملہ رکھنا کہ یہ مالک ہے اور وہ مملوک ہے، اس کو جاہلیت کہا، اور پھر اس سے بڑھ کر "مَن تَعزیٰ عليكم بعزاء الجاهلية" جو تمہارے سامنے جاہلیت کی دعوت دے، عصبیت جاہلیت کی طرف بلائے، اور جاہلیت کا نعرہ لگائے، اس کے ساتھ سخت کلامی کرو، میں اس کو علماء کے لئے چھوڑ دیتا ہوں، اس کا پورا ترجمہ نہیں کروں گا، سخت سے سخت بات اس کے سامنے کہو "ولا تكنوا" کنایہ واشارہ سے بھی کام نہ لو، اس کو جاہلیت کیوں کہا؟ اس کا تعلق تو عقیدہ سے نہیں، اس کا تعلق تو عقیدۂ توحید سے نہیں، ایمان بالآخرۃ سے نہیں، ایمان بالرسول سے نہیں، تو معلوم ہوا کہ اسلام صرف اسی کا مطالبہ نہیں کرتا، اسلام صرف اسی کا نام نہیں ہے، کہ عقائد صحیح ہوں، مجھے معاف کیا جائے میں بغیر کسی تنقیص کے کہتا ہوں، اسلام صرف اس کا نام نہیں ہے کہ صرف عقائد صحیح ہوں، اور نمازوں کی پابندی اور عبادات اور اس کے علاوہ جو چیزیں عقائد اساسیہ میں

آجاتی ہیں وہ اس کے دائرہ میں ہیں، لیکن ہم شادی کرنے میں آزاد ہیں، ہم پردہ نہ کرنے میں آزاد ہیں؛ ہم مقدمات عدالتوں میں لے جانے میں آزاد ہیں، ہم اپنے مال کی تقسیم میں آزاد ہیں، ہم ان سب چیزوں میں آزاد ہیں، اس لئے ہم سے ان سب چیزوں میں کوئی کچھ نہ پوچھے، اور ہمیں نہ ٹوکے، یہ دین کے دائرہ میں نہیں آتا، یہاں کا اصل پیغام جس کے لئے آپ کو زحمت دی گئی ہے، یہ ہے کہ آپ دین کا صحیح مفہوم سمجھ لیں، ایک ہے "اسلام"، ایک ہے "جاہلیت"، اب آپ یہ دیکھئے کہ جو زندگی گذر رہی ہے مسلمانوں کی وہ اسلام کے مطابق ہے؟ سو فی صدی اسلام کلی اتباع چاہتا ہے، جو آیت میں کہا گیا ہے " اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً" پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، اس لئے اس کی ہر گز گنجائش نہیں کہ مسلمان دین کے بہت سے احکام کے پابند رہیں اور ان کا احترام واہتمام کرتے رہیں، مگر زندگی کے شعبوں اور رواجوں میں آزاد رہیں، مجھے معاف کیا جائے تحقیر مقصود نہیں، وضاحت مقصود ہے۔

صاحب! شادی بیاہ میں بھی دین کا نام لینا، اور اس میں بھی سنت وشریعت کا حوالہ دینا، اس کا بھی احتساب کرنا کہ یہ شادی اتنے دھوم دھام سے کیوں ہوئی؟ صاحب! اللہ نے دولت دی تھی اور ہمارے کنبہ کا ہمارے خاندان کا اور ہم جہاں رہتے ہیں، وہاں یہی دستور تھا، لیکن یہ ضروری ہے کہ آپ کا عائلی قانون بھی وہی ہو جو قرآن مجید نے دیا ہے، اور شریعت نے اس کی تشریح کی ہے، اور علمائے اسلام اور فقہائے کرام نے (اللہ ان کو بہتر جزائے خیر عطا فرمائے) انہوں نے اس کے لئے اپنی راتوں کی نیندیں قربان کی ہیں، اور اپنی صحت کو خطرہ میں ڈالا ہے، اور ملت اسلامیہ کو مستغنی کر دیا ہے۔

میرے بزرگو! دوستو اور عزیزو! یہ آیتیں ہیں آپ ان کو اپنے ذہن میں لے کر جایئے، ایک تو مطالبہ ہے کہ اسلام میں داخل ہو کلی طور پر تم بھی کلی طور پر اور تمہارا اسلام بھی کلی طور پر، یہ نہیں کہ عقائد سر آنکھوں پر، اللہ بچائے ذرہ برابر انحراف نہیں ہوگا، عبادات میں ذرہ برابر بھی ہم سے تساہل نہ ہوگا، لیکن صاحب یہ کہ شادی کس طرح ہو، اور نکاح و طلاق کے مسائل ہیں، اور تقسیم میراث کے مسائل ہیں، اور پھر بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو خاندان میں پیش آتی ہیں، اس میں آپ کو آزاد چھوڑ دیجئے بالکل اس کی مہلت نہیں "یَآیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِیْ السِّلْمِ کَافَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ" اور خطوات الشیطان میں بھی بڑی بلاغت ہے، کہ اگر تم نے یہ نہیں کیا تو پھر اتباع خطوات الشیطان ہوگا، یہاں پر اس لئے اس کا بھی ذکر کیا، اللہ صرف فرمادیتا" ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّة "لیکن اس کا جو متوازی ہے وہ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ" ہے آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ خطوات الشیطان ہے، یہ گھروں کو لٹا دینا، یہ جائدادوں کو قرق کر دینا یہ سودی قرض لینا، اور اس خوشی میں راتوں کو جاگنا، صحت کو خراب کر لینا، یہ سب اسلئے ہے کہ نام ہو جائے اور شان ہو کہ فلاں صاحب کے یہاں بارات آئی تھی، اس میں دو سو موٹریں تھیں اور اتنی بڑی بارات تھی، اور اس سب کو (FIVE STAR) ہوٹل میں ٹھہرایا گیا، میرے نام دعوت نامے آتے ہیں، اس میں لکھا ہوتا ہے کہ آپ (FIVE STAR) ہوٹل میں ٹھہریں گے، یہ ساری چیزیں "عرف" میں داخل ہو گئی ہیں جو عربی کا بہت بلیغ لفظ ہے، جس کا ترجمہ ہے رسم و رواج اور اصول زندگی۔

ہمارے بمبئی کے ایک دوست نے ذکر کیا کہ ایک مجلس نکاح میں کھجور، چھوہارے تقسیم کرنے کے بجائے جو مسنون ہے، نوٹ تقسیم کئے گئے، سو سو روپئے، پچاس پچاس روپئے، دس دس روپئے کا نوٹ، کتنے ہزار روپئے صرف اس نکاح میں صَرف ہوگئے، کہاں سے اس کی اجازت ملی ہے۔

حضرات! ہمارا مقام و منصب تو یہ تھا کہ ہمارے ہندوستان میں اتنے دن سے رہنے سے ہندوستان کی قدیم قوم جو تھی، اس کے اندر ایک ہل چل پیدا ہو جاتی، غور و فکر کرنے کی زبردست تحریک پیدا ہوتی اور وہ اپنے پورے معاشرہ کا جائزہ لیتی، اور پھر وہ ان خصوصیات و فوائد کو جو مسلمانوں کے ان چیزوں سے بچنے سے حاصل ہوتے ہیں، دیکھ کر خود وہ ان رسوم کو چھوڑتے، معلوم ہوتا کہ مسلمانوں کے اس ملک میں آنے سے ایک معاشرتی انقلاب آ گیا، تہذیبی انقلاب ہو گیا، مگر افسوس ہے کہ بجائے اس کے ہم انکو دیتے، ہم نے ان سے لیا، ایک ایک چیز کی تاریخ بتائی جاسکتی ہے، اگر معاشرہ کی تاریخ پر کوئی کتاب لکھی گئی ہوتی تو آپ کو اس سے پتہ چل جاتا کہ فلاں رسم فلاں طبقہ سے لی گئی ہے، اور فلاں رسم فلاں زمانے سے رائج ہوئی ہے، سب کی تاریخ مل جاتی، آغاز کی تاریخ مل جاتی۔

ہماری اس کانفرس کی (مجھے معاف کیا جائے) یہ ایک امانت ہے یا عطیہ ہے، اور اس کا ایک نشان اور شعار ہے، جس کو آپ لے کر جائیں، یہ دو آیتیں ہیں، "يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّة ص وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ" جو لوگ عربی کا ذوق رکھتے ہیں، وہ محسوس کریں گے کہ اِن الفاظ میں بھی کتنا زور اور بلاغت ہے، یہ کھلا اعجاز قرآنی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ جلال الٰہی بھی

شامل ہے، میں عربی کے طالب کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ بالکل الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے، اگر ایسا نہ کروگے تو اللہ کے غضب سے ڈرو، اور اللہ کی طرف سے بے برکتی پر ڈرو، اور بُرے نتائج سے ڈرو، "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ص وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ" اس سے اور صاف بات کیا کہی جاسکتی ہے۔

اور دوسری طرف فرمایا: "اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ" کیا جاہلیت کے رسم ورواج کو چاہتے ہیں، کیا جاہلیت کے ترجیح وانتخاب کو چاہتے ہیں، جاہلیت کے فیصلہ کو چاہتے ہیں، میں نے عرض کیا کہ حکم کے معنی صرف فیصلہ کے نہیں، بلکہ ترجیح واختیار کے بھی آتے ہیں، یعنی آدمی کسی چیز کو اختیار کرتا ہے جو قوت محرکہ ہوتی ہے، جو اس کی دلیل ہوتی ہے، وہ بھی اس کے اندر شامل ہوتی ہے، کیا جاہلیت کا فیصلہ قبول کریں گے، جاہلیت نے جس چیز کو ترجیح دی ہے، اختیار کیا ہے، اس کو اختیار کریں گے، اس پر چلیں گے، یہ جائز نہیں۔

اب آپ حضرات یہاں سے عزم کرکے جائیں، یہ ارادہ کرکے جائیں کہ ہمارے گھر میں یہ ہرگز نہ ہوسکے گا، آپ اپنے دل میں قسم کھالیں کہ اب خلافِ شریعت رسوم یہاں گھر میں، ہمارے یہاں، ہمارے خاندان میں ادا نہیں کی جائیں گی، یہ ظلم نہیں ہوگا کہ جہیز کا زبردست مطالبہ کیا جائے، خدا کی پناہ، خدا کی ذات حلیم ہے، ورنہ میں سچ کہتا ہوں کہ ایک بیاہی ہوئی لڑکی کو جو ابھی بیاہ کر آئی ہے، ارمانوں کے ساتھ آئی ہے اور بڑی امیدوں کے ساتھ اس کو رخصت کیا گیا ہے، اعزاز کے ساتھ اس کا استقبال کیا گیا ہے، صرف اس جرم میں کہ وہ دس ہزار روپے نہیں لائی ہے اس کو مار ڈالا جاتا ہے، میں نے ایک اخبار میں پڑھا دہلی میں ایک دلہن

آئی اور اس کے گھر والوں سے دس ہزار روپے کا مطالبہ کیا گیا تھا وہ نہیں لائی، اس کو جلا دیا گیا اور اس کا خاتمہ کر دیا گیا اگر اس پر زلزلہ آجائے، اللہ محفوظ رکھے اور ان الفاظ کو نہ پکڑے، اس پر زلزلہ آئے، اس پر بجلی گرے اس پر کوئی دوسری قوم آکر حملہ کرے کوئی تعجب کی بات نہیں، اللہ کو اپنی مخلوق عزیز ہے، اور ایسی عزیز ہے" اِنَّهُ بِكُمْ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ" وہ تمہارے ساتھ رؤف بھی ہے اور رحیم بھی ہے، پھر اس کی پالی ہوئی، پھر مرضوں سے بچائی ہوئی اور بڑے ناز و نعم کے ساتھ رکھی ہوئی ایک جان آپ کے یہاں آتی ہے، اور بڑے ارمانوں کے ساتھ آتی ہے، اور آپ مانگ کر لاتے ہیں، خوشامد کر کے لاتے ہیں دس ہزار کی وجہ سے، لعنت ہو ایسے دس ہزار روپے پر، جس کی وجہ سے کسی انسان کی جان جائے، ڈرنا چاہئے اللہ کے غضب سے، ایک جان اللہ کو تمہارے کروڑوں روپے اور تمہاری سلطنتوں سے زیادہ عزیز ہے، آدم علیہ السلام کو کس پیار و محبت کے ساتھ پیدا کیا گیا، ان کا فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا، اس آدم کی اولاد کے ساتھ آپ کا یہ معاملہ ہے۔

یہی میں فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں کہتا ہوں، کسی کمہار کے یہاں جا کر تم ایک گھڑا توڑ کر دیکھو، وہ تمہارا سر توڑ دے گا، اور اللہ کی مخلوق اتنی بھی قیمت نہیں رکھتی کہ تم انسانوں کے سر توڑو، انسانوں کی جان نکالو، ایک نہیں، پچاسوں، سیکڑوں، ہزاروں، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہماری مسرتوں کی تقریبات میں داخل ہو گئی ہیں، اور وہ چیزیں غضب الٰہی کو بلانے والی ہیں، تو پھر کیسے ان مسرتوں کی تقریب میں برکت ہو، کیسے اللہ کی نصرت ان کے ساتھ شامل ہو، اور پھر نسل میں بھی وہ دین منتقل ہو، اور وہ خصوصیات منتقل ہوں۔

بس حضرات! اگر میں نے حدود سے تجاوز کیا اور میری زبان سے سخت لفظ نکلے تو میں اللہ سے معافی مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں، اور آپ سے بھی معافی چاہتا ہوں، مگر کوئی وقت ایسا ہوتا ہے اور اس کی مثالیں ہمیں رحمۃ للعالمین کی سیرت میں بھی ملی ہیں کہ کسی وقت ایسے سخت لفظ بھی بول دیئے جاتے ہیں" من تعزی علیکم بعزاء الجاهلیة" اس کے معنی اگر آپ کسی عالم سے پوچھیں تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں جو تمہارے سامنے جاہلیت (خلاف اسلام) کا نعرہ لگائے اس کے کسی فعل یا رواج کی تحسین کرے تو تم سخت لفظ استعمال کرو اور ذرا بھی رعایت، اشارہ اور کنایہ سے کام نہ لو، کون کہہ رہا ہے، وہ رحمۃ للعالمین فرمارہے ہیں، اور جو سر لپا رافت و رحمت ہیں وہ یہ کہہ رہے ہیں، مثال نہیں مل سکتی، اس سے آپ اندازہ کیجئے کہ جاہلیت کو، جاہلی زندگی کو، جاہلیت کے معیاروں کو، جاہلی دعوتوں کو کس نظر سے خدا نے بھی دیکھا ہے، اور اس کے رسول نے بھی دیکھا ہے، وہ چیزیں اپنے گھروں میں آئیں، ہماری معاشرت کے جزء بن جائیں، ہمارے واجبات و فرائض میں داخل ہو جائیں، جہیز اتنا لاؤ، شادی دھوم دھام سے ہوگی، نہیں مسجد میں جایئے اور کسی عالم سے نکاح پڑھوالیجئے، ہم نے تو نکاح دیکھے ہیں، عصر کی نماز ہوئی، کہدیا گیا کہ ایک نکاح ہوگا، قریب ترین عزیزوں میں بھی سب کو نہیں معلوم، اور وہیں کے ایک عالم کھڑے ہو گئے، انہوں نے خطبۂ مسنونہ پڑھا ایجاب و قبول کرالیا، اور چلے گئے، یہاں سے آپ عہد و ارادہ اور عزم کر کے جائیں کہ اپنے گھر میں یہ نہ ہونے دیں گے، اور حتی الامکان آپ ان تقریبات میں باعث رونق اور باعث فخر نہیں بنیں گے، یہاں تو یہ ہوتا ہے، شرعی مجبوری کی بات الگ

ہے، لیکن آپ ان عزیزوں اور خاندان والوں کو محسوس کرائیے، محلّہ والوں کو آپ محسوس کرائیے کہ یہ خلافِ شریعت ہے، یہ خلافِ شریعت بھی ہے، اور خلاف عقل بھی ہے، اور خلافِ مصلحت بھی ہے، یہاں سے ارادہ کر کے جائیں۔

ائمہ مساجد جو یہاں تشریف رکھتے ہیں یا معلّمین اور علمائے کرام، مدرسین، ان سے کہوں گا کہ یہاں سے جانے کے بعد مسجدوں میں تقریریں کریں، اور اس پر وعظ کہیں، اور دوسرے جو جلسے ہوتے ہیں، ان میں بھی وعظ کہیں، اور پورے ہندوستان میں اصلاح معاشرہ اور اصلاح رسوم کی تحریک چلائیں اللہ مدد فرمائے گا، برکت دے گا اور آپ کو دین کے ایک اہم شعبہ کی تبلیغ اور اس کے احیاء کا جو اجر عظیم ہوگا وہ آپ کو عطا فرمائے گا۔

آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆☆

غیر اسلامی تہذیب واقتدار
کے
مرکزوں میں مقیم مُسلمانوں کی ذمہ داریاں

یہ تقریر ۲۰/ ستمبر ۱۹۹۲ء لندن میں
اسلامی سنٹر کے ایک عظیم مجمع میں دعوت
اسلامی سے تعلق رکھنے والے موضوع پر
کی گئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غیر اسلامی تہذیب و اقتدار
کے
مرکزوں میں مقیم مُسلمانوں کی ذمہ داریاں

بزرگو!

ایک ایسے ملک میں جس میں اسلام ایک محکومانہ مذہب کی حیثیت رکھتا ہو اور مغربی اقدار اور غیر اسلامی طرز معاشرت کی بالادستی ہو اور جس میں ذاتی منافع اور سیاسی و جماعتی فائدوں ہی کو سب کچھ سمجھا جاتا ہو اور لذت کو ایک فلسفہ کی شکل دیدی گئی ہو، جس میں تمام تر اعمال و اخلاق اور کاوشوں کا محور اسی کو سمجھا جانے لگا ہو، ایسے ملک میں مسلمانوں کی (جب کہ وہ وہاں اقلیت میں ہوں) بہت ہی نازک ذمہ داری ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ان میں غیر متزلزل ایمان ہو، جرأت مندانہ کردار ہو، وہ پوری حکمت عملی سے کام لیں، پھر ان میں اس پیغام و دعوت پر پورا اعتماد ہو جس سے اللہ نے ان کو مشرف فرمایا ہے، یہ بھی ان کے لئے ضروری

ہے کہ ان کا ایک بلند معیار ہو اور وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہونے پائیں، اگر وہ اس بلند معیار پر نہ ہوئے تو اپنی ذات کو اور اپنی قوم کو حقارت کی نگاہ سے، اور مغربی تہذیب کے مقلدوں اور اس کے خوشہ چینوں کی حیثیت سے دیکھیں گے، اس صورت میں وہ کوئی مؤثر اور اہم کردار ادا نہیں کر سکتے جو لوگوں کی توجہ کو مرکوز کر سکے اور کچھ تبدیلی عمل میں لاسکے۔

میں آپ کے سامنے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے آپکے سامنے بات بالکل واضح ہو جائے گی، اور ایک ایسے غیور مسلمان کا کردار بھی آپ کے سامنے آئے گا جس کو اپنی دعوت اور پیغام پر پورا اعتماد تھا اور یہ ظاہری شان و شوکت اور دلفریب مناظر اس کی نظر میں ٹھیکروں سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے اور ظاہری عیش و عشرت پر جینے مرنے والوں اور جاہلی زندگی گزارنے والوں پر اس کو ترس آتا تھا، یہ تاریخ اسلام کے قرن اول کا واقعہ ہے، اس کو میں آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں، اس میں عبرت و نصیحت بھی ہے اور یہ ہمارے لئے سبق آموز بھی ہے۔

ایرانی افواج کا سب سے بڑا قائد جس کو رستم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کو اپنے دبدبہ اور شان و شوکت میں شہنشاہ ایران کے قریب ہی سمجھا جاتا تھا، اس نے لشکر اسلام کے قائد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ کسی ایسے آدمی کو بھیج دیا جائے جو اس مقصد کی وضاحت کرے جو عرب کے صحرا نشینوں اور بدوؤں کو ان متمدن ملکوں تک لے آیا جو تہذیب و تمدن اور عسکری قوت میں نقطۂ عروج پر ہیں اور ملک عرب کو ان سے کوئی نسبت نہیں۔

اب غور کیجئے کہ وہ آدمی جو تخت سیادت و قیادت پر بیٹھا ہوا ہے، اور ایک

بڑے رقبہ پر اس کی حکومت ہے، اس کا عربوں کے بارے میں کیا تاثر ہوگا جو خیموں اور کچے مکانات میں بود وباش رکھتے تھے، اور جن کا گزارہ کھجور اور اونٹ کے گوشت پر تھا، وہ کس لاپرواہی اور حقارت کی نگاہ سے عربوں کی طرف دیکھتا ہوگا، اس نے کہلوایا کہ کوئی ایسا آدمی بھیج دیا جائے جو اس مقصد و محرکات کی ترجمانی کردے جو ان کو یہاں لائے ہیں۔

یہ اسلام کا معجزہ ہے کہ اس نے تمام عربوں کو فکر و عقیدہ و ایمان باللہ اور مقصد اسلام پر ناز و فخر کے ایک بلند اور بالا معیار پر پہونچا دیا تھا، حضرت سعد ابن ابی وقاص ؓ نے حضرت ربعی بن عامر ؓ کا انتخاب فرمایا یہ حضرت ربعی بن عامر ؓ جن سے اکثر علمائے تاریخ وسیر ناواقف ہیں، ان کو لشکر اسلامی میں کوئی شان امتیازی بھی حاصل نہ تھی، میں آپ کے سامنے یہ قصہ کوئی افسانہ کے طور پر نہیں بیان کر رہا ہوں کہ جس میں صرف وقتی مزہ ہے یا قومی فخر و عزت کا سامان ہے، مین اس لئے آپ کے سامنے اس قصہ کا ذکر کر رہا ہوں تاکہ آپ اس طاقتور ایمان واعتماد کا جس نے ایرانی لشکروں کے قائد اعظم رستم کے سامنے اس جرأتمندانہ اور آزادانہ گفتگو پر آمادہ کیا، کچھ اندازہ کرسکیں اور مؤمن کے کردار، جرأت و عزم اور ایمانی قوت کا، مغربی تہذیب و ترقی، اقتدار و غلبہ کے بارہ میں اپنے موقف اور کردار سے موازنہ کرسکیں، یہاں ہمارا اپنے آپ کے ساتھ اپنے پیغام کیساتھ اور اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے اور مغربی تہذیب جو یہاں رائج ہے اور جس کو اس وقت معاصر دنیا میں سیادت و قیادت کا مقام حاصل ہے اس کی طرف ہم کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

حضرت ربعی بن عامر ؓ رستم کے دربار میں تشریف لائے، ان کے لباس میں پیوند لگے ہوئے تھے، معمولی سی تلوار اور ڈھال ان کے ساتھ تھی، ایک

معمولی اور پست قد و قامت گھوڑے پر سوار تھے، اسی حال میں قالینوں کو روندتے ہوئے تشریف لائے، پھر گھوڑے سے اترے وہیں کسی تکیہ سے اس کو باندھ دیا اور رستم کی طرف بڑھنے لگے، ہتھیار ان کے ساتھ تھے، زرہ میں ملبوس تھے، اور سر پر خود تھا، خدم و حشم اس پر معترض ہوئے اور کہنے لگے ہتھیار اتار دو، حضرت ربعی بن عامرؓ نے فرمایا، میں خود تمہارے پاس نہیں آیا، تمہاری دعوت پر آیا ہوں، اگر اسی حال میں جانے دیتے ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ میں واپس جاتا ہوں، رستم نے کہا کہ آنے دو، حضرت ربعیؓ اپنے نیزہ کو ان ریشمی قالینوں پر ٹیکتے ہوئے آگے بڑھے حتیٰ کہ ان میں اکثر قالین پھٹ گئے۔

ربعیؓ رستم کے پاس پہنچے، رستم نے پوچھا کہ عرب کس مقصد سے یہاں آئے ہیں؟ انہوں نے پورے ایمان و یقین کے ساتھ جو ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا تھا، اور بھر پور اعتماد کے ساتھ جس نے ان کے اعصاب کو مضبوط بنا دیا تھا، اس لئے کہ ان کی پشت پر جو چیز کار فرما تھی وہ آسمانی کتاب تھی، نبوت صادقہ تھی، غیر متزلزل اور پختہ عقیدہ تھا، بلند ہمت تھی، اور تیر بہدف نگاہ تھی، انہوں نے فرمایا: ہم کو اللہ نے اس لئے بھیجا ہے، تاکہ ہم ان لوگوں کو جن کو اللہ چاہے بندوں کی غلامی سے نکال کر خدائے واحد کی غلامی میں لے آئیں، دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعت میں لائیں اور مذاہب کے جور و ستم سے نکال کر اسلام کا عدل و انصاف عطا کریں۔"

بزرگو اور دوستو! اسلام کے پیغام و دعوت اور اس کے بنیادی مقصد کے بارہ میں حضرت ربعیؓ نے جو فرمایا اس پر کامل یقین کے ساتھ اور جو انہوں نے

لوگوں کو اللہ کی بندگی کی طرف لانے اور دوسرے مذاہب کے جور و ستم سے نکال کر اسلام کے عدل و انصاف کی راہ دکھانے کا ذکر فرمایا اس پر کوئی حیرت و استعجاب نہیں ہوتا کہ یہ ان کے عقیدہ اور یقین کی بات تھی، لیکن مجھے ان کے اس جملہ پر بڑی حیرت و استعجاب ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ ہمیں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ "دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعت کی طرف لائیں" اگر وہ دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی وسعت میں لانے کا ذکر فرماتے تو مجھے ادنیٰ تعجب نہ ہوتا، اس لئے کہ یہ تو ایسی حقیقت ہے، جس پر ہر مسلمان اور صاحب ایمان یقین رکھتا ہے، اور حضرت ربعیؓ کا واقعہ تو قرنِ اول کا ہے، میں ان کے اس جملہ پر غرق حیرت ہو جاتا ہوں کہ ہم تم کو دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا وسعتوں میں لانا چاہتے ہیں، گویا کہ وہ فرما رہے ہیں ہم نے اپنے اوپر ترس کھا کر اور ان ملکوں کے عیش و عشرت کی طمع میں اپنے وطن کو ترک نہیں کیا، ہم تو یہاں تم پر ترس کھا کر آئے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ تم کو تنگ و تاریک قید خانے سے آزاد کریں جس میں تم اس پرندہ کی طرح زندگی گزار رہے ہو جس کو کسی ظرف یا قفس میں بند کر دیا جاتا ہے، اور دانہ اور پانی اسی کے اندر دے دیا جاتا ہے، اس لئے کہ تم اپنی عادتوں اور ضرورتوں کے غلام ہو، خواہشات نفس کے غلام ہو، مروجہ فیشنوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے، تمہارے لئے تنہا ایک لحہ گزارنا مشکل ہے، تم اپنی مرضی کے مطابق کوئی کام نہیں کر سکتے، تم کو قدم قدم پر خادموں اور معاونوں کی ضرورت ہے، پہرہ داروں اور چوکیداروں کی ضرورت ہے، کوئی کام بھی تم بغیر کسی مددگار کے انجام نہیں دے سکتے۔

تاریخی شواہد موجود ہیں کہ جب شاہ ایران یزدگرد اپنی مملکت سے فرار ہوا تو درمیان سفر اس کو پیاس لگی، ایک گھر میں داخل ہوا، اس کو ایک معمولی روزمرہ

کے استعمال کے گلاس میں پانی دیا گیا تو اس نے کہا کہ میں اس گلاس میں پانی نہیں پی سکتا، اس لئے کہ وہ تو سونے اور چاندی کے گلاس میں پانی پینے کا عادی تھا، ایرانیوں کا تو یہ حال تھا کہ اگر ان میں کوئی بڑا آدمی ایک لاکھ درہم سے کم کا تاج پہنتا یا اسکے پاس عالی شان محل اور کے لوازمات حوض و فوارہ اور باغات نہ ہوتے تو اس کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا۔

گویا کہ حضرت ربعیؓ یہ فرمار ہے ہیں کہ تم تو اپنے خادموں کے خادم اور غلاموں کے غلام ہو اسلئے کہ ان سے زیادہ تم ان کے محتاج ہو، ہماری آرزو ہے کہ تمہیں اس تنگ و تاریک قید خانہ سے نکال کر وسعت وآزادی کی فضا میں لائیں، ہم یہاں اپنی ضرورت سے نہیں آئے، ہم نے تو یہ دوُر دراز کا سفر تمہاری ضرورت کے پیش نظر کیا ہے، ہمارے لئے اپنے وطن میں کوئی تنگی نہیں وہ صحراء تو بڑا کشادہ اور وسیع ہے، ہم کو تو تمہاری اس غیر فطری اور غیر طبعی معیشت پر بے چینی ہے، جس میں تم مست ہو، یہی بے چینی ہمیں یہاں لائی ہے، ہم لوگ خواہشات پر چلنے والے نہیں ہیں، ہم خاص پوشاک اور راتب کے غلام نہیں ہیں اور نہ خادموں اور حاشیہ برداروں کے محتاج ہیں، ہم صحراء میں آزادی کی زندگی گزارنے والے ہیں، جو میسر آتا ہے کھاتے ہیں اور شکر کرتے ہیں، ہم کو تو اللہ نے اس لئے بھیجا ہے کہ جس کو وہ چاہے اس کو ہم لوگوں کی غلامی سے نکال کر ایک اللہ کی غلامی میں لے آئیں، دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعت عطا کریں، اور مذاہب کے جَور و ستم سے آزاد کرا کے اسلام کے عدل وانصاف سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیں، تم مذاہب کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہو جس کے نتیجہ میں مصیبتوں میں گرفتار ہو، ذلت وخواری تمہارا مقدر بنی ہوئی ہے، اور حقیقی سکون وراحت تم کو نصیب نہیں ہے۔

میرے بھائیو اور دوستو! میں طوالت دینا نہیں چاہتا، آپ کی بھی ذمہ داریاں اور مشغولیتیں ہیں، میں آپ سے مختصراً کہتا ہوں، آپ یہاں آزادانہ مؤثر اور بنیادی کردار ادا کریں، آپ کی زندگی مثالی زندگی ہو، جو لوگوں کی نگاہیں پھیر دے اور توجہ مرکوز کردے، ذہنوں میں ایسے سوالات پیدا ہوں جو موازنہ کرنے پر مجبور کریں، اور اسلام کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کا داعیہ پیدا ہو، اگر آپنے بھی مغربی طرز معاشرت اختیار کرلیا، آپ انہی کے مقلد بن گئے، اور اپنے بلند معیار سے اپنے کو نیچے گرالیا تو آپ میں اور یہاں کے مغربی باشندوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہ سکتا اور نہ ان میں معلومات کا شوق اور غور و فکر کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ آپ کا احترام انکے دل میں آسکتا ہے، چہ جائیکہ وہ آپ کو قابل تقلید و نمونہ سمجھیں۔

لیکن جب آپ ان کے سامنے ایک نامانوس طریقۂ زندگی پیش کریں گے تو اس سے ان کے اندر ایک جستجو پیدا ہوگی، اور وہ آپ سے پوچھنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ طریقۂ زندگی آپ نے کہاں سے اخذ کیا اور یہ بلند و بالا اقدار اور اخلاق فاضلہ آپ نے کس سے سیکھے، ان میں اشتیاق پیدا ہوگا کہ ان کو آپ ایسا لٹریچر دیں جس سے وہ اسلام سے متعلق مستند معلومات حاصل کریں، اور آپ ان کو رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ سے روشناس کرائیں اور ان کو وہ راستہ دکھائیں جس پر چل کر آپ کے اندر یہ قدریں پیدا ہوئیں اور یہ بلند کردار آپ کو حاصل ہوا، اس وقت وہ آپکو احترام و عقیدت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

مسلمان بھائیو اور یہاں کے باشندو! (خواہ وہ یہاں کے نیشنل ہوں یا کچھ مدت کے لئے آئے ہوں) ایسا نمونۂ زندگی پیش کیجئے جو ان میں اسلام کے مطالعہ

کا شوق پیدا کردے اور اس راستہ کو جاننے کا اشتیاق پیدا کردے جس پر چل کر یہ طرزِ زندگی اور طریقۂ فکر ہم کو عطا ہوا، یہی تنہا وہ انقلاب انگیز راستہ ہے، جس پر چل کر آپ ان غیر اسلامی ملکوں میں مؤثر کردار ادا کرسکتے ہیں، اگر آپ ان ہی کے رنگ میں رنگ گئے اور وہی طریقۂ زندگی اختیار کرلیا، (خواہ یہ احساس کمتری اور نقالی کا جذبہ عالم عربی میں ہو یا ہندوستان یا افریقہ کے کسی حصہ میں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں) آپ ہرگز ان پر اثر انداز نہیں ہوسکتے اور کوئی تبدیلی عمل میں نہیں لاسکتے خواہ سو سال یا اس سے زیادہ مدت تک وہاں قیام اور زندگی گزارنے کا موقع ملے۔

آخر میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے سکون و اطمینان کے ساتھ تقریر سنی اور اگر مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔

☆☆☆☆

امتِ مسلمہ کا فرض منصبی

اور

اس کے انقلابی اثرات

یہ تقریر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے اسلامی فاؤنڈیشن پارک فیلڈ لسٹر شائر برطانیہ میں ۱۸/ستمبر ۱۹۹۲ء کو کی، جس میں اس شہر اور قرب و جوار کے مقامات کے چیدہ اور منتخب حضرات شریک ہوئے تھے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امتِ مسلمہ کا فرض منصبی
اور اس کے انقلابی اثرات

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم

حضرات!

میں قرآن مجید کا ایک حقیر طالب علم ہوں، اور آپ سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید روزانہ پڑھا جاتا ہے اور حسب توفیق بار بار اور زیادہ سے زیادہ پڑھا جاتا ہے، قاعدہ یہ ہے کہ جب آدمی کسی چیز کو حیرت سے دیکھتا ہے، اور اس سے وہ متعجب ہوتا ہے تو اسکا یہ تعجب ہمیشہ قائم نہیں رہتا، وہ زائل بھی ہو جاتا ہے، لیکن میں اپنا حال آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں (اسی سے میں نے اپنی بات کہنے کا مضمون اخذ کیا ہے) کہ جب میں قرآن مجید میں سورۂ انفال کی یہ آیت کریمہ پڑھتا ہوں "اِلَّا تَفْعَلُوْہُ تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ کَبِیْرٌ" (تو مومنو! اگر تم یہ کام نہ کروگے تو ملک میں فتنہ برپا

ہو جائے گا اور بڑا فساد مچے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان مہاجرین اور انصار کو مخاطب فرمایا ہے، جو مشرف بہ اسلام تھے، جہاں تک ان مہاجرین کا تعلق ہے جو مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آئے تھے، وہ چند سو کی تعداد میں تھے، آپ جانتے ہیں کہ ہجرت کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے، ہجرت میں آدمی کو گھربار چھوڑنا پڑتا ہے، اعزہ واقرباء سے دُور ہونا پڑتا ہے اور ان سہولتوں کو خیرباد کہنا پڑتا ہے، جو موروثی اور مقامی طور پر اس کو حاصل ہوتی ہیں، ظاہر ہے کہ ان مہاجرین کی تعداد محدود تھی، اور جن لوگوں نے مدینہ طیبہ میں اسلام قبول کیا تھا ان کی تعداد بھی اس وقت تک کچھ زیادہ نہ تھی، حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کے حکم سے تین مرتبہ مسلمانوں کو شمار کیا گیا، پہلی مرتبہ شمار کرنے میں مسلمانوں کی تعداد پانچ سو، دوسری مرتبہ چھ سو، سات سو کے درمیان تھی، تیسری مرتبہ شمار میں مسلمان ڈیڑھ ہزار تھے، اس تعداد پر مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اطمینان کی سانس لی کہ اب ہم ڈیڑھ ہزار ہو گئے، اب ہمیں کیا ڈر ہے؟ ہم نے تو وہ زمانہ دیکھا ہے جب ہم میں سے کوئی اکیلا نماز پڑھتا تھا، پھر بھی دشمنوں کا ڈر لگا رہتا تھا۔

گویا یہ مٹھی بھر انسانوں کی آبادی تھی جس نے اسلام قبول کیا تھا، اور جس نے اس کی ذمہ داری قبول کی تھی کہ اس کے چاروں طرف انسانی آبادی کا جو سمندر پھیلا ہوا ہے، اس میں وہ ہدایت و تبلیغ کا کام کرے گی اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ساری دنیا میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جنہوں نے اسلام کا نام بھی نہیں سنا تھا، قبول کرنے کا کیا ذکر؟ پھر اس وقت دنیا کی دو عظیم الشان سلطنتیں تھیں جن کو (EM-

(PIRE کہنا چاہیے، وہ صرف امپائر ہی نہیں تھیں، اور ان کی حیثیت محض انتظامیہ اور حکومت ہی کی نہیں تھی، ان کے ساتھ مستقل تہذیب تھی، مستقل تمدن، طرز زندگی اور معیار و اقدار (IDEALS & VALUES) تھے، متمدن دنیا کا سب سے بڑا حصہ جس پر یہ دونوں شہنشاہیاں بلاواسطہ یا بالواسطہ قابض تھیں، وہیں سے وہ تہذیب لیتے تھے، وہیں سے فیشن اخذ کرتے تھے، وہیں سے قانون لیتے تھے، آپ کو معلوم ہے کہ (ROMAN LAW) دنیا میں کتنی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اور ایرانی تہذیب ہندوستان اور دُور دراز ملکوں تک پہنچ گئی تھی۔

حضرات! میں جب اس آیت پر پہنچتا ہوں تو ہمیشہ تصویرِ حیرت بن کر رہ جاتا ہوں، سوچنے لگتا ہوں کہ یا اللہ یہ کس سے کہا جارہا ہے، کب کہا جارہا ہے اور کہاں کہا جارہا ہے؟ یہ آخری مسلم شماری جس میں مسلمان ڈیڑھ ہزار نکلے، بعض شراح حدیث اور محققین کی تحقیق میں جنگ احد کے موقعہ پر ہوئی جو ۳ھ میں پیش آئی اور بعض کے نزدیک جنگ خندق (جس کو غزوۃ الاحزاب بھی کہا جاتا ہے) کے موقعہ پر ہوئی جو ۵ھ میں پیش آئی اس طرح یہ مدت زیادہ سے زیادہ پانچ سال کی ہوتی ہے، جس میں مسلمانوں کے شمار کرنے کا یہ کام ہوا اس طرح یہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو ہزار مسلمان تھے جن سے کہا جارہا ہے کہ تم اپنی شیرازہ بندی کرو اور ایک نئی وحدت (UNIT) قائم کرو، جس کی اساس ایمان پر ہو، قرآن پر ہو، صحیح عقیدہ پر ہو اور وہ آنحضرت ﷺ کی سرپرستی میں ہو۔

یہ وحدت اس لئے قائم کرنے کے لئے کہا جارہا ہے کہ تم اس وحدت کے ذریعہ دنیا میں اسلام کا پیغام پہنچاؤ اور دنیا کو "جاہلیت" (من مانی آزادی اور نفس

پرستی) کی زندگی سے نکال کر دنیا کو اسلام (خدا پرستی اور کامل خود سپردگی) کی دعوت دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو دنیا میں فتنۂ کبریٰ اور فساد عظیم برپا ہوگا۔

میں اس موقع پر سوچتا ہوں کہ جن سے کہا جارہا ہے اور جو اس آیت کے مخاطب ہیں اس میں اور ان پر جس کام کی اور دنیا کی جس آبادی کی ذمہ داری ڈالی جارہی ہے، دونوں میں کیا تناسب تھا؟ لیکن فارسی میں ایک محاورہ ہے، اور ہم اس کو عربی میں بھی ادا کردیا کرتے ہیں کہ "بقامت کہتر و بقیمت بہتر" یعنی قد و قامت کے لحاظ سے چھوٹا لیکن قیمت کے لحاظ سے کہیں بڑا اور بہتر، میں نے اپنی عربی تقریر میں بھی اس کو اس طرح ادا کیا تھا کہ "العبرة بالقيمة لا بالقامة" یہ اس جماعت سے کہا جارہا ہے جو بقامت کہتر تھی لیکن بقیمت بہتر، اصل چیز جو فیصلہ کن ہے وہ "قیمت" ہے "قامت" نہیں چنانچہ اس کہتر قامت اور بہتر قیمت نے اپنی انقلاب انگیزی اور عہد آفرینی ثابت کردی، ایرانی سلطنت کا چراغ گل ہوگیا، صرف سلطنت کا نہیں ایرانی تہذیب کا ان کے معیاروں اور ان کی قدروں (IDEALS & VALUES) کا جو حقیقی طور پر حکومت کرتے اور زندگی کی تشکیل کرتے ہیں، جن کو عربی میں المثل والقیم کہتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دور یا زیادہ سے زیادہ خلافت راشدہ کے اختتام تک دنیا کا متمدن ترین حصہ جو مہذب اور ترقی پسند انسانوں کے لئے نمونہ اور معیار (IDEAL) کا درجہ رکھتا تھا، وہ بدل گیا تھا یا برابر بدل رہا تھا، معیار بدل گئے تھے، سوچنے کے طریقے بدل گئے تھے، ایران اور روم کی ذہنی و فکری غلامی سے آزاد ہورہے تھے، معیار مہذب اور ترقی یافتہ کہلانا، احترام اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا جانا معیار نہیں رہا تھا، حکم خداوندی کی تعمیل او سنت نبوی کی پیروی اور عہد رسالت اور اس کے معتبر نمائندوں سے مشابہت،

تہذیب میں، معاشرت میں، رسوم و عادات میں اور لباس و مظاہر میں تعریف اور قدر کی چیز سمجھی جانے لگی تھی، اس کی مثالیں آپ کو بڑے بڑے دولتمندوں اور بااقتدار لوگوں کی زندگی میں، تاریخ کی کتابوں میں ملیں گی۔

آپ کو معلوم ہے کہ زندگی کے آلات و وسائل تو بدلتے رہتے ہیں، تمدن کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں، لیکن ذلت و عزت کے پیمانے، علم و جہالت کے معیار اور علامتیں، بہت دیر اور بہت مشکل سے بدلتی ہیں، اس میں بعض اوقات صدیاں لگ جاتی ہیں، اگر آپ تہذیب انسانی کی تاریخ پڑھیں تو آپکو معلوم ہوگا کہ بعض پیمانے صدیوں تک حکومت کرتے رہے، لیکن یہاں سوچنے کے طریقے بدل گئے، کرنا تو الگ چیز ہے، کرنے میں تو بہت جلد تغیر آجاتا ہے، لیکن سوچنے کا طریقہ بہت بڑی طاقت ہے، اور وہی زندگی پر حکمرانی کرتا ہے، ہم بھی بہت سے اسلامی ممالک میں دیکھتے ہیں کہ مغربی اقتدار اور تہذیب کے اثر کے پیمانے نہیں بدلے، پیمانوں میں ناپنے والی چیزیں بدل گئیں، عزت و شرافت خوش نصیبی و بد نصیبی، علم و جہالت، ترقی و پسماندگی کے وہی معیار ہیں جو باہر کی حکومت کرنے والی قوموں اور تہذیبوں نے عطا کئے ہیں۔

اب آپ ان حقائق کی روشنی میں دیکھئے کہ کس پر اور کس وقت ساری دنیا میں انقلاب لانے کی اور اس کو خدا پرستی، خدا ترسی انسان دوستی، ایثار و قربانی اور ہدایت ربانی کے راستہ پر چلنے اور چلانےکی عالمگیر ذمہ داری ڈالی جارہی ہے، اور اس ذمہ داری کے ادا کرنے اور اس کے سلسلہ میں کامیابی حاصل کرنے میں اس "بقامت کہتر و بقیمت بہتر" جماعت کو کتنی بڑی کامیابی حاصل ہوئی، اس کے لئے آپ چھٹی صدی عیسوی کے بعد کی مختلف زبانوں (اور خاص طور پر انگریزی) میں

لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ فرمائیے۔

حضرات! میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے اس مرکز (IS-LAMIC FOUNDATION) کے قیام کے لئے صحیح جگہ کا انتخاب کیا، آپ یہاں مغربی تہذیب کے سینہ بیٹھ گئے، اگر یہاں سے یا کسی بڑے مغربی ملک یا مغربی تہذیب کے بڑے مرکز سے انقلاب شروع ہوا تو وہ طاقت میں اور گہرائی میں، وسعت میں بھی اور حجم میں بھی، قابل لحاظ ہوگا، خدا کرے وہ دن آئے کہ ان ملکوں میں بھی لوگوں میں حق کی طلب اور اپنی زندگی کے خلا کا احساس پیدا ہو، اور کہیں کہ آپ ہم کو اس تاریکی کی زندگی، نفس پرستی کی زندگی، اور کوتاہ نظری کی زندگی سے نکالئے، یہاں پر یہ نکتہ یاد رہے کہ قرآن مجید میں تاریکی کے لئے اکثر جمع کا صیغہ "ظُلُمات" آتا ہے اور روشنی کیلئے واحد کا صیغہ "النور" آتا ہے "یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ" وغیرہ وغیرہ، اس سے معلوم ہوا کہ ظلمتیں بے شمار ہیں اور نور ایک ہے، وہ کہیں کہ ہمیں یہ دولت آپ ہی کے یہاں سے مل سکتی ہے۔

اور یہ بات جب ہی حاصل ہوگی جب آپ کی زندگی اور اخلاق میں شان امتیازی ہوگی، میں نے ایک واقعہ آکسفورڈ کی جامع مسجد میں ایک بڑے مجمع میں سنایا تھا، آپ کو بھی سناؤں کہ اس میں ہر مرتبہ ایک نئی لذت محسوس ہوتی ہے، وہ یہ کہ جب حضرت سید احمد شہیدؒ نے پیشاور فتح کیا اور کئی ہفتے گزر گئے، فوج مجاہدین وہاں پڑی ہوئی تھی، تو ایک پٹھان نے ایک ہندوستانی کا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ میاں ایک بات تم سے پوچھتا ہوں، ٹھیک ٹھیک بتانا، اس نے کہا کہ کہئے، اس نے کہا کہ کیا تم ہندوستانیوں کی دور کی نگاہ کمزور ہوتی ہے، تم دور کی چیز نہیں دیکھ سکتے؟ فوج

مجاہدین کے اس سپاہی نے کہا نہیں ہم خوب دیکھتے ہیں، اور دیکھ رہے ہیں کہئے تو آپ کو بتادیں کہ ہمارے سامنے وہ دُور کی چیز کیا ہے؟ اس نے کہا نہیں کوئی بات ضرور ہے، ہندوستانیوں کی دُور کی نگاہ فطری طور پر کمزور ہوتی ہے، ہندوستانی نے کہا مگر آپ یہ بتایئے کہ آپ کو اس کے پوچھنے کی ضرورت کیا آئی؟ وہاں کے پٹھان باشندہ نے کہا کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کئی ہفتہ سے آپ کی فوج یہاں پڑی ہوئی ہے، اور آپ میں سے بعض کئی کئی مہینے سے اور بعض کئی کئی سال سے اپنا گھر چھوڑے ہوئے ہیں، شادی شدہ ہیں یا شادی کی عمر ہے، لیکن ہم نے آپ میں سے کسی کو کسی نامحرم کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہوئے نہیں دیکھا، تو ہم نے کہا کہ ایک ہو دو ہوں تو ہو سکتا ہے، لیکن سب کے سب کیوں نہیں دیکھتے؟ ادھر جوانی ہے ادھر حسن ہے، لیکن کسی کو بد نگاہی کرتے ہوئے نہیں دیکھتے۔

اس ہندوستانی نے جواب دیا کہ الحمد للہ ہم سب کی نظر بالکل ٹھیک ہے، مگر قرآن کی تعلیم ہے۔" قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ" اہل ایمان سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ پھر یہ ہمارے امام کی تربیت کا بھی نتیجہ ہے اس خصوصیت کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ" يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا" اے ایمان والو! اگر تم اللہ کے معاملہ میں تقویٰ واحتیاط کا عمل اختیار کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اندر ایک شان امتیازی پیدا کردے گا۔

اگر آپ نے اس ملک میں رہتے ہوئے زندگی کا ایک نیا ماڈل (MOD-EL) ایک نیا سانچہ اور ایک نیا نمونہ پیش کیا، جس میں یہاں کی زندگی، طرز معاشرت، نفس پرستی اور دولت پرستی اور ہر قسم کی آزادی سے امتیاز ظاہر ہوا، تو

لوگوں کے اندر اسلام کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوگا، وہ آپ کے یہاں آئیں گے اور کہیں گے کہ ہمیں کوئی کتاب دیجئے جس سے ہم سمجھیں کہ اس انقلاب کا سرچشمہ کہاں ہے؟ کہاں سے یہ تبدیلی آئی اور آپ میں امتیاز پیدا ہوا؟

میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری حقیر ذات اور میرے رُفقاء کا اعزاز کیا، خاص طور پر ڈاکٹر خورشید احمد صاحب اور مناظر احسن صاحب اور سب حضرات اور اس ادارہ کے ذمہ داروں کا کہ آپ نے ہمارے ساتھ برادرانہ ہی نہیں کریمانہ اور فیاضانہ سلوک کیا، اللہ تبارک و تعالیٰ توفیق دے کہ یہ مرکز زیادہ سے زیادہ ہدایت اور نفع کا سرچشمہ بنے، اللہ وہ دن ہمیں دکھائے کہ جیسے پہلے اس ملک سے دنیا پرستی اور نفس پرستی اور مادیت کی ہوا چلی تھی، الحاد اور لادینیت کا رُجحان پیدا ہوا تھا ویسے ہی اب ایمان کی، اخلاق کی انسانیت اور شرافت کی اور ہدایات کی ہوا چلے۔

آخر میں اقبال کے ان چند اشعار پر اس خطاب کو ختم کرتا ہوں، جو اس مقام و ماحول، عہد و زمانہ، اور مسلمانوں کے مقام و پیغام سے بھی خاص مناسبت رکھتے ہیں۔

ناموس ازل را تو امینی تو امینی   دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی   صہبائے یقیں در کش و از دیر گماں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

فریاد ز افرنگ و دلآویزیٔ افرنگ   فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ   معمار حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

سیرت نبویؐ
اور
عصر حاضر میں اس کی معنویت وافادیت

یہ تقریر ۲۱/ جون ۱۹۸۰ء کو بعد نماز عصر بمبئی کی ایک قدیم و کارگزار انجمن "انجمن اسلام" کے ایک وسیع و عریض ہال میں علم دوست احباب کے ایک عظیم مجمع کے سامنے "عصر حاضر میں سیرت نبویؐ کی اہمیت و معنویت اور منصب نبوت" کے عنوان پر کی گئی تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سیرت نبویؐ

اور

عصر حاضر میں اس کی معنویت وافادیت

حضرات!

عام مسلمانوں کے لئے مجموعی طور پر اور اہل بمبئی کیلئے خصوصی طور پر یہ بڑی مسرت، شکر اور فخر کا موقع ہے کہ سیرت نبوی ﷺ پر خطبات کا آغاز ہو رہا ہے میں اپنی محدود واقفیت اور مطالعہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ سیرت نبویؐ پر سب سے زیادہ ٹھوس، سنجیدہ فکر انگیز اور معیاری کام ہمارے ملک ہندوستان میں انجام پایا ہے، ہم ہندوستانی مسلمانوں کو اس بات پر شکر آمیز فخر کا حق ہے کہ وہ نبی رحمت ﷺ جس کے متعلق قرآن شریف اعلان کرتا ہے۔" قُلْ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا" جو مکانی حیثیت سے پورے کرۂ ارض اور زمانی حیثیت

سے بعثت کے بعد سے پوری انسانی تاریخ کا نبی ہے، اس کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو عصر جدید کے اسلوب اور تقاضوں کے مطابق روشن کرنے کی سب سے بڑی سعادت ہندوستانی مسلمانوں کو حاصل ہوئی، قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوریؒ کی "رحمۃ للعالمین"، علامہ شبلی نعمانیؒ کی.......... کتاب "سیرۃ النبی" مولانا عبد الرؤف دانا پوری کی کتاب "اصح السیر" سیرت کے عالمگیر کتب خانے میں امتیازی شان رکھتی ہیں، لیکن اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے شاید سب سے فائق، استاد محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کی "خطباتِ مدارس" ہے، دنیا کے مسلمان جو زبان بولتے ہیں، ان میں ان کتابوں کی کوئی نظیر نہیں، مختلف اسلامی زبانوں اور متعدد مغربی زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے ہیں۔

بہت سے حضرات یہ خیال کرتے ہوں گے کہ سیرت النبیؐ کی خدمت کا شرف جس ادارے کو حاصل ہوا، اس سے انتساب رکھنے والے فرد کے لئے اور خاص طور پر اگر اس کے قلم سے بھی کوئی کتاب سیرت پر نکلی ہو، بہت آسان ہے کہ وہ سیرت پر گفتگو کرے اور سیرت نبویؐ کو پیش کرے، لیکن ایک مصنف کے تجربے کی روشنی میں، میں یہ کہتا ہوں کہ یہ بات سہولت کی باعث نہیں، بلکہ دشواری کی باعث ہے، اس لئے کہ جس کو سیرت پر قلم اٹھانے کی سعادت حاصل ہوئی وہ کسی ایسے ادارے سے تعلق رکھتا ہے، جس سے سیرت پر بلند ترین اور منتخب ترین لٹریچر شائع ہوا، اس کا معاملہ سیرت نبویؐ کے بارے میں وہی ہے جس کو فارسی شاعر نے اپنے مشہور شعر میں بیان کیا ہے ؎

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

گلچین بہار تو، ز داماں گلہ دارد

وہ سوچتا ہے کہ وہ اس مقدس داستان کو کہاں سے شروع کرے اور کہاں ختم کرے، اور کس چیز کو لے اور کس چیز کو چھوڑ دے، جس طرح کہ گلچیں کے لئے دشواری ہے کہ وہ کس پھول کو لے اور کس پھول کو چھوڑ دے، اور پھر اس دامن کو جو بہت محدود اور تنگ ہے، اس چمن کے پھولوں سے کس طرح سجائے، بالکل اسی طرح کی آزمائش آج میرے لئے بھی ہے، میں یہ کوشش نہیں کروں گا کہ آپکے سامنے سیرت نبوی کو اول سے آخر تک سبق کی طرح سنادوں، آپ حضرات اہل علم ہیں اور آپ کی نظر سے سیرت کی کتابیں گزر چکی ہیں، اور گزرتی رہتی ہیں، میں اپنی سب سے بڑی سعادت یہ سمجھوں گا کہ آپ کے دلوں میں سیرت کے مطالعے کا نیا شوق پیدا ہو جائے، اور یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ابھی آپ کو بہت کچھ پڑھنا ہے، ابھی آپ نے اس گلستاں کی سیر ہی نہیں کی ہے، اور یہ کہ آپ اس مکتب حسن، اس مکتب عشق، اس مکتب عقل و علم، اس مکتب انسانیت آموزی کے طالب علم ہیں، میں اپنے کو بہت خوش نصیب سمجھوں گا اور آپ کو مبارک باد دوں گا کہ سیرت کے مکتب میں ہمارا اور آپ کا نام لکھ لیا جائے، اس سے بڑھ کر میں ایک مسلمان کے لئے کوئی فخر کی بات نہیں سمجھتا کہ اس کو اس مکتب عشق میں طالب علم بننے کے لئے قبول کر لیا جائے، ہم آج سے سیرت کا مطالعہ کریں گے اور یقین ہے کہ یہ سلسلہ بڑا مبارک ہوگا، اور اس کے بانی صد ہزار مبارک باد کے مستحق ہوں گے، اگر آپ کے اندر یہ جذبہ بیدار ہو جائے کہ اب ہم سیرت کا مطالعہ کریں گے اور ہم یہ سمجھیں گے کہ ابھی ہم نے کچھ نہیں پڑھا ہے۔

میں سب سے پہلے آپ کے سامنے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نبی کیا کام کرتا ہے کہ جس کی وجہ سے اس کو یہ مقام بلند حاصل ہے، جو ذمہ داری اس کے سپرد کی جاتی ہے، اس کی نوعیت کیا ہے؟ اور وہ نوع انسانی کے لئے اتنا کیوں ضروری ہے؟ رواں دواں قافلۂ انسانیت کے سفر کے لئے یہ بات کیوں خطرے کی ہے کہ اس کو اس سفر میں ایک پیغامبر کی رہنمائی حاصل نہیں، میں سب سے پہلے اس پر مختصر روشنی ڈالوں گا پھر یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ نبی کے کام کی نوعیت کیا ہے؟ نبوت کی حقیقت اور اس کا امتیاز کیا ہے اور اس اہم اور مقدس کام کے لئے کس طرح کی شخصیت درکار ہے؟ آنحضرتؐ کو انبیاء کرام کی صف میں اللہ تعالیٰ نے کیا امتیاز عطا فرمایا اور کیا کامیابی آپؐ کے حصے میں رکھی، میں یہ بتانے کے لئے کہ نبوت کا کام ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسانیت کے سفینے کے لئے خطرہ ہے کہ وہ کس وقت ڈوب جائے، وہ کون سی مہم ہے، جو نبی ہی انجام دیتا ہے، اور وہ کون سا خلاء ہے جو وہ تنہا پُر کرتا ہے اس کے لئے میں ایک کہانی کا سہارا لوں گا، اور آپ جانتے ہیں کہ بعض اوقات کہانیوں سے بہت سے ایسے عُقدے اور ایسی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں جو بڑی بڑی فلسفیانہ بحثوں سے نہیں سلجھتیں، خاص طور پر جب وقت کم ہو اور آدمی زیادہ گہرائی میں نہ جانا چاہے۔

آپ نے یہ کہانی سنی ہو گی کہ کچھ نوجوان کو سیر کا خیال آیا، وہ دریا کے قریب کسی بستی کے رہنے والے تھے، برسات کا موسم تھا، سہانا وقت تھا، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، اور فرصت کے دن تھے، ان کو شوق ہوا کہ وہ دریا کی سیر کریں اور موسم کا لطف اٹھائیں، ایک کشتی انہوں نے کرائے پر لی، اس پر سوار ہوئے، دریا بھی روانی پر تھا، اور ان کی طبیعت بھی موج پر تھی، وہ بے تکلفی سے آپس

میں باتیں کرتے تھے، مگر اس وقت انہوں نے ملاح کو اپنا مخاطب بنایا، اس سے پوچھا (چچا یا دادا کہہ کر مخاطب کیا) آپ کی عمر کیا ہے؟ وہ بے چارہ بے پڑھا آدمی تھا، اس نے اپنی عمر بتائی ۶۰ سال کی عمر، ان میں سے ایک نوجوان نے کہا کہ چچا آپ نے کیا کیا پڑھا ہے؟ اس نے کہا کہ میری اوقات کیا؟ میں نے شروع ہی سے کشتی چلانے کا پیشہ اختیار کرلیا، اور مجھے پڑھنے کا موقع نہیں ملا، دوسرے تیز طرّار صاحب زادے بولے کہ چچا! آپ نے جغرافیہ تو ضرور پڑھا ہوگا، ؟ بیچارے ملّاح نے کہا کہ میں نے اس کا نام ہی نہیں سنا، پہلے تو اس کو یہی سمجھنا مشکل ہوا کہ جغرافیہ کسی آدمی کا نام ہے، یا کسی علم کا؟ لوگوں نے کہا کہ اچھا آپ نے ہسٹری تو پڑھی ہوگی؟ پھر اس نے کانوں پر ہاتھ رکھا، پھر ان لوگوں نے جیومیٹری کو پوچھا اور ان کے کالج اور یونیورسٹی میں جو مضامین داخل تھے، ان تمام مضامین کا (SUBJECTS) انہوں نے باری باری سے نام لیا، اور اس بیچارے نے سب پر سر جھکادیا، وہ پشیمان اور شرمندہ ہوا، اس نے کہا کہ صاحب میں نے تو آج تک ایسے نام بھی نہیں سنے تھے، عمر تو پہلے پوچھ لی تھی، کہنے لگے کہ آپ نے اپنی آدھی عمر کھودی ہے، آپ نے کچھ کام کیا ہی نہیں، خیر دریا اس وقت مزے میں تھا، موجیں اٹھ رہی تھیں، اور کہیں بارش بھی ہوئی تھی، اب دریا کی موجیں اس کشتی کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرنے لگیں، اور کشتی ڈانواڈول ہونے لگی، کبھی ادھر جھکتی تھی، کبھی ادھر جھکتی تھی، اب اس ملاح کی بن آئی، خدا کو اس کی عاجزی اور اس کی بے زبانی پر رحم آیا، اب ملاح کی باری آئی، اس نے کہا کہ صاحبزادو! ایک بات میں بھی پوچھتا ہوں کہ تم نے یہ سب کچھ پڑھا ہے، پیرنا بھی سیکھا ہے؟ اگر یہ کشتی الٹ گئی تو تم دریا کے پار کس طرح پہونچوگے؟ انہوں نے کہا کہ پیرنا تو ہم نے نہیں سیکھا ہے! ملاح نے کہا جاؤ تم نے

اپنی پوری عمر ڈبوئی۔

انہوں نے تو یہ کہا تھا کہ تم نے اپنے آدھی عمر کھوئی، اور اس ملاح نے کہا کہ تم نے اپنی پوری عمر ڈبوئی، اگر کہیں کشتی الٹ گئی تو میں ہاتھ پیر مار کر کنارے پہنچ جاؤں گا یہ ندی دریا تو میرا گھر ہے، میں اس کی مچھلی ہوں، مگر تم نے جو بڑے بڑے ڈراؤنے نام لئے تھے (اتنی جلدی جاہل آدمی کو نام یاد نہیں ہو سکتے تھے) وہ آپ کے کیا کام آئیں گے؟ آپ اگر ڈوبیں گے تو ان میں سے کوئی چیز آپ کو نہیں بچا پائے گی، یہاں تو سیدھا سادھا پیرنا کام آئے گا، جس کو پیرنا آتا ہے یا آپ یوں کہہ لیں کہ جس کو پیرنے کی سائنس آتی ہے وہ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی اپنی جان بچا لے گا اور دریا پار کر لے گا، یا کشتی چلانا جس کو آتا ہے، وہ کشتی کنارے لگا دے گا، لیکن اگر سب کچھ آتا ہے اور پیرنا ہی نہیں آتا ہے، زندگی کے اس طوفانی دریا کو جس نے عبور کرنا نہیں سیکھا اور جس نے اسکی موجوں سے جو منہ پھیلائے ہوئے بڑھتی ہیں، بچنے کا فن نہیں معلوم کیا تو اس نے یہ جو کچھ پڑھا ہے کچھ کام نہیں آئے گا۔

حضرات! ہماری اس پوری زندگی کی مثال یہی ہے، ہمارے تمام محسن، انسانی علوم کے بانی، بڑی بڑی کتابوں کے مصنف، دنیا کے دانش ور، فلسفی، حکیم، ریاضی داں اور سائنس داں یہ سب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں، یہاں انجمن اسلام اور اس کے اسکول کے بالکل سایے کے نیچے بیٹھ کر یہ گذارش کر رہا ہوں، ہم ان میں کسی کی تحقیر نہیں کرتے ہیں، خاص طور پر میرے جیسے طالب علم کی گردن ان کے احسانات کے بوجھ سے دبی جا رہی ہے۔ اور میں جو آپ کے سامنے یہ دو حرف کہہ رہا ہوں اس کو بھی ان کا احسان سمجھتا ہوں، لیکن واقعہ اپنی جگہ پر واقعہ ہے، یہ وہ

حقیقت ہے، جس کا اعلان امریکہ کی کسی بڑی یونیورسٹی کی لائبریری میں بھی، لیبارٹری میں بھی، بڑے سے بڑے دانش کدے اور بڑے سے بڑے ایوان علم میں بھی کیا جاسکتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے ادنیٰ غلاموں نے بارہا اس حقیقت کا اعلان کیا ہے اور ببانگ دہل کہا کہ اے دانشورو! علم کو وسعت اور ترقی دینے والو! اے انسانی عقل کے کمالات دکھانے والو! اے زمین کے خزانے کو اگلوا دینے والو! آسمان سے تارے توڑ کر لانے والو! اور اے چاند کی سطح پر پہنچ جانے والو! تم سب خطرے میں ہو، جب تک تم کو شناوری کا یہ علم نہیں آتا اور وہ حقائق اولین جن پر زندگی کی بنیاد ہے، اور یہ انسانی شیرازہ جس کی وجہ سے مجتمع ہے، اور وہ بڑے مقاصد جن کی وجہ سے اس زندگی اور اس دنیا میں معنویت پائی جاتی ہے، اگر ان پر نظر نہیں اور اگر تم نے زندگی گزارنے کا سلیقہ نہیں سیکھا جو تنہا پیغامبر سکھاتے ہیں، وہ بغیر کسی تواضع اور انکساری کے اور بغیر کسی ادنیٰ خوف اور لحاظ کے صاف صاف کہتے ہیں " إِنَّمَآ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰٓ إِلَيَّ " (میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں، فرق مجھ میں اور تم میں یہ ہے کہ میری طرف وحی آتی ہے) زندگی کا سلیقہ کسی نے اگر نہیں سیکھا ہے، اور سب کچھ سیکھ لیا ہے، وہ اگر فرد ہے تو خطرے میں ہے، اگر قوم ہے، تو خطرے میں ہے، اگر تمدن ہے تو خطرے میں ہے، تہذیب ہے تو خطرے میں ہے، علمی مرکز ہے تو خطرے میں ہے، کوئی تجربہ گاہ ہے تو خطرے میں ہے، قیادت کے مقام پر ہے تو خطرے میں ہے، میں نے ایک سیدھی سادی کہانی کا (جو نبوت اور نبیؐ کے مقام سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی) سہارا لیا ہے، آج بھی دنیا کا حال یہ ہے کہ ہمیں اپنی حقیقت کا علم نہیں ہمیں معلوم نہیں کہ زندگی کیا ہے، کتنی وسیع کتنی عمیق، کتنی نازک، کتنی لطیف ہے، زندگی گزارنا کتنی بڑی ذمہ داری ہے، اس

زندگی کے دریا کو عبور کرنے کے لئے اور اپنی کشتی کو پار لگانے کے لئے کن بنیادی حقیقتوں پر ایمان لانے اور ان پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے، ان کی حفاظت کرنے اور ان کو زندہ رکھنے کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ کیسے تعاون کی ضرورت ہے؟ آج ہمارے اس متمدن اور ترقی یافتہ دَور کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کو زندہ رہنے کا فن معلوم نہیں بلکہ معلوم کرنے کی کوئی خواہش بھی اس کے اندر نہیں، پیغمبر خاص انکشافات کے مدعی نہیں ہوتے، وہ ادب اور شاعری کے دعوے دار نہیں ہوتے، وہ بہت بڑی ذہانت، موشگافی، بال کی کھال نکالنے کے مدعی نہیں ہوتے، وہ کہتے ہیں کہ زندگی کے دریا کو پار کرنے کا فن ہم سے سیکھا جاسکتا ہے، اگر تمہیں زندگی عزیز ہے، اور اگر تم انسانوں کی طرح اس دنیا میں رہنا چاہتے ہو، اگر تمہیں اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کرنا ہو، اگر تمہیں خالق کائنات کو صحیح طور پر سمجھنا، اس کا علم حاصل کرنا، اس کو راضی کرنا اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا ہو تو ہم اس کے لئے حاضر ہیں، ہمیں خدا نے اس خدمت کے لئے مامور کیا ہے، نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ، نہ اس میں وہ کسی معذرت سے کام لیتے ہیں، نہ کسی فخر و تعلی سے، بالکل حقیقت پسندانہ اور عملی انداز میں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم کسی چیز کے مدعی نہیں، ہم تم سے یہ کہتے ہیں کہ زندگی گزارنے اور انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا فن ہم سے سیکھو، سب سے پہلے یہ معلوم کرو کہ اس دنیا کو کس نے بنایا اور کس لئے بنایا، تم کہاں سے آئے تھے کہاں جاؤ گے؟ ہم نے مانا کہ تم کو سب کچھ آتا ہے مگر اپنے پیدا کرنے والے اور مقصد زندگی سے غافل ہو تو ان کمالات وترقیات، اور تسخیر کائنات سے کیا حاصل؟ بقول اقبالؔ ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا

زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں گا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

ہم مانتے ہیں کہ تم سورج کی شعاعوں کو گرفتار کر سکتے ہو، چاند پر پہنچ سکتے ہو، تم سمندر کی تہ سے موتی نکال کر لا سکتے ہو، مگر سوال یہ ہے کہ تم کو آدمیوں کی طرح اس سطح زمین پر چلنا بھی آتا ہے؟ کسی مغربی فلسفی نے ایک مشرقی دانشور سے بہت فخر وناز سے کہا کہ آپ کو معلوم ہے ہماری مغربی تہذیب نے کیا کیا کمالات دکھائے ہیں، ہم نے بلند پروازی اور تیز رفتاری کے کیسے کیسے رکارڈ قائم کئے ہیں؟ مشرقی فلسفی نے جواب دیا کہ ہاں تمہیں فضائے آسمانی میں چڑیوں کی طرح اڑنا آگیا اور تمہیں دریا میں مچھلیوں کی طرح تیرنا آگیا، لیکن یہ بتاؤ کہ کیا تمہیں زمین پر آدمیوں کی طرح چلنا بھی آیا؟ تو پیغمبر بغیر کسی کسر وانکسار کے یہ کہتے ہیں کہ ہم یہ بتاتے ہیں کہ خدا کے بنائے اور پیدا کئے ہوئے انسان کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح رہا جاتا ہے، دنیا کے اس سفر کو کامیاب طریقے پر طے کر کے کس طرح اپنے مالک کے پاس انعام لینے کیلئے جایا جاتا ہے، ہم یہ فن بتاتے ہیں 'نہ کم نہ بیش'، یہ ہے نبوت کا وہ کارِ خاص جو نبوت اور انبیاء انجام دیتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی عظمت اور آپ کی انفرادیت سمجھنے کے لئے سب سے پہلے اسے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آپ کے کام کی نوعیت کیا ہے؟ آپؐ اور آپؐ کے مقدس رفقاء جن کو انبیاء کے نام سے ہم جانتے ہیں، (اللہ کا درود وسلام ان سب پر) وہ کیا کام انجام دیتے آئے ہیں، اس کے لئے میں نے ایک حقیر سے کہانی آپ کے سامنے رکھی ہے کہ وہ ملاح تھا تو دو ٹکے کا آدمی، لیکن ان نوجوانوں کے مقابلے میں جنہوں نے اپنے دماغ میں لائبریوں کی

لائبریریاں اتارلی تھیں، اور جنہوں نے فلسفے کے سمندر پی لئے تھے، جن کو دنیا کی تاریخ پوری یاد تھی، وہ اس کم سواد بلکہ بے سواد ملاح کے سامنے بے حقیقت انسان تھے، ان کی زندگی خطرے میں تھی، وہ کشتی پر سوار تھے، ان کی قسمت کشتی سے وابستہ تھی، اور کشتی کی قسمت اس فن ملاحی سے وابستہ تھی، اور وہ اس سے ناآشنا تھے، یہ ہے نبوت کا کارِ خاص جو نبوت ہی انجام دیتی ہے۔

اب میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نبی کو دوسروں کے مقابلے میں کیا امتیاز حاصل ہوتا ہے، ان کو یہ کہنے کا حق کیوں حاصل ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک زندگی ہے اور محسوسات اور مشاہدات کا جو عالم ہمارے اور آپ کے سامنے ہے، ان کے پیچھے اور کون سی طاقتیں کام کررہی ہیں، ہم ان کو دیکھتے نہیں ہیں، اس قانون تکوینی (NATURAL LAWS) کے پیچھے کوئی اور طاقت اور ارادہ ہے جو اس کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اور اس کے متضاد عناصر کو ایک دوسرے سے ٹکرانے سے بچارہا ہے، سورج کی حرارت کو اس سے زیادہ بڑھنے نہیں دیتا جو کہ اس زمین کو خاک سیاہ کردے، زمین کی پرت کو اس سے زیادہ موٹا ہونے نہیں دیتا کہ یہ زمین ڈوب جائے، سمندر اور خشکی کے درمیان جو تناسب ہے، اس تناسب میں ذرا سا فرق آنے نہیں دیتا، اگر آپ کریسی کی کتاب MAN DOES NOT STAND ALONE (انسان اکیلا کھڑا نہیں ہے) کا مطالعہ کریں، (اور آپ میں سے بہت سے لوگوں نے اس موضوع پر مجھ سے زیادہ پڑھا ہوگا) تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ اس دنیا کو کس تناسب کے ساتھ بنایا گیا ہے اور اس میں کتنے متضاد عناصر ہیں، آگ اور پانی کا مجموعہ کس طرح چل رہا ہے، سلبی اور ایجابی) مثبت اور منفی POSITIVE AND NEGATIVE) طاقتیں کس طرح

ایک دوسرے کے ساتھ مصالحت اور تعاون کے ساتھ کام کررہی ہیں، ان میں کسی وقت ٹکراؤ نہیں ہوتا ہے، ان میں کسی وقت بغاوت نہیں ہوتی، ان میں کہیں پر بھی، ناہمواری نہیں پیدا ہوتی، نشیب وفراز نہیں پیدا ہوتے، کوئی چیز اپنی حد سے آگے نہیں بڑھنے پاتی، اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرنے پاتی، اس حقیقت کے جاننے کا نبی کے پاس کیا ذریعہ ہے، اور یہ کہنے کا اس کو کیوں حق حاصل ہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں، اور یہ جانتے ہیں، اور تم نہیں دیکھتے اور نہیں جانتے؟ اس کے لئے میں پھر ایک واقعے کا سہارا لوں گا مگر اس مرتبہ یہ واقعہ ہندوستانی کہانیوں اور ہماری نصابی کتابوں کا واقعہ نہیں ہوگا بلکہ سیرت نبوی کا واقعہ ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ جب یہ آیت "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ" (اے محمد ﷺ آپ قریبی لوگوں اور اپنے سے قریبی تعلق رکھنے والوں کو ڈرایئے) نازل ہوئی، مکہ معظمہ کی اس سادہ اور محدود زندگی میں جس میں ابلاغ واطلاع کے ذرائع مفقود یا بہت محدود تھے، وقت کم اور مکہ کی آبادی پھیلی ہوئی اور کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے پوری آبادی کو جو کہ مکہ کی وادی میں مکہ کے آگے پیچھے بکھری ہوئی تھی، سب کو کیسے جمع کیا جائے؟ صدیوں سے جس کے آباء واجداد نبوت کے مفہوم اور غیبی حقائق سے ناآشنا تھے، ان کو کیسے ان غیبی حقائق سے مانوس کیا جائے، یہ وہ ایک عظیم امتحان تھا، جو بڑے سے بڑے دماغوں کو بھی شل کر سکتا تھا، اس کا حل کرنا آسان نہیں تھا، لیکن یہ بھی الہام کی بات تھی، اور اللہ کی تائید تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو صحیح راستہ بتایا، آپؐ صفا کی پہاڑی پر چلے گئے آپؐ میں بہت سے بھائی حج کی سعادت سے مشرف ہو چکے ہوں گے، انہوں نے صفا کو دیکھا ہوگا، آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے اس کی حالت دوسری تھی، آج سے پچاس سال پہلے بھی وہ کچھ اور تھا، کوہ صفا پر

آپؐ چلے گئے، وہاں آپؐ نے ایک آواز بلند کی "یا صباحاہ" یہ ایک جملہ تھا جو اپنے اندر معانی کا ایک دفتر رکھتا تھا، اس جملے میں عرب کے لوگوں کے لئے ایک نوٹس تھا، اور وہ خطرے کی گھنٹی تھی، یہ ایک ایسا جملہ تھا، جس سے عرب کی ایک پوری تاریخ وابستہ تھی، وہ تاریخ یہ تھی کہ جب عرب کے کسی قبیلے کا حملہ ہوتا تھا، جو ان کا دن رات کا مشغلہ تھا، ایک شاعر کہتا ہے کہ "میرا گھوڑا جب جوان ہو جائے تو اللہ کرے کہ کہیں نہ کہیں لڑائی چھڑ جائے تاکہ میں اپنے گھوڑے کے جوہر دکھا سکوں" ان کا تو یہ کھیل تھا، اس موقع پر کوئی شخص کسی بلند جگہ پر چلا جاتا تھا، اور کہتا تھا کہ "یا صباحاہ" (خطرہ ہے! خطرہ ہے) لوگ جمع ہو جاتے تھے، چنانچہ یہی ہوا کہ جن لوگوں نے آپؐ کی آواز پہچانی انہوں نے کہا کہ "الصادق الامین" (یہ اس دنیا کے صادق ترین انسان کی آواز ہے) بھیڑیا آیا، بھیڑیا آیا! کی کہانی ہم لوگوں نے کتابوں میں پڑھی ہے، اور آخر میں اعتبار جاتا رہا اور سچ مچ بھیڑیا آیا اور کھا گیا، عرب کے لوگوں میں سب خرابیاں تھیں، لیکن یہ چالاکی ان کے اندر نہیں تھی،، وہ سیاسی پروپیگنڈے سے نا آشنا تھے، تو کوئی شخص بھی چلا جاتا اور کہتا "یا صباحاہ" عربوں کی اصل فطرت دروغ بیانی سے بہت دور ہے، اسی بنا پر مفسرین نے کہا ہے کہ نفاق عربوں کا مرض نہیں، عربوں کی نفسیات سے اس کو مناسبت نہیں، یہ مرض وہاں پیدا ہوا جہاں غیر عرب عناصر (یہودی وغیرہ) معاشرے میں تھے، اس آواز کے سننے کے بعد کسی کو کوئی شک نہیں رہتا تھا، بہر حال آپ نے آواز لگائی "یا صباحاہ" اور سارا مکہ دوڑ کر کوہ صفا کے دامن میں جمع ہو گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا، کون ہے؟ پہچان تو لیا انہوں نے فوراً اور یہ بھی یقین ہو گیا کہ یہ واقعہ بالکل صحیح ہے کوئی لشکر ہے جو ہم پر حملہ کرنے والا ہے، اب وہ منتظر تھے کہ وہ لشکر کہاں سے آنے والا ہے، کدھر سے حملہ

کرنے والا ہے؟ آپؐ نے عجلت سے کام نہیں لیا، فرمایا لوگو! تم نے مجھے آج تک کیسا پایا، لوگوں نے کہا کہ "الصادق الامین" (سچ بولنے والا اور امانت دار) یہ پہلا اسٹیج تھا جو نبوت ہی کی تاریخ میں نہیں بلکہ ہر اصلاح کی تاریخ میں ضروری مرحلہ ہے کہ سب سے پہلے جو شخص اصلاح کا جھنڈا لیکر کھڑا ہو، وہ کسی قوم کی اصلاح اور نجات کا صحیح راستہ دکھانے کے لئے کھڑا ہو تو پہلے اس کے متعلق یہ اطمینان کر لینا چاہئے کہ وہ کیسا ہے، بے غرض ہے، مخلص ہے، اسی لئے فرمایا کہ تم نے آج تک مجھ کو کیسا پایا؟ لوگوں نے کہا کہ سچا اور امین، فرمایا کہ میں اگر تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر جو رات کے اندھیرے میں یہاں آکر چھپ گیا ہے، تم پر اچانک حملہ کرنے والا ہے تو تم باور کرو گے؟ عرب کے لوگ زیادہ تر ناخواندہ تھے، اور فلسفے وغیرہ علوم سے ناآشنا، لیکن اللہ نے ان کو ایک دولت دی تھی، جس میں وہ دنیا کی قوموں میں (جو تمدن کی بیماریوں میں مبتلا ہو چکی تھیں اور جنہوں نے فلسفہ، شاعری اور ادب میں بڑی ترقی کی تھی) عربوں کو امتیاز حاصل تھا، وہ یہ تھا کہ وہ فطرت سلیم رکھتے تھے، اور فطرت سلیم یا عقل سلیم اللہ کی بڑی نعمت ہے، ذہانت سے بڑھ کر عقل سلیم (COMMON SENSE) چاہئے، انہوں نے فوراً صورت حال کا جائزہ لیا، انہوں نے دیکھا کہ ہم پہاڑ کے نیچے ہیں، اور ایک شخص پہاڑ کے اوپر کھڑا ہوا ہے، پہاڑ کے نیچے کے حصے کو بھی دیکھ رہا ہے، سامنے کے حصے کو بھی دیکھ رہا ہے، تو اگر وہ یہ کہتا ہے کہ پہاڑ کے عقب (پیچھے) میں ایک لشکر چھپا ہوا ہے تو اس بنا پر اس کے جھٹلانے کی کوئی وجہ اور کوئی جواز نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ہم تو نہیں دیکھتے، ہمیں دکھلایئے! اس لئے کہ ہم پہاڑ کے نیچے ہیں اور وہ پہاڑ کے اوپر، ان کی عقل سلیم نے فوراً ان کی رہنمائی کی کہ اس شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ

یہ دعویٰ کرے کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر ہے، ہمیں یہ نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں۔
جب یہ مرحلہ طے ہو گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم جو زندگی گزار رہے ہو، تمہارے جو عقائد ہیں، تمہارے جو اخلاق ہیں، تمہارا جو ایک دُسرے کے ساتھ سلوک ہے، تمہاری زندگی کے جو مقاصد بن گئے ہیں، تمہارا جو طرزِ زندگی ہے وہ حقیقی خطرہ ہے، اور ہزار دشمنوں اور ہزار لشکروں سے بھی زیادہ خطرناک ہے، تم کس دشمن سے ڈر رہے ہو؟ اس دشمن سے جو آئے گا اور سو دو سو اونٹوں کو ہنکا کر لیجائے گا، اور دس بیس آدمیوں کو مار دے گا، اور تھوڑا سا مالی نقصان اور جانی نقصان پہنچا دے گا، میں تمہیں اس دشمن سے ڈرا رہا ہوں جو تمہارے دلوں کے اندر بیٹھا ہوا ہے، تمہارے دماغوں کے اندر اس نے اپنی چھاؤنیاں قائم کر لی ہیں، وہ تمہارے گھروں کے اندر موجود ہے، اس حقیقی اور جان لیوا دشمن سے ڈرو، یہ تمہارے غلط عقائد، تمہاری خطرناک جہالت، تمہارا قہرِ خداوندی کو بھڑکانے والا اور دنیا کو دوزخ کا نمونہ بنانے والا طرزِ زندگی ہے، یہ تمہاری نفس پرستی، ہوا و ہوس اور محض نائے و نوش اور ”بعیش کوش“ کے فلسفے والی زندگی ہے، یہ وہ زندگی ہے جسے خدا کی رہنمائی اور آسمانی تعلیمات منظّم نہیں کر تیں، بلکہ خود ساختہ قوانین اور ذاتی معاملات چلا رہے ہیں، یہ نبوت کی حقیقت ہے، آپؐ نے چند لفظوں میں اور ایک عملی مظاہرہ کر کے ثابت کر دیا کہ نبی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اعلان کرے کہ اس عالمِ شہود اور اس عالمِ محسوسات سے پَرے بھی دنیا ہے، اس کے پیچھے حقائق کی ایک دنیا ہے، موجد کائنات ہے، خالق کائنات ہے، اس کی ذات ہے، اس کی صفات ہیں، اس کا طریقہ کار ہے، اس کے افعال ہیں، اس کا انسانوں کیساتھ معاملہ ہے اس کے مرضیات و نامرضیات کا ایک سلسلہ اور نظام ہے، اس تفہیم کے

لئے اس سے بہتر اور کوئی عام فہم اور دل نشین طریقہ نہیں ہو سکتا تھا، نہ صرف عرب کی اس محدود زندگی اور معاشرے میں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی نبوت کی حقیقت کو سمجھانے کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

حضرات! وقت کم ہے اس لئے میں یہ عرض کروں گا کہ یہ مسئلہ کہ انسانوں کی زندگی تبدیل ہو، انسانوں کے عقائد تبدیل ہوں انسانوں کے مسلمات (جن چیزوں کو انہوں نے سمجھ لیا کہ زندگی کے لئے ناگزیر ہیں) خواہ وہ معیار زندگی ہوں، خواہ وہ مقاصد زندگی ہوں، خواہ وہ دولت ہو، خواہ وہ طاقت ہو یا اقتدار کا حصول ہو، خواہ وہ نفس کے تقاضوں کی تکمیل ہو، خواہ وہ اپنی برتری کا اظہار ہو، ان چیزوں کو یکسر بدل دینا انسان کی قلب ماہیت کر دینا، انسان کو اندر سے اتنا تبدیل کر دینا کہ وہ بھی بدل جائے، اور دنیا کو بھی بدل کر رکھ دے، یہ کھیل نہیں ہے، یہ ارادۂ الٰہی، خدائی فیصلے، خدا کی تائید اور نبوت کے منصب و مقام اور اس کے ساتھ جو خدا کی مدد ہوتی ہے اور نبی کی شخصیت کے بغیر نہیں ہو سکتا، ہندوستان کی عظیم ترین اور طاقتور ترین شخصیتوں نے چاہا کہ چھوت چھات دُور ہو جائے، نابرابری دُور ہو جائے، اور مساوات واشتراکیت کا دَور دَورہ ہو، یہ بھی نہ ہو سکا اور جہاں ہوا وہاں جبراً و قہراً ہوا ہے، اگر اس معاشرے کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو ابھی بغاوت کرنے کے لئے تیار ہے کل آپ سن سکتے ہیں کہ وہ نظام الٹ کر رہ گیا اور پورے ملک میں انقلاب آگیا اور آتا رہتا ہے، چھوت چھات آج تک دُور نہیں ہوئی، ملک کی رسم میں نہیں جانتا کہ آپ کے یہاں اس کے لئے کیا اصطلاح ہے اور میری دعا ہے کہ آپ کے یہاں یہ بیماری نہ ہو لیکن ہمارے ہندوستان میں کئی ریاستیں ہیں جہاں یہ

بیماری اپنے پورے شباب پر ہے کہ لڑکیاں بیٹھی ہیں اور ان کو اس لئے بَر نہیں مل رہے ہیں، جوڑا رشتہ نہیں مل رہا ہے کہ صاحبزادے اور صاحبزادے سے زیادہ ان کے "والدین ماجدین" مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کے لئے یورپ جانے کا انتظام کیا جائے، امریکہ جاکر تعلیم حاصل کرنے کا انتظام کیا جائے، اس کے لئے بینک میں اتنا حساب جمع کر دیا جائے، اس کے لئے کار، کم سے کم اسکے لئے اسکوٹر کا انتظام کر دیا جائے، آج قانون بھی اس کے خلاف ہے، عقل بھی اس کے خلاف ہے، ہم اس کے نہایت مہیب اور نہایت منحوس نتائج دیکھ رہے ہیں، بڑے بڑے شریف لوگ خودکشیاں کر رہے ہیں، اور گھروں کی زندگی جہنم بن گئی ہے، ماں باپ کو میٹھی نیند نصیب نہیں لیکن یہ رسم ہے کہ پورے طور پر موجود ہے۔

اسی طریقے سے امریکہ جیسے ملک نے شراب کو ختم کرنا چاہا، اس نے کوشش کی کہ شراب نوشی کی عادت ختم ہو، یہ مسٹر ہور (HOOVR) کے زمانے کا واقعہ ہے، اب تفصیلات دیکھ لیجئے کہ امریکہ نے گھٹنے ٹیک دیے اور اپنے پورے وسائل اس کے لئے استعمال کیے، لیکن شراب نوشی حد جنون تک پہنچ گئی، یعنی جو لوگ صرف شراب نوش تھے، ان لوگوں نے شراب نوشی پر کمر کس لی اور حکومت کو شکست تسلیم کرنی پڑی، حکومت نے مات کھالی، لیکن شراب پینا لوگوں نے نہ چھوڑا، وقت کم ہے، اس لئے اختصار سے کام لیتا ہوں، عہد جاہلیت کی چند رسمیں آپ کے سامنے مثال کے طور پر رکھتا ہوں، اس وقت دختر کشی کی رسم تھی، اور ایسی رسم تھی کہ اس کی جڑیں عربوں کے مزاج میں عربوں کی تاریخ، عربوں کے معاشرے میں اتنی گہری تھیں کہ تصور نہیں کیا جا سکتا تھا کہ عرب دختر کشی سے باز آسکتے ہیں، لیکن چند برسوں میں ایسا انقلاب ہوا کہ جب رسول اللہ ﷺ ے ھ میں

عمرۃ القضاء کے لئے مکہ تشریف لے گئے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بچی امامہ گھر سے دوڑی دوڑی آئی اور بھائی بھائی کہہ کر آپ سے لپٹ گئی، اس وقت صحابہؓ کرام میں یہ مقابلہ شروع ہو گیا کہ یہ بچی پرورش کے لئے ہم کو دی جائے، یعنی جو مائیں بچیوں سے اپنی گودیں خالی کرتی تھیں اور جو باپ شقی اور سنگدل بچیوں کو اٹھا کر لے جاتے تھے، ایسے واقعات ہیں کہ آپ سنیں تو آپ تڑپ جائیں، حضرت علیؓ نے کہا کہ بچی مجھے ملنی چاہئے میری بہن ہے، حضرت جعفرؓ نے کہا کہ مجھے عطا ہو کہ میں بھائی بھی ہوں اور اس کی خالہ میرے گھر میں ہے، حضرت زیدؓ نے کہا کہ میرا حق ہے کہ مسلمان ہونے کے رشتے سے ان دونوں سے کم نہیں، آپ نے حضرت جعفرؓ کے حوالے کیا کہ بچی کی خالہ ان کے گھر میں ہے، اس کو وہاں زیادہ آرام ملے گا، اسی طرح شراب جو عرب کی گھٹی میں پڑی تھی، جب اس کی حُرمت کا اعلان ہوا تو ہونٹوں سے لگائے ہوئے جام ہٹا دیے گئے، شراب کے ظرف اس طرح لنڈھا دیے گئے کہ وہ مدینے کی نالیوں میں بہتی تھی۔

سیرتِ محمدی ﷺ کا اصل پیغام یہی ہے، آپ کو ایک کام کے لئے مامور کیا گیا، آپؐ کے ساتھ اللہ کی تائید تھی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ انقلاب عظیم دنیا میں رُو نما ہوا کہ اس کی مثال نہ اس سے پہلے کی تاریخ میں ملتی ہے، اور نہ اس وقت کی تاریخ میں ملتی ہے، آج لوگوں کو مطمئن کرنے کے ذرائع وافر مقدار میں موجود ہیں، لیکن ہم انسانوں کو مطمئن نہیں کر سکتے، معاشرے میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں لا سکتے۔

جہاں تک عام انسانی جذبات کا تعلق ہے، خلوص کا تعلق ہے، قربانی کا تعلق ہے، ان کی مثالیں دُور تک نہیں ملیں گی، مگر ان کو کوئی ایسی بڑی کامیابی

حاصل نہیں ہوئی، وہی نابرابری ہے، وہی طبقاتی تفریق ہے، وہی انسانی آبرو و عزت کی بے قیمتی ہے وہی انسان انسان کا بھکاری ہے، وہی انسان انسان کا شکاری ہے، وہی دولت کی حد سے بڑھی ہوئی محبت ہے، وہی چھوت چھات ہے، وہی شراب نوشی کا جنون ہے، اور ہزاروں آدمیوں کی جانیں زہریلی شراب میں جاتی ہیں۔

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ سنجیدگی کے ساتھ سیرت کا مطالعہ کریں، اور ہمارے ہندوستان میں اردو کا جو لٹریچر تیار ہو گیا ہے، اس کا بغور مطالعہ کریں، اگر اس مجلس سے اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ تحریک پیدا ہو جاتی ہے تو یہ مجلس اور یہ اہتمام جو اس مبارک موقع کے لئے کیا گیا پورے طور پر وصول ہوا۔

وما التوفیق الا من عند اللہ

فسادات اور ہندوستانی مسلمان

واقعات وحالات سے سبق لینے کی ضرورت
ہندوستانی مسلمانوں کے لئے صحیح طریقہ کار

بھیونڈی اور بمبئی کے فساد ۱۹۸۴ء
کے چند روز بعد بمبئی ہی میں ایک چیدہ
مجمع کے سامنے۔ جس میں زیادہ تر ڈاکٹر
صاحبان اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات تھے،
کی گئی ایک اہم اور شاہکار تقریر۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فسادات اور ہندوستانی مسلمان

خطبۂ مسنونہ کے بعد!

حضرات! ہم مسلمانوں کو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جابجا یہ ہدایت فرمائی ہے کہ ہم واقعات و حالات سے فائدہ اٹھایا کریں۔ اور ان سے صحیح نتیجہ نکالیں، اسباب اور اسباب کے نتائج میں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص تعلق پیدا کیا ہے، جیسے دواؤں میں خاصیت ہے، درخت کی پتیوں میں خاصیت ہے، یہاں تک کہ گھاس پھوس میں خاصیت ہے، اعمال، اخلاق، طرزِ عمل اور زندگی کے طور وطریق میں اس سے بھی زیادہ طاقتور خاصیتیں ہیں، اس لئے کہ دوائیں، غذائیں، نباتات، حجریات تو انسان کی زندگی کی حفاظت اور انسان کو امراض کی تکلیف سے بچانے کے لئے پیدا کی گئی ہیں، زندگی تو اصل چیز ہے، جو واقعات ہمارے گرد و پیش گزرتے ہیں، ان سے ہمیں سبق لینا چاہئے اور قرآن مجید میں اس کی نہ صرف ہدایت کی گئی ہے، بلکہ سبق نہ لینے پر ناراضگی کا اظہار اور اس بے حسی کی مذمت کی گئی ہے۔

"وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ" (اور آسمان و زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں جن پر یہ گذرتے ہیں اور ان سے آنکھیں بند کر کے چلے جاتے ہیں۔) یعنی کتنی نشانیاں ہیں اس زمین و آسمان میں کہ اس کے پاس سے یہ لوگ منہ پھیر کر گذر جاتے ہیں، اور اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں، ان سے کوئی سبق نہیں لیتے، اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ میں سورۂ یونس میں کہا گیا: " وَمَا تُغْنِي الْآيَاتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُوْنَ" جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے لئے نشانیاں اور ڈراوے کچھ کام نہیں آتے۔

ایک جگہ فرمایا گیا" سَنُرِيْهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ط أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ط " ہم عنقریب ان کو اطراف عالم میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھلائیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ حق ہے۔

اس وقت کا اہم ترین واقعہ جس کی طرف خاص طور پر ہم ہندوستانی مسلمانوں کی توجہ ہونی چاہئے وہ روزمرہ کے فسادات ہیں، یہ فسادات کیوں ہوتے ہیں؟ کیا یہ محض اتفاقی واقعہ ہیں؟ یا یہ مسلمانوں کی تقدیر بن گئے ہیں؟ اس میں کچھ ہماری کوتاہی، ہمارے طرز عمل کو بھی دخل ہے، اور اس سے کچھ ہم پر بھی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، یا صرف حکومت اور انتظامی عملے ہی پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ یہ مسئلہ تمام مسائل میں اس وقت سب سے زیادہ قابل غور ہے، اگرچہ اپنے حجم و تعداد (QUANTITY) میں یہ کوئی بڑا مجمع نہیں، لیکن آپ حضرات اپنی ثقافتی، اپنی ذہنی سطح (QUALITY) کے لحاظ سے بہت اہم ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ جو بات اس مختصر جماعت کے سامنے کہی جاسکتی ہے، وہ بعض اوقات بڑے مجمع

میں کہی جانے والی بات سے بھی زیادہ قیمتی ہوگی۔

حضرات! مسلمانوں کا پہلا فرض تو یہ ہے کہ وہ جہاں بھی اور جس ملک میں بھی ہوں وہاں وہ اولاً اپنے ہم وطنوں کو اللہ کی اس نعمت (دین حق) میں شریک کرنے کی کوشش کریں جو اللہ نے ان کو عطا کی ہے، اور انکو اس کی فکر رہے، یہ فکر سب سے زیادہ پیغمبروں کو رہا کرتی تھی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بار بار رسولؐ کو تسکین دی۔ "لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ" اے پیغمبر! شاید تم اس رنج سے کہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے تئیں ہلاک کر دو گے۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ جن لوگوں کو ان سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے، ان کے اندر یہ فکر زیادہ ہوتی ہے، تو پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مسلمان جس ملک میں بھی رہیں وہاں ہدایت کو عام کریں اور اللہ تعالیٰ نے ان پر جو احسان فرمایا ہے، ان کو جو ہدایت دی ہے، ان کو جو روشنی عطا فرمائی ہے، اس روشنی کو زیادہ سے زیادہ پھیلائیں، سارا قرآن شریف اس سے بھرا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

دوسرا فرض جو از روئے دین، انسانیت اور عقل سلیم، ہم پر عائد ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اپنا تعارف کرائیں کہ ہم کس دین کے ماننے والے ہیں، کن اصولوں کو ہم تسلیم کرتے ہیں او ہمارے زندگی کن چیزوں کی پابند ہے، اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے اخلاق سے لوگوں کو مانوس اور قریب کریں، لوگوں کو اس دین کے مطالعے پر آمادہ کریں، جس دین کے ہم پابند ہیں، اس دین کے بارے میں ان میں تجسس (CURIOSITY) پیدا ہو، یہ کس طرح کے لوگ ہیں، یہ کس دین کو مانتے ہیں؟ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کسی کو تکلیف نہیں پہونچاتے، یہ ہر ایک کے خیر

خواہ ہیں، یہ دولت ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک کچھ اور حقائق ہیں، کچھ اور (VALUES) ہیں، کچھ اور (IDEAL) ہیں یہ کس طرح کے لوگ ہیں جن کو دولت کی بڑی سے بڑی مقدار خرید نہیں سکتی، ان کو اپنے اصول سے ہٹا نہیں سکتی، ان کو ظلم پر آمادہ نہیں کر سکتی، کیا ان کے سامنے کوئی اور عالم ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے؟ ذہن پر چوٹ لگانے والی بعض چیزیں ہوتی ہیں، جو بعض اوقات آدمی کی زندگی اور خیالات میں انقلاب پیدا کر دیتی ہیں۔

جبار بن سلمیؓ نامی ایک صحابی تھے، وہ اسلام لائے، ان سے کسی نے کہا کہ آپ کیسے اسلام لائے؟ آپ تو اپنے مذہب میں بڑے سخت تھے؟ انہوں نے کہا کہ ایک فقرہ اس کا سبب بن گیا، واقعہ یہ پیش آیا کہ میں نے ایک مسلمان (عامر بن فہیرہؓ) کو نیزہ مارا اور وہ نیزہ ایک پہلو سے گھس کر دوسرے پہلو سے نکل گیا، اور وہ تڑپ کر گر گئے، زمین پر گرتے گرتے اور جان دیتے دیتے ان کی زبان سے ایک جملہ نکلا اور وہی جملہ ہے جو مجھے اسلام کی طرف کھینچ لایا، انہوں نے کہا کہ "کعبہ کے رب کی قسم میں تو کامیاب ہو گیا۔" میں نے سوچا کہ کامیابی کسے کہتے ہیں؟ کیا کامیابی کے دو معیار ہیں؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک شخص جاں کنی کے عالم میں گرتا ہے، تھوڑی دیر میں وہ دنیا کی ہر لذت سے محروم ہو جائے گا، وہ جانتا ہے کہ اس کی بیوی بیوہ ہو جائے گی، اس کے بچے یتیم ہو جائیں گے، پھر کس چیز کو دیکھ کر وہ کہتا ہے کہ میں کامیاب ہو گیا؟ میرے دل میں ایک خلش پیدا ہو گئی کہ معلوم کرنا چاہئے کہ مسلمان کامیابی کسے کہتے ہیں؟ میں نے دیکھا کہ تمام دنیا کی ناکامیاں اس کے لئے جمع ہو گئیں، اور اس نے ہر چیز سے ہاتھ دھو لیا، مگر وہ ایسے وقت میں جب کوئی جھوٹ بول نہیں سکتا، کہتا ہے کہ میں کامیاب ہو گیا (مرتے وقت عام طور پر

کوئی جھوٹ نہیں بولتا اور عرب تو زندہ رہ کر بھی جھوٹ نہیں بولتے تھے) میں نے لوگوں سے کہا کہ اس نے کیا دیکھ کر کہا کہ میں کامیاب ہو گیا؟ انہوں نے کہا کہ تم نہیں جانتے اس کو خوشی تھی کہ میں نے حق کے لئے جان دی، یہ مسلمان اللہ پر یقین رکھتے ہیں، اور جانتے ہیں کہ جو شہید ہوتے ہیں وہ جنت میں جاتے ہیں، اس زخمی مسلمان نے کچھ دیکھا ہوگا، جنت دیکھی ہوگی اور یہ یقین اس کے دل میں بیٹھا ہوگا کہ میں شہید ہو جاؤں گا تو جنت میں جاؤں گا تو اس نے کہا کہ میں کامیاب ہو گیا، کہنے لگے کہ اس جملے نے میرے دل کو پکڑ لیا اور کھینچ کر دائرۂ اسلام میں لے آیا۔

حضرات! میں نے جو واقعہ سنایا یہ بہت آخری درجے کا واقعہ ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ ہر مسلمان اس کا مظاہرہ کر سکتا ہے اور کرنا چاہیے، البتہ مسلمانوں کا طرز زندگی ضرور ایسا ہونا چاہیے تھا کہ پڑوسیوں کو اور اس ملک کی دوسری آبادی کو وہ یہ سوچنے پر آمادہ کریں کہ یہ کیسے لوگ ہیں، کیا یہ پیسے کی قیمت نہیں جانتے، یہ نہیں جانتے کہ پیسے سے آدمی عیش و راحت ،، عزت و طاقت کے کیسے سامان خرید سکتا ہے، یہ نہیں جانتے کہ جھوٹ بولنے سے بعض مرتبہ کتنا فائدہ ہوتا ہے، یہ نہیں سمجھتے کہ بڑی عمدہ کوٹھیوں میں، بڑے بینک بیلنس کے ساتھ آدمی کس طرح عیش سے رہ سکتا ہے، پھر یہ ان چیزوں کے پیچھے کیوں نہیں دوڑتے جن کے پیچھے ہم دوڑتے ہیں، جو چیزیں ہمیں خرید لیتی ہیں، وہ چیزیں انہیں کیوں نہیں خرید لیتیں؟

ہماری زندگی ایسی ہوتی جو لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچتی، میں مثال کے طور پر کہتا ہوں، یہ اہل علم کیلئے ایک سوال ہے کہ آنحضرتؐ تیرہ برس تک مکہ معظمہ

میں اسلام کی طرف دعوت دیتے رہے، اپنی ان تمام خصوصیات اور برکتوں کے ساتھ جو آپ کا حصہ تھیں، اللہ کی پوری مدد، پوری تائید آپؐ کے ساتھ تھی، قرآن شریف نازل ہو رہا تھا، اور دس برس مدینہ طیبہ میں آپ نے دعوت دی، کل تیئیس برس ہوئے، لیکن صلح حدیبیہ ہوئی ہے ۶ھ میں، ہجرت کے چھٹے سال اور مکہ ۸ھ میں فتح ہوا، امام زہری جو بڑے جلیل القدر تابعی اور امام ہیں، کہتے ہیں کہ اس دو ڈھائی برس میں جتنی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے ہیں، پورے بیس اکیس برس میں اس قدر لوگ مسلمان نہیں ہوئے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بات ہے؟ وہی اللہ کے رسولؐ! وہی قرآن! وہی معجزات! وہی تاثیر، وہی صحبت کی برکت، لیکن دو ڈھائی برس میں جیسے معلوم ہوتا ہے پشتہ ٹوٹ گیا ہو، یا تسبیح کی لڑی کا دھاگہ ٹوٹ گیا ہو، تسبیح کے دانے بکھر گئے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ صلح حدیبیہ نے موقع دیا کہ عرب آزادانہ مدینہ آئیں جائیں، اور مسلمانوں کی زندگی دیکھیں، اب تک ایک دیوار کھڑی تھی، اسلام اور کفر کے درمیان، اور لڑائیاں ہو رہی تھیں، غیر مسلم مدینے میں آتے ڈرتے تھے، اب مسلمان ادھر گئے، غیر مسلم ادھر گئے، ان کو مسلمانوں کو دیکھنے کا یا میدان جنگ میں موقع ملتا تھا یا پھر سفر وغیرہ میں کہیں ساتھ ہو جائے وہ بھی کم، لیکن صلح حدیبیہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ مکہ کا جو چاہے مدینہ میں بے خطر آئے، اور جو مسلمان چاہے بے خطر مکہ چلا جائے، ملنے جلنے کی پوری آزادی ہے، کوئی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا، بس پھر کیا تھا؟ مکہ کے لوگ اپنے عزیزوں سے ملنے مدینہ آئے، اور آئے تو دیکھا کہ ان کی زندگیاں بدل گئی ہیں، ہم سب ایک ہی زبان بولتے ہیں، ایک ہی نسل کے لوگ ہیں، ایک ہی لباس پہنتے ہیں، ایک ہی خوراک ہے، پھر کیا بات ہے کہ

ان کے اخلاق ہم سے مختلف ہیں؟ ان کا معاملہ ان کا طرزِ گفتگو ہم سے مختلف ہے، ہم ان کے یہاں مہمان رہتے ہیں، (حالانکہ ہم ان کے مذہب کے نہیں) تو یہ اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کر ہمیں کھلاتے ہیں، یہ پہلے ہماری خبر لیتے ہیں، پھر اپنے گھر والوں کی خبر لیتے ہیں ہمیں پہلے آرام سے سلاتے ہیں، پھر خود سوتے ہیں، انہوں نے نہ کبھی ہمارا مذاق اڑایا، نہ ہم پر کبھی کوئی فقرہ کسا، ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ اپنے کاموں میں بڑے مستعد ہیں، یہ نہیں کہ اسلام لانے کے بعد یہ کاہل ہو گئے ہوں، نماز کے وقت نماز پڑھتے ہیں اور کام کے وقت کام کرتے ہیں، اور اپنے بال بچوں کے ساتھ بھی ان کا بڑا اچھا برتاؤ ہے، سب ان سے خوش ہیں، یہ فرق کہاں سے آیا؟ معلوم ہوا کہ یہ فرق اسلام نے پیدا کیا، اب ان کو اسلام پر غور کرنے کا موقع ملا، اور وہ اسلام کی طرف کھنچنے لگے، ہزاروں ہزار آدمی مسلمان ہوئے، امام زہری سے بڑھ کر معتبر کون ہو سکتا ہے، حدیث کی روایات کے بڑے حصے کا دارومدار ان پر ہے، وہ کہتے ہیں کہ عربوں کو اس عرصے میں مسلمانوں سے ملنے کا موقع ملا، انہوں نے مسلمانوں کو قریب سے دیکھا، اس سے اسلام نے انکے دل میں گھر کر لیا اور اپنا عاشق بنالیا۔

اب آپ بتایئے کہ کسی ملک میں مسلمان ایک ہزار برس سے ہوں اور وہ مسلمان نہ اپنا تعارف کرا سکیں، نہ ان کو متاثر کر سکیں تو بتایئے یہ کوتاہی ہے یا نہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اخلاق کی خوشبو ہمارے ہم وطنوں کو نہیں پہنچ سکی، انہوں نے ہم کو سیاسی میدان میں دیکھا یا انتخابی معرکہ (الیکشن) کے میدان میں ہم کو آزمایا، یا تجارت کے مقابلے میں ہم کو دیکھا، مسجدوں میں یہ آتے نہیں، انہوں نے ہم کو معاملات میں نہیں پرکھا، انہوں نے ہم کو اخلاق سے نہیں جانچا،

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اسطرح مسلمانوں پر حملہ کرتے ہیں، جیسے بالکل غیر مانوس پردیسی اور دشمن کرتے ہیں، ابھی تک ان کو یہی نہیں معلوم کہ ہم اپنے اندر کیا جوہر رکھتے ہیں، کیسی محبت رکھتے ہیں، کیسی انسانیت رکھتے ہیں، ہمارے دل میں ان کے لئے کیسی خیر خواہی کا جذبہ ہے، ہم اس ملک کے لئے کتنے مفید ہیں، کتنے ضروری ہیں؟ ہماری وجہ سے ملک پر اللہ کی کیسی رحمتیں نازل ہو سکتی ہیں، ابھی تک ہم غیر مسلموں کو، اپنے پڑوسیوں تک کو واقف نہیں کرا سکے، اس کا ثبوت برابر ملتا رہتا ہے، آپ کسی پڑھے لکھے ہندو سے پوچھ لیجئے کہ آپ نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے؟ کہیں گے بالکل نہیں۔ اچھا آپ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق کیا جانتے ہیں؟ وہ کہیں گے کہ ہم مسلمانوں سے متعلق اتنا جانتے ہیں کہ مسلمان ختنہ کراتا ہے، گائے کا گوشت کھاتا ہے اور کچھ بات ہو جائے تو اسے بڑی جلدی غصہ آجاتا ہے، تین علامتیں مسلمان کی بتائیں (ویسے یہ دوسری بات ہے کہ مسلمان سر پر چوٹی نہیں رکھتا) ہم سے ہمارے ایک عرب فاضل دوست کہتے تھے کہ جب میں امریکہ گیا، تو وہاں لوگ مسلمان اور عرب سمجھ کر مجھ سے دو باتیں پوچھتے تھے، ایک یہ کہ یہ بتاؤ کہ تمہارے حرم میں کتنی بیویاں ہیں؟ دوسرے تمہارے دروازے پر کتنے اونٹ بندھے ہیں؟ تو گویا مسلمان کی پہچان امریکہ میں دو ہیں، کئی بیویاں رکھتا ہو، اور اونٹ ضرور پالتا ہو، تو آج یہ ہندوستان کا ہندو جو متوسط درجے کا ہے (اسکالرز کو آپ الگ کر دیں) وہ یہ تین چار علامتیں مسلمانوں کے بارے میں جانتا ہے کہ ختنہ کراتا ہے، گائے کا گوشت کھانا اس کے مذہب میں داخل ہے، چاہے چوری سے کھائے، وہ سمجھتا ہے کہ ایمان اس کا ناقص ہوگا اگر وہ گائے کا گوشت نہ کھائے اور غصہ اس کی ناک پر رکھا ہوا ہے، بات تو تم نے کی اور مسلمان کو غصہ آگیا، مسلمان

کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے (گویا دین کی علامت ہے) کہ مسجد کے سامنے دوسروں کا باجا نہیں سُن سکتا، چاہے خود بجائے لیکن غیر مسلم کی بارات کا باجا نہیں سُن سکتا ہے مسجد کے سامنے۔ اپنی اس کی جان ایک کردے گا۔ یہ ہے کل تعارف ہمارا اس ملک میں۔

میں ہردوئی سے لکھنؤ آرہا تھا، تبلیغی جماعت کے کچھ احباب ساتھ تھے، نماز کا وقت ہوا تو ہم (ریل میں) نماز کے لئے کھڑے ہوئے، رکوع میں، سجدے میں جاتے ہوئے اللہ اکبر کہنا ہوتا ہے، ایک صاحب جو ہمارے قریب بیٹھے تھے اور جنہوں نے اپنا تعارف کرایا تھا کہ وہ ایک ضلع کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین ہیں، انہوں نے بڑے بھولے پن سے پوچھا کہ "مولانا صاحب! یہ بار بار آپ اللہ اکبر اللہ اکبر! کہتے تھے، یہ اکبر بادشاہ کا نام لیتے تھے؟ ہم ابھی تک انہیں اذان کا مطلب تک نہیں سمجھا سکے جو پانچوں وقت (اور اکثر جگہ لاؤڈ اسپیکر سے) ہوتی ہے، ہمارے ایک بزرگ تھے، انہوں نے کہا بھائی! کچھ نہیں تو کم سے کم اذان میں جو کچھ کہا جاتا ہے اسی کا ہندی میں ترجمہ کردیں، ہندو بھائی سمجھتے ہیں کہ اذان میں ہمارے بتوں کو بُرا بھلا کہا جاتا ہے، یا یہ جہاد کا نعرہ ہے، ان کو نہیں معلوم کہ "حی علی الصلوۃ، حی علی الفلاح، الصلوۃ خیر من النوم" کے کیا معنیٰ ہیں؟

تو ہم اس ملک میں کرتے کیا رہے اتنے دنوں تک؟ جب فساد ہو جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ دیکھئے صاحب یہ کیسے لوگ ہیں کہ اتنے دنوں سے ہم ان کے ساتھ رہ رہے ہیں اور ذرا بھی ان کو ہمارے ساتھ تعلق نہیں ہے، اس میں ہمارے ان ہم وطنوں کی بھی غلطی ہے، ان کے رہنماؤں کا بھی قصور ہے، اس سیاسی نظام اور الیکشنی طریقے کا بھی عیب ہے، تعلیمی نصاب اور کورس و مطالعے کی کتابوں کی

بھی ذمہ داری ہے، میں ان حقیقتوں کو تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے خوب جانتا ہوں، مگر اس وقت غیر مسلم بھائیوں اور حکومت و تعلیم کے ذمہ داروں سے میرا خطاب نہیں ہے، جب ہوگا تو بتاؤں گا کہ خود ان کی کتنی بڑی ذمہ داری تھی کہ وہ اس عظیم ترین اقلیت کے بنیادی عقائد، تہذیب و معاشرت اور اخلاق و عادات اور خصوصیات کو سمجھنے کی کوشش کرتے جو ایک ہزار سال سے زیادہ مدت سے ان کے ساتھ دیوار بدیوار رہتی چلی آرہی ہے۔ اور جس نے اس ملک کی تعمیر و ترقی میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے، اور جس کے ہم مذہب ان کے ہمسایہ ممالک اور درجنوں آزاد ملکوں میں رہتے بستے ہیں۔ نیز محکمۂ تعلیم کے ذمہ داروں اور ملک کے دانشوروں کو بارہا بتایا جا چکا ہے کہ تاریخ کی نصابی کتابیں کس قدر نفرت اور خوف پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں، خود ہمارے ہم وطنوں کے اندر بھی بہت سی کمزوریاں ہیں، مگر ان کی کمزوریاں آپ کے سامنے بیان کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، میں تو اس وقت اپنی کمزوریاں بیان کر رہا ہوں کہ ہم نے اپنے سے ان کو مانوس نہیں کیا، اسلام کا تعارف نہیں کرایا، آپ ہی میں سے کوئی بتائے کہ ہم میں سے کتنوں نے اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو، یا کلاس فیلو دوستوں کو کوئی چیز ایسی پڑھنے کو دی ہو جس سے اسلام کا تعارف ہو، میں پوچھتا ہوں کہ مرہٹی، گجراتی، تامل میں اسلام کے تعارف میں کتنی چیزیں ہیں، جو غیر مسلموں کو آنکھ بند کر کے دی جا سکیں؟ علاقائی زبانوں میں ہم نے کتنا کام کیا؟ ان میں کتنے اچھے لکھنے والے ہم مسلمانوں میں پیدا ہوئے، ہاں یہاں بڑے بڑے جرنلسٹ مل جائیں گے، بہت کریں گے تو ہم اردو کا اخبار نکالیں گے، چار نکل رہے ہیں تو پانچواں نکالیں گے اور اسے بہت بڑا جہاد سمجھیں گے، کیا مرہٹی، گجراتی کا کوئی روزنامہ نکالنے کی ضرورت نہیں تھی؟ یا کم سے کم کوئی

ویکلی نکالنے کی ضرورت نہیں تھی؟ ایسا اخبار جو جدید اسٹائل میں ہو بالکل اپٹوڈیٹ، ہم آج تک انگریزی کا کوئی روزنامہ نہیں نکال سکے، جب فساد ہو جاتا ہے اور اخباروں میں یک طرفہ خبریں شائع ہوتی ہیں، تو شکایت کرتے ہیں کہ دیکھئے صاحب کیسا اندھیر ہے کہ ہم ہی مارے جائیں اور ہم ہی ملزم ٹھہرائے جائیں، مجھے خوب یاد ہے، کہ مسلم پرسنل لا کا جلسہ (دسمبر ۷۲ء میں) بمبئی میں ہوا تھا، بڑا عظیم الشان جلسہ تھا، خیال یہ ہے کہ پچاس ساٹھ ہزار یا غالباً لاکھ آدمی شریک تھے، اگلے دن یا اسی دن دلوائی صاحب نے ایک مظاہرہ (DEMONSTRA-TION) کیا، مسلمانوں نے ان پر چپل پھینکے، ان کو مارنے دوڑے اور پولیس نے ان کو گھیرے میں لے کر نکال لیا، دوسرے دن بمبئی کے انگریزی اخباروں میں ہمارے جلسہ کی خبر تو ایک کونے میں ذرا سی دی گئی اور دلوائی صاحب کے مظاہرے کی ایسی تھی جیسے اس میں دس بیس ہزار آدمی تھے۔

فساد کے مستقل سد باب کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنا طرز زندگی ایسا بنائیں جس میں کشش ہو غیر مسلم کے لئے، وہ دیکھیں کہ مسلمان اس طرح نظر نیچی کر کے چلتا ہے، اس سے کسی کو تکلیف نہیں پہونچتی، وہ دیکھیں کہ اسٹیشن پر نل کھلا ہوا ہے اور منوں پانی بہہ رہا ہے، ہزاروں آدمی دیکھتے ہیں اور گذر جاتے ہیں، ایک مسلمان جاتا ہے اور نل بند کر دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ پانی ہمارے خدا کی دی ہوئی نعمت ہے، یہ ہمارے ملک کا پانی ہے اسے ضائع نہیں کرنا چاہئے، بارہا ایسا ہوا، سفر ہے، فرسٹ کلاس ہے، ہمارے غیر مسلم ہم سفر نے چائے کا آرڈر دیا ان کی چائے میں دیر ہوئی ہماری پہلے آگئی ہم نے ان کو پیش کر دی اور کہا کہ جب آپ کی آئے گی تو ہم پی لیں گے، یہ بھی کوئی قابل ذکر بات ہے لیکن وہ بالکل توقع نہیں کرتے تھے کہ

مسلمان اس طرح کے کام کرتے ہیں، اس سے ان کا تخیل اسلام کے متعلق بدلتا ہے، وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اسلام پھاڑ کھانے والی، چٹکی لینے والی چیز نہیں، اسلام تو انسانیت کی تعمیر کا سانچہ ہے جس سے انسان ڈھل کر نکلتے ہیں، اپنے طرزِ عمل سے بازاروں میں، دفتروں میں، کارخانوں میں اور جہاں جہاں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا ہے، آپ اسلامی تعلیمات، اسلامی اخلاق اور اسلامی سیرت کا دل کش نمونہ پیش کریں، بوڑھا آدمی ہو تو اس کو سہارا دیدیں، کوئی عورت ہو تو اس کی مدد کر دیں اور کوئی غلط کام ہو رہا ہو، جس سے معاشرے کو تکلیف یا ملک کا نقصان ہو رہا ہو تو اس کی اصلاح اور اس کو نرمی کے ساتھ روکنے کی کوشش کریں۔

اس وقت کے حالات کی رعایت سے میں نے اتنی بات کہی ہے، اور کہنے کی باتیں تو بہت تھیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم کو صحیح سمجھ عطا فرمائے اور عمل کی توفیق دے، ہماری معروضات کو قبول فرمائے اور مفید بنائے اور ہماری حفاظت و نصرت فرمائے۔

وما النصر الا من عند الله.

☆☆☆☆

دینِ حق اور دعوتِ اسلام

ایک فلک بوس اور سدا بہار درخت

یہ تقریر ۳؍ ستمبر ۱۹۹۱ء کو لیسٹر (Leicester) انگلستان کے اسلامک فاؤنڈیشن میں اہل علم اور دعوتی و تحقیقی کام کرنے والوں کے ایک وقیع مجمع میں کی گئی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دینِ حق اور دعوتِ اسلام
ایک فلک بوس اور سدابہار درخت

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ. (سورة ابراهيم ٢٤: ٢٥)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے پاک بات کی کیسی مثال بیان فرمائی؟ (وہ ایسی ہے) جیسے پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط (یعنی زمین کو پکڑے ہوئے) ہو اور شاخیں آسمان میں، اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا (اور میوے دیتا) ہو، اور خدا لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے کہ وہ نصیحت پکڑیں۔

حضرات!

میں یہاں حاضر ہوا تو مجھے یہاں کی سرگرمیوں اور یہاں کی دعوتی و تحقیقی کاموں کو دیکھنے کا شوق تھا اور میرے ذہن میں کوئی خاص مضمون نہیں تھا۔ اور نہ یہ

بات متعین تھی کہ مجھے کچھ عرض کرنا ہے، میں تو یہاں ایک زائر اور ایک استفادہ کرنے والے کی حیثیت سے آیا تھا، لیکن مجھے حکم ہوا کہ میں آپ کے سامنے کچھ عرض کروں، میں بیٹھنے کے بعد بالکل خالی الذہن تھا اور میں نے اس کو خدا پر چھوڑ دیا تھا، اور اس کا بارہا تجربہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوتی ہے، اور قرآن مجید ہر موقع پر مدد کرتا ہے، اور راستہ کھول دیتا ہے، اور نئی نئی حقیقتیں اور اپنے اعجاز کے نئے پہلو سامنے لاتا ہے، ابھی آپ کے سامنے جو آیت پڑھی گئی وہ تنہا کافی ہے، دنیا کے کسی عہد میں بھی دین کی دعوت کا، اسلام کے تعارف کا، اور لوگوں کو دنیا کے خطرات سے نکالنے کا، اور زندگی کو نہ صرف برباد کرنے بلکہ زندگی کو باعث اذیت اور خدا سے بُعد کا ذریعہ بنانے کی، آزمائش سے نکال کر نجات کے راستہ پر لگانے کا جب بھی ذکر کیا جائے گا تو یہ آیت اس کی رہنمائی کے لئے کافی ہے اور اس کے اندر قرآن مجید کا اعجاز جھلک رہا ہے۔

قرآن مجید جیسا کہ میں نے بعض مرتبہ عرض کیا کہ مجموعی حیثیت سے بھی وہ معجزہ ہے، اور انفرادی حیثیت سے بھی، یعنی ایک ایک آیت بھی اس کا الگ الگ معجزہ ہے بلکہ اگر میں (عربی زبان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے) یہ کہوں کہ اس کا ایک ایک لفظ بھی مستقل معجزہ ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

کسی ملک اور کسی عہد میں بھی دین کا کام کیا جائے، دین کے تعارف کا کام کیا جائے، اسلام کی طرف دعوت دینے کا کام کیا جائے، اسلام کے محاسن کو پیش کرنے کا کام کیا جائے اور لوگوں کو زندگی اور زندگی کے بعد کے خطرات سے نکالنے کا کام کیا جائے تو یہ آیت اس کی پوری تصویر کھینچ دیتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ "أَلَمْ تَرَ كَيْفَ

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ. (سورة ابراهيم ۲٤ : ۲۵) "کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے پاک بات کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے ؟ (وہ ایسی ہے) جیسے پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط (یعنی زمین کو پکڑے ہوئے) ہو، اور شاخیں آسمان میں، اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا (اور میوے دیتا) ہو اور خدا لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں"

اس آیت میں مکانی رقبہ بھی آگیا اور زمانی رقبہ بھی آگیا اور اس کی بنیاد اور اس کا سرچشمہ بھی آگیا اور اس کے نقطۂ عروج اور جن بلندیوں تک اسلام کی دعوت پہنچ سکتی ہے اس کا ذکر بھی آگیا۔

آپ ایک درخت کی حقیقت پر غور کیجئے (شجرۃ طیبۃ) پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ اچھا درخت ہو "شجرۃ طیبۃ" ہو، اور یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں شرط ہے کام کی کامیابی کے لیے، کتنی ہی بڑی ذہانت، اور کتنے بھی بلند مقاصد، کتنے ہی وسیع وسائل، کتنی ہی بڑی جمعیت، کتنی ہی بڑی تنظیم، کتنی ہی اپنے عہد کی علمی و صنعتی ترقیاں سب ساتھ ہوں تو وہ اللہ کے یہاں معتبر نہیں ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ مقصد صحیح ہو، دافع اور محرک صحیح ہو اور وہ دعوت بذات خود صحیح ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً" (کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے پاک بات کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے۔ ؟)

پہلی شرط تو یہ ہے کہ کلمۂ طیبہ ہو، صرف کلمہ ہونا کافی نہیں، دنیا میں ایک بہت بڑی غلطی یہ ہوتی رہی ہے، ادبیات کی تاریخ بتاتی ہے، شاعری کی تاریخ

بتاتی ہے، ذہانت و حکمت کی تاریخ بتاتی ہے، یونان کے فلسفہ و منطق کی تاریخ بتاتی ہے کہ لوگوں نے کلمہ کو کافی سمجھ لیا، کلمہ ہونا چاہئے اور اس کے اندر انسان کی ذہانت جھلکنی چاہئے، اس کے اندر مضمون آفرینی ہونی چاہئے، انسان کے مطالعہ کی گہرائی ہونی چاہئے، اظہار بیان کی طاقت ہونی چاہئے، دنیا میں زیادہ تر اسی پر زور دیا گیا ہے۔آپ ساری دنیا کے ادبیات کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان سب میں "کلمہ" پر زور ہے "کلمۂ طیبہ" پر زور نہیں۔

پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ کلمہ طیبہ ہو، اس کا مقصد صحیح ہو، بات جو کہی جائے تو صرف اتنا کافی نہیں کہ وہ فصیح و بلیغ ہے، بعض لوگوں نے اس کو کافی سمجھا ہے، اگر آپ مذہبی، دینی نفسیات کی تاریخ پڑھیں اور دعوتوں کی تاریخ پڑھیں، تو بہت جگہ ایسا ہوا ہے کہ بہت سے لوگوں نے کلمہ کو کافی سمجھا ہے کہ بات اچھی طرح (TACTFULLY) کہی جارہی ہے، لیکن وہ خود بجائے خود صحیح ہے، اس کا رشتہ صحیح ہے، وہ خالق کائنات سے الہام اور اس کی رہبری سے اخذ کی گئی ہے، وہ صحف سماویہ سے لی گئی ہے، وہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے ماخوذ ہے، یا صرف اس میں انسان کی فصاحت و بلاغت ہی ہے، اس کا زور بیان ہے، اس کی شاعری کی لطافت ہے؟

کلمۂ طیبہ کی مثال دینے کے لیے دنیا میں سیکڑوں، ہزاروں چیزیں ہو سکتی تھیں، موتی، جواہرات، سونا، چاندی، پھول، پھل سب سے تشبیہ دی جاسکتی تھی، لیکن "کلمہ طیبہ" کے بارآور ہونے اور اس کے ثمر دار ہونے اور اخیر عہد تک اس کے کام کرتے رہنے کی مثال درخت سے بہتر نہیں ہو سکتی، درخت کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ وہ شجرۂ طیبہ ہو، یہ نہیں کہ آپ نیم کا درخت لگالیں اور آپ اس سے آم

کے امید رکھیں، آپ کانٹے بوئیں اور آپ اس سے پھول کی توقع کریں، خود وہ شجرہ بھی طیبہ ہونا چاہئے جیسے کلمہ طیبہ ہوتا ہے، اس کی تعریف میں کہا گیا ہے "شجرۃ طیبۃ" اب اس کے بعد قرآن کا اعجاز ہے وہ کہتا ہے: "اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ جس کی جڑ مضبوط ہو اور شاخیں آسمان میں۔" آپ ان الفاظ کی وسعت اور ان کی لطافت پر غور کریں تو ان میں سب کچھ کہدیا گیا ہے، اس میں ادیان سماویہ کی تاریخ آگئی، اس میں نبوات اور پیغمبروں کی مساعی اور کوششوں کی تاریخ آگئی، اس میں اُن روحانی تبدیلیوں اور انقلابات کی تاریخ آگئی، جس کا احاطہ اس وقت تک نہیں کیا گیا، اور احاطہ کرنا مشکل ہے، سیکڑوں نہیں، ہزاروں نہیں، لاکھوں مثالیں ایسی ہوں گی مخلصین کے کلام کی کہ جن کا کوئی ریکارڈ ہمارے سامنے نہیں ہے۔

تو ایک تو یہ کہ وہ ایسا شجرۂ طیبہ ہو کہ "اَصْلُهَا ثَابِتٌ" اس کی جڑ تو زمین میں ہوگی "وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ" اور اس کی شاخ آسمان سے باتیں کرتی ہوگی، ایک انسان کی زبان سے کلمہ نکلے گا، لیکن وہ قوموں کی تقدیر بدل دے گا، زمانہ کا رخ بدل دے گا، سوچنے کا طریقہ بدل دے گا، قوموں کی قومیں دین حق میں داخل ہوں گی۔

اس کے لئے ایک مثال جو اس وقت میرے ذہن میں آئی آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ آپ یہ دیکھیں کہ ایک چھوٹا سا کلمہ کیا کام کرتا ہے؟ اس کے لیے میں عرض کردوں اپنے فاضل دوستوں کے سامنے کہ محض مطالعہ، محض ذہانت، محض پیش کرنے کا بہتر سے بہتر طریقہ، الفاظ کا انتخاب، انشاء پردازی، اور خطابت کا زور تنہا کافی نہیں ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دل کی گہرائیوں سے نکلا ہو، اور اسلام کو جو اس وقت آپ دنیا میں پھیلا ہوا دیکھ رہے ہیں، اسلام کی جو فتوحات ہیں، ان میں ایک بہت بڑا عامل (Factor) یہ تھا کہ جو بات دل سے نکلتی

ہے اثر رکھتی ہے ؎

ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد

اس کی ایک مثال میں دیتا ہوں جو اس وقت میرے ذہن میں آئی ہے، مثالیں تو بہت ہیں، پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ (T. W. Arnold) نے اپنی کتاب (PREACHING OF ISLAM) میں ایک واقعہ لکھا ہے، ترکی اور ایرانی تاریخوں میں یہ بھی واقعہ آیا ہے، لیکن تھوڑے فرق کے ساتھ، پہلے تو میں "آرنلڈ" کے بیان کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اس کے بعد پھر ترکی اور فارسی تاریخوں میں جو واقعہ مذکور ہے وہ بیان کروں گا۔ تو قلق تیمور تاتاریوں کی ایک شاخ کا شاہزادہ تھا، جس کا پایۂ تخت کاشغر تھا، آپ کو معلوم ہے کہ ساتویں صدی ہجری اور تیرہویں صدی عیسوی میں تاتاریوں نے ترکستان اور ایران پر حملہ کیا اور پھر اس کے بعد وہ بغداد تک پہنچ گئے، اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور عالم اسلامی کی چُولیں ہلادیں، ایسا نظر آنے لگا کہ اب اسلام دنیا میں ایک طاقت کی حیثیت سے باقی نہیں رہے گا، ان کی ایک شاخ (وہ مختلف شاخوں میں تقسیم ہو گئے تھے) جو ترکستان پر حکمراں تھی، (یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ اس وقت ترکستان میں ایک نیا انقلاب ہوا ہے اور ہم اس حالت میں اس کا ذکر کر رہے ہیں کہ، اس کا نام لینے سے ہمارے دل پر چوٹ نہیں لگتی) جس میں ایران بھی شامل تھا، اس کا وہ ولی عہد تھا، ابھی اس کی تاج پوشی نہیں ہوئی تھی تاج پوشی کے بعد وہ اس پورے قلمرو کا حکمراں ہوتا وہ شکار کے لئے نکلا اور آپ کو معلوم ہے (شاید آپ میں سے بہت سے لوگ شکار کھیلے ہوں) کہ شکاریوں کے کچھ توہمات ہوتے ہیں، ان کے یہاں کچھ روایات ہوتی ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں وہ محض اتفاقات ہوتے ہیں۔ لیکن خدا کو کچھ اور

منظور تھا، تو قلق تیمور ہرن کا شیر کا شکار کرنا چاہتا تھا، اور اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ دین حق اس کو اپنا اسیر اور تابع بنالے اور تاتاریوں کی ایک پوری شاخ اسلام کی حلقہ بگوش بن جائے۔

تو قلق تیمور اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں شکار کے لئے نکلا، ہر طرف پہرے بٹھادیے گئے کہ کوئی باہر کا آدمی شکار گاہ میں داخل نہ ہونے پائے، ایک ایرانی بزرگ شیخ جمال الدین کہیں جارہے تھے، وہ نادانستہ اس شکار گاہ میں داخل ہوگئے، ان کو مشکیں باندھ کر شہزادہ کے سامنے حاضر کیا گیا، خان نے ان سے غضبناک ہوکر کہا کہ ایک ایرانی سے تو کتا ہی بہتر ہوتا ہے، شیخ نے کہا کہ ہاں یہ سچ ہے، اگر ہم کو اللہ تعالیٰ دین حق کی نعمت و عزت نصیب نہ فرماتا تو ہم سے کتا ہی بہتر ہوتا، خان نے شیخ سے پوچھا کہ دین برحق کیا چیز ہے؟ شیخ نے اسلام کے عقائد ایسی گرم جوشی اور ایسے دینی ولولہ سے بیان کئے کہ اس کا پتھر کا دل موم کی طرح پگھل گیا، شیخ نے حالت کفر کا بھی ایسا ہیبتناک نقشہ کھینچا کہ خان پر لرزہ طاری ہوگیا، خان نے شیخ سے کہا کہ جب آپ سنیں کہ میری تاج پوشی ہوگئی تو آپ مجھ سے ضرور ملیں۔

یہ دل سے نکلی ہوئی بات تھی اس لئے اس میں کوئی منطقی اثر ہو یا نہ ہو، لیکن اس کے دل پر اس کا اثر پڑا، اور یہ من جانب اللہ بات تھی، یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جب تک دعوت میں وہ دل شامل نہ ہو جو نور باطن سے منور اور دردمند ہے، اور وہ بات دل کی گہرائی سے نہ نکلی ہو تو اس کا وہ اثر نہیں ہو سکتا کہ زندگی میں انقلاب پیدا کردے۔

یہ تو روایت ہے آرنلڈ کی، لیکن ترکی اور فارسی کے مآخذ میں جو زیادہ معتبر

ہیں یہ ہے کہ اس نے ان سے پوچھا کہ کتنا زیادہ عزت رکھتا ہے یا ایرانی؟ انہوں نے نہایت اطمینان سے یہ جواب دیا کہ ابھی اس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، اس نے کہا ابھی اس کا فیصلہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ یا کہو کتنا زیادہ عزت رکھتا ہے یا کہو کہ میں، وہ اس کی تیاری میں تھا کہ اگر وہ یہ کہہ دیتے کہ میں بہتر ہوں تو وہ تلوار سے ان کا سر اڑا دیتا، اور اگر کہتے کہ کتنا زیادہ عزت والا ہے تو کہتا کہ چلے جاؤ، اس نے کہا کہ اس میں انتظار کی کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ اگر میرا خاتمہ ایمان پر ہوا تو میں عزت والا ہوں ورنہ یہ کتا معزز ہے، اس نے پوچھا کہ ایمان کیا ہوتا ہے؟ انہوں نے ایمان کی تشریح کی۔

اس کے بعد وہ برابر اس کے انتظار میں رہے کہ یہ اطلاع ملے کہ تغلق تیمور کی تاجپوشی ہو گئی ہو تو میں جاؤں اور یہ واقعہ یاد دلاؤں، لیکن ان کی قسمت میں نہیں تھا، جب وہ عالم سکرات میں تھے، آخری وقت تھا تو انہوں نے اپنے صاحبزادہ شیخ رشید الدین کو بلایا اور کہا کہ دیکھو بیٹا! میری قسمت میں تو یہ سعادت نہیں تھی، لیکن شاید تمہاری قسمت میں ہو، جب سننا کہ تو تغلق تیمور کی تاج پوشی ہو گئی اور وہ بادشاہ ہو گیا تو اس سے ملنا اور یہ واقعہ یاد دلانا۔

یہاں سے آرنلڈ اور ترکی کتابوں کا بیان مشترک ہے وہ یہ کہ جب شیخ رشید الدین نے سنا کہ تو تغلق تیمور کی تاج پوشی ہو گئی تو وہ گئے، اس کے شاہی محل میں انکو کون اندر جانے دیتا، جب ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو انھوں نے ذرا فاصلہ پر ایک درخت کے نیچے مصلّٰی بچھا لیا اور وہاں نماز پڑھنی شروع کی، جب نماز کا وقت آتا اذان دیتے اور نماز پڑھتے اور وقتوں میں تو اذان کی آواز نہیں پہونچتی، لیکن فجر میں ایک دن جو کہ سناٹے کا وقت ہوتا ہے محل میں آواز آئی، اس نے پوچھا کہ یہ

کیا ہے؟ یہ کیسی مجنونانہ صدا ہے؟ یہ کیا صدائے بے ہنگام ہے؟ لوگوں نے کہا کہ بادشاہ سلامت! (وہ جس طرح بھی خطاب کرتے ہوں) ایک مجذوب سا شخص ہے، وہ کچھ اٹھتا بیٹھتا ہے، اور یہ آواز لگاتا ہے، اس نے کہا کہ پکڑ لاؤ اسے، وہ لائے گئے تو اس نے کہا تم کون ہو؟ اور یہ کیا آواز لگاتے ہو؟ انھوں نے کہا آپ کو کچھ یاد ہے ایک مرتبہ آپ شکار میں گئے تھے، تو ایک ایرانی عالم آپ کو ملے تھے شیخ جمال الدین، ان سے آپ کا کچھ مکالمہ ہوا تھا، اس نے کہا کہ ہاں یاد ہے، انھوں نے کہا کہ میں یہ شہادت دینے آیا ہوں کہ انکا ایمان پر خاتمہ ہوا، اسنے اسی وقت کلمہ پڑھا، آرنلڈ نے بھی یہ لکھا ہے، اور ترکی فارسی کتابوں میں بھی یہی لکھا ہے، اس نے کلمہ پڑھا اور اپنے ایک رازدار اور سر برآوردہ امیر کو بلایا اور تنہائی میں کہا کہ دیکھو میں نے اپنے متعلق فیصلہ کیا ہے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اب تم اپنے متعلق سوچو، انہوں نے کہا کہ حضور میں تو بہت دنوں سے مسلمان ہوں، آپ کے ڈر سے ظاہر نہیں کرتا تھا، اس کے بعد پھر اس طرح پوری کی پوری شاخ سو فیصدی مسلمان ہو گئی۔

میں عرض کر رہا تھا "شجرۂ طیبۃ" یہ محض اتفاقی لفظ نہیں ہے، قرآن مجید میں کوئی اتفاقی لفظ نہیں ہوتا، پہلی شرط یہ ہے کہ "شجرۂ طیبہ" ہو، یہ نہیں کہ آپ برگد کا درخت لگا دیں، نیم کا درخت لگا دیں، کانٹے بو دیں اور آپ ان سے اچھے پھل پھول کی امید کریں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ "شجرۂ طیبہ" ہو پھر اس شجرۂ طیبہ کی جو صفت خدا نے بیان کی وہ بالکل اس کے دین کی صفت ہے کہ "اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ" جڑ تمہیں نظر آئے گی زمین پر، اور شاخیں تمہیں نظر آئیں گی آسمان پر، اب آپ اسلام کی تاریخ پڑھئے کہ کس پستی کی حالت میں، کس بے سروسامانی کی حالت

میں، کس کمزوری کی حالت میں اس کی ابتدا ہوئی اور پھر اس کی شاخیں کہاں تک پہنچیں؟

"تُؤْتِی اُکُلَهَا کُلَّ حِینٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا" یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے، ہر زمانہ میں وہ اللہ کے حکم سے پھل دیتا رہے گا، یہ محض "شجرۂ طیبہ" نہیں "شجرۂ طیبہ خالدہ" ہے، یہ زمانہ کے تغیرات کا تابع نہیں ہے، بہت سے درخت ہیں، جو اپنی عمر پوری کر لیتے ہیں، اور ختم ہو جاتے ہیں، جانور ان کو تباہ کر دیتے ہیں، اور خود ان کا لگانے والا کبھی ان کو کاٹ دیتا ہے، تو اس میں بتایا کہ اس کی مکانی وسعت تو یہ ہے کہ وہ زمین سے اٹھتا ہے اور آسمان تک جاتا ہے، یہ تو اس کی مکانی وسعت ہے، اور زمانی وسعت یہ ہے کہ "تُؤْتِی اُکُلَهَا کُلَّ حِینٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا" وہ اپنے پھل ہر زمانے میں اللہ کے حکم سے دیتا ہے۔

اب آپ دیکھئے یہ برطانیہ ہے، جب اس کی حکومت ہندوستان کے برصغیر پر تھی تو کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ خاص اس کے دارالحکومت لندن میں اور اس کے قرب وجوار میں اسلامی مطالعہ کے مراکز قائم ہوں گے، اور اسلام کی دعوت وہاں پیش کی جائے گی، ایک وقت تو ایسا آیا تھا کہ ہندوستان میں عیسائیت کے مبلغ (پادری) میدان میں آگئے تھے، اور انہوں نے حکومت کو بھی یہ یقین دلا دیا تھا کہ یسوع مسیح نے ہم کو یہ ملک دیا ہے، اور ہمیں ان کے مذہب کی تبلیغ کرنی چاہئے، مسلمانوں کے (خاکم بدہن) ارتداد کا بڑے پیمانے پر خطرہ پیدا ہو گیا تھا، اس کی بنا پر مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی نے "اظہار الحق" جیسی معرکۃ الآراء کتاب لکھی اور آگرہ میں پادری فنڈر سے ان کا مناظرہ ہوا جس میں اس کی شکست فاش ہوئی، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے اس خطرہ سے ندوۃ العلماء کی تحریک چلائی، مجھے

معلوم ہے کہ اس کے پس منظر (BACKGROUND) میں عیسائی مبلغین کی سرگرمیوں اور ان کے نتائج کا خطرہ کام کر رہا تھا، انہوں نے ایسے علماء و مبلغین کا تیار کرنا ضروری سمجھا جو دوسرے مذاہب کا مطالعہ کر سکیں، وہ کسی مغربی زبان (بالخصوص انگریزی سے) بھی واقف ہوں اور جغرافیہ اور تاریخ سے بھی آشنا ہوں، اور اس نئی نسل کو اس کی مانوس زبان میں خطاب کر سکیں اور مسائل حاضرہ میں مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔

"تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا" ہر زمانہ میں وہ پھل دے گا اللہ کے حکم سے، آج آپ اپنی آنکھوں سے اس آیت کا تحقق دیکھ رہے ہیں کہ وہ شجرۂ طیبہ جو آخری رسول نے لگایا تھا اور جس کی جڑ زمین میں تھی، کہاں تھی؟ جزیرۃ العرب میں تھی، جو سیاسی حیثیت سے، فکری حیثیت سے، علمی حیثیت سے، اور مالی حیثیت سے، ہر حیثیت سے دنیا کا پسماندہ ترین علاقہ تھا، اور ساری دنیا سے کٹا ہوا تھا" أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ "اس کی شاخیں کہاں تک گئیں؟ اس کی شاخیں آسمان تک گئیں، آپ دیکھیں کہ اس کی اشاعت و فتوحات کے نتیجہ میں کتنی سلطنتیں پیدا ہوئیں، اس کے نتیجہ میں کتنی دانش گاہیں، کتنی جامعات وجود میں آئیں، کتنے مراکز ہدایت و تربیت قائم ہوئے کتنے محقق پیدا ہوئے، کتنے مفکر پیدا ہوئے، کتنے ادیب پیدا ہوئے اور کتنا بڑا لٹریچر تیار ہوا، کسی ایک زبان میں بھی اگر آپ اس کا احاطہ کرنا چاہیں تو مشکل ہے، جو کلمہ کہا گیا تھا، جزیرۃ العرب میں بیٹھ کر وہ کلمہ آج ساری دنیا میں پھیل رہا ہے، اور وہ اپنے پھل دے رہا ہے، شجرۂ طیبہ کی طرح پھل پھول رہا ہے۔

اس وقت کسی طویل تقریر کی ضرورت نہیں، اہل علم کا مجمع ہے، اہل فکر

اور مطالعہ کرنے والوں کا مجمع ہے، میں عرض کروں گا کہ دعوت کے لئے دو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔

ایک تو واقفیت کی ضرورت ہے کہ نفسیات انسانی سے واقفیت ہو۔ اور زبان کی ضرورت ہے، زبان کی بڑی اہمیت ہے اور آپ حضرات نے بہت صحیح قدم اٹھایا ہے، میں اس کی داد دیتا ہوں اور اس کی تحسین کرتا ہوں کہ آپ نے بہتر سے بہتر انگریزی زبان میں اسلام کو پیش کرنے کا انتظام کیا ہے اور اس کے لئے آپ لوگوں کو تیار کر رہے ہیں، تو ایک تو عقل سلیم کی، ذہانت کی ضرورت ہے، اور دوسرے زبان کی ضروت ہے کہ اچھی سے اچھی زبان میں دعوت دی جائے، بہت سے حلقوں میں یہ غلط فہمی ہے کہ زبان کی کوئی اہمیت نہیں ہے، آدمی کو جس طرح بن پڑے، اپنے خیالات ظاہر کر دینے چاہئیں، لیکن جب ہم سیدنا عبد القادر جیسے زاہد فی الدنیا اور متوکل علی اللہ اور ان سے پہلے امام حسن بصری کے مواعظ پڑھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ زبان کی کیا اہمیت ہے، اور انہوں نے زبان کو کیا اہمیت دی ہے اور کس زبان میں انہوں نے اپنے مخاطبین اور معاصر نسل کو خطاب کیا ہے کہ اس سے بہتر مشکل ہے، یہ مسلم ہے، عربی ادب کی تاریخ میں کہ حجاج اور حسن بصری سے بڑا کوئی بلیغ نہ تھا، اور حسن بصری کو فوقیت حاصل ہے، حجاج پر، پھر اس کے بعد ہر دور میں آپ دیکھیں گے، حضرت علی مرتضیٰؓ کو چھوڑ دیجئے وہ تو ابلغ البلغاء تھے، لیکن اس کے بعد ہر دور میں آپ دیکھیں گے، آپ ابن الجوزی کو لیجئے، اعلیٰ سے اعلیٰ زبان انہوں نے استعمال کی، اور تاریخ و ادب کے ایک مدرس کی حیثیت سے بھی اور ادب کے نمونوں کو جمع کرنے والے ایک جامع کی حیثیت بھی کہتا ہوں کہ جن کی طرف خیال بھی نہیں جا سکتا تھا ان کی کتابوں میں وہ ادبی ٹکڑے ملتے ہیں

جن کو ادب کے شہ پارے (MASTER PIECE) کہنا چاہئے ہم نے اس سلسلہ میں امام ابن تیمیہ کا بھی نام لیا ہے، اور شیخ محی الدین ابن عربی کا بھی نام لیا ہے، جہاں خیال بھی نہیں جا سکتا ہے، وہاں بھی آپ کو ایسے ادبی نمونے ملیں گے، پھر سیدنا عبد القادر جیلانیؒ سے بڑھ کر دنیا میں زاہد اور مدح و ذم سے بے پرواہ کون ہوگا؟ ان کے جو مواعظ محفوظ ہیں، ان کو دیکھئے اور میں یہ عرض کروں گا کہ بزرگوں کے مواعظ زیادہ قابل اعتبار ہیں، اس لئے کہ لوگوں نے تبرکاً ان کو جوں کا توں نقل کیا ہے، بادشاہوں کے فرامین یا ادباء کا کلام اتنا محفوظ نہیں ہے، اس کو لوگ بدل دیتے ہیں، لیکن بزرگوں کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو لوگ بجنسہٖ نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ان میں برکت سمجھتے ہیں، یہ بات تاریخی و ادبی لحاظ سے بھی ایک واقعہ ہے کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، پورے وثوق کے ساتھ کہ یہ انہیں کے الفاظ ہیں، اگر آپ ان کے مواعظ کے مجموعہ کو دیکھیں تو آپ کو حیرت ہوگی، بعض مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل گرج رہا ہے، اور بجلیاں کوندرہی ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ اب بجلی گری، اب بجلی گری۔

تو ایک تو چیز ہے علم و معرفت، دوسری چیز ہے زبان کی تاثیر اور قوت اور تیسری چیز ہے اخلاص و دردمندی، یعنی خود دل پر چوٹ ہو اور جو چیز نکلے صرف قلم سے نہ نکلے بلکہ قلب سے نکلے تب اس کا اثر ہوگا، اگر ہم نے ان "عناصرِ اربعہ" کا خیال رکھا تو مغربی ممالک میں، اور اس نئے بدلے ہوئے زمانہ میں اور مختلف زبانوں کے بولنے والوں میں تحریری و تقریری طور پر دین صحیح کی دعوت ضرور اثر انداز ہوگی، اور اللہ تعالیٰ اس کے بہتر سے بہتر نتائج عطا فرمائے گا، اس میں ہمارے لئے بہت بڑی بشارت اور فال نیک ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ"

بِاِذْنِ رَبِّهَا" ورنہ آدمی یہ کہتا ہے کہ زمانہ گذر گیا، اب یہ بیسویں صدی ہے، دنیا نے کتنی ترقی کر لی ہے، سائنس، پالیٹکس، ٹکنالوجی کی ترقی کہاں سے کہاں پہنچی، ذہن و فکر کا معیار بدل گیا ہے، اب وہ زمانہ نہیں رہا، اب اس وقت اسلام کی دعوت کوئی اثر نہیں کریگی، تو قرآن نے "تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا" کہہ کر تسلی دی ہے اور تقویت کا سامان کیا ہے کہ کسی زمانہ کے، کسی جگہ کے لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے اسلام کی دعوت دینے کا کیا فائدہ؟ قرآن نے " کل حین" کہہ کر زمانہ کی تحدید کو ختم کر دیا۔

لیکن یہ سب اللہ کے ارادہ اور قدرت سے ہو گا اس نے "باذن ربھا" کہہ کر یہ بتا دیا کہ اپنی ذہانت پر، اپنی زبان کی مہارت پر اعتماد نہ کرو، بلکہ یہ بھی سمجھو کہ اللہ ہی اگر چاہے گا تو اثر ہو گا، اس کے اندر دعوت کا پورا نقشہ آگیا ہے۔

میں اس کو محض اتفاقی بات نہیں کہوں گا، میں اتفاقات کا قائل نہیں، یہ بھی منجانب اللہ بات تھی، میں یہاں آکر اس کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور میرا ذہن خالی تھا، میں نے سوچا کہ تقریر کہاں سے شروع کروں گا؟ قاری صاحب کو اللہ جزائے خیر دے انہوں نے یہ آیت پڑھی اور میں نے کئی بار تجربہ کیا، امریکہ اور یورپ کے دورہ میں خاص طور پر کہ میں بعض اوقات بالکل خالی الذہن ہوتا تھا، پے در پے پروگرام ہوتے تھے، ابھی ایک جگہ سے آیا، دوسری جگہ سے آیا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں اور کیا بات کہوں، میں نے قاری پر چھوڑ دیا، قاری نے آیت پڑھی اور گویا بالکل میرے لئے آیت پڑھی۔

حضرات!

میں اس مرکز کے ذمہ داروں، خاص طور پر محترمی مناظر احسن صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے مدعو کر کے اس قابل قدر مرکز کے معائنہ کا موقع دیا، میں آپ کے علمی، تحقیقی اور تربیتی واشاعتی شعبوں، اور اس عظیم عمارت اور اس کے سلیقہ و نظام کو دیکھ کر بہت مسرور ہوں، لیکن میں دین کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ بات ضرور کہوں گا کہ دعوتی و تعلیمی مرکز کو کسی خاص مکتب خیال، دعوت و جماعت کی تشہیر و دعوت کا ذریعہ نہ بنایا جائے، صرف اللہ کی رضا مطلوب ہو، اور یہ کہ اسلام اپنی صحیح و عمومی شکل میں دوسروں تک پہنچے اور اللہ ان کو ہدایت دے، اس کا ثواب ان کو ضرور پہنچے گا، جنہوں نے اسلام کے تعارف و تفہیم کی طرف رہبری کی اور اس کا سامان مہیا اور مواد فراہم کیا، لیکن اس میں جماعتی عصبیت یا شخصی تقدس و عظمت کا عقیدہ نہیں ہونا چاہئے، اسلام کو بحیثیت اسلام و دین حق کے پیش کرنا چاہئے، اس میں کسی کی اجارہ داری نہیں، ہمارا شعار اور اعلان خاص طور پر عیسائی ملک اور مغربی ماحول میں وہی ہونا چاہئے جس کی قرآن نے تعلیم دی ہے: "تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ" (جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی) ہے اس کی طرف آؤ وہ یہ کہ خدا کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے۔

میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہ اعزاز بخشا، اعتماد کا اظہار فرمایا اور خطاب کا موقع دیا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

خرابی کی جڑ یہ ہے کہ بُرائی اور پاپ کی خواہش پیدا ہو گئی ہے

۹ر جنوری ۱۹۵۴ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں ایک مخلوط اجتماع میں جس میں شہر کے سربرآوردہ حضرات اور غیر مسلم تعلیم یافتہ اصحاب کی خاصی تعداد شریک تھی، یہ تقریر کی گئی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خرابی کی جڑ یہ ہے کہ بُرائی اور پاپ کی خواہش پیدا ہو گئی ہے

تاریخ کا مطالعہ

دوستو اور بھائیو! آپ میں اکثر لوگوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہوگا، انسان آج نئے نہیں ہیں، وہ ہزاروں برس سے آباد ہیں، ان کی سیکڑوں برس کی تاریخ محفوظ ہے، اس تاریخ کی سطح پانی سطح کی طرح برابر نہیں، اس میں سخت نشیب و فراز ہے، اس میں آدمی کہیں اونچا نظر آتا ہے کہیں نیچا، کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ یہ انسان کی تاریخ نہیں، خونخواروں اور درندوں کی تاریخ ہے، سب کی تاریخ ہے، مگر انسان کی تاریخ نہیں، اس کے مطالعہ سے انسانوں کا سر جھک جاتا ہے کہ ہم میں ایسے افراد

بھی گزرے ہیں، یہ فیصلہ تو آئندہ آنے والی نسلیں کریں گی کہ ہم اور آپ کیسے آدمی تھے، لیکن یہ اندازہ ہم کر سکتے ہیں کہ انسانوں کا پچھلا ریکارڈ کیسا ہے؟ اس میں بعض ایسے دور نظر آتے ہیں کہ اگر بس چلے تو تاریخ سے ہم ان اوراق کو نکال دیں، ایسا ریکارڈ ہے کہ ہم بچوں کے ہاتھوں میں دینے کو تیار نہیں، مجھے اس کی کہانی سنانی نہیں، لیکن مجھے ایک حقیقت کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ تاریخ میں جو ایسے ناگوار دور گزرے ہیں اس میں خرابی کی جڑ کیا ہے؟

جب تک سوسائٹی میں برائی کا رجحان اور بگاڑ کی صلاحیت نہ ہو کوئی اس کو بگاڑ نہیں سکتا

حضرات! عام طور پر لوگ کسی خاص طبقہ یا چند افراد اور بعض اوقات تنہا کسی فرد کو پوری سوسائٹی کی خرابی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ان خراب عناصر نے یا اس بگڑے ہوئے فرد نے پوری زندگی کو غلط رخ پر ڈال دیا تھا، لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں، میں تاریخ کے مطالعہ کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ ایک مچھلی تالاب کو گندہ کر سکتی ہے، لیکن ایک فرد سوسائٹی کو بگاڑ نہیں سکتا، واقعہ یہ ہے کہ اچھی سوسائٹی میں بُرے آدمی کا گزر نہیں ہو سکتا، وہ گھُٹ گھُٹ کر مر جائے گا۔ جس طرح مچھلی کو پانی سے نکال دیا جاتا ہے تو وہ گھٹ کر مر جاتی ہے، اسی طرح جو سوسائٹی برائی کی ہمت افزائی نہیں کرتی وہ اسے خوش آمدید (WELCOME) کرنے کے لئے تیار نہیں، اس میں برائی تڑپنے لگے گی، اس کا دم گھُٹنے لگے گا اور وہ دم توڑ دے گی۔

ہر زمانے میں اچھے بُرے انسان ہوئے ہیں، لیکن سب بُرائیوں کا ان کو

ذمہ دار ٹھہرانا اور تمام برائیوں کو ان کے سر تھوپ دینا ٹھیک نہیں، اگر کچھ برے لوگ حاوی ہوگئے تھے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ پوری زندگی کا ہینڈل ان کے ہاتھ میں تھا، وہ جس طرف چاہتے تھے، زندگی کو موڑ دیتے تھے، بلکہ بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں سوسائٹی میں خود خرابی آگئی تھی، اس زمانہ کا ضمیر (-CONSCI ENCE) گندہ ہوگیا تھا، اس میں برائیوں کا رجحان پیدا ہوگیا تھا، اس کے اندر اندھیر، ظلم اور خواہشات کو پورا کرنے کی زبردست خواہش پیدا ہوگئی تھی وہ خود غرض اور نفس پرست بن گیا تھا، جس دل کو گھُن لگ جائے، جو مَن پاپی ہو جائے، آپ اسے جرائم سے کسی طرح روک نہیں سکتے، آپ اس کو بیڑیوں میں جکڑ کر کے بھی رکھیں گے تب بھی ان چیزوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

خود غرض انسان

ہر زمانہ میں کچھ ایسے افراد رہے ہیں، جن کا عقیدہ تھا کہ بس ہم اور ہمارے اہل و عیال انسان ہیں، اور سب ہمارے خادم ہیں، کچھ ایسے انسان بھی ہیں، جو کروڑوں انسانوں کو بستا دیکھتے ہیں، لیکن وہ خود اپنے ہی محدود حلقہ کو انسان سمجھتے ہیں، یہ لوگ بس یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں بس انہیں کے کنبہ کے دس گیارہ یا بیس، پچیس انسان بستے ہیں، ایسے انسان ہمیشہ رہے ہیں، جو اپنے اپنے مسائل اور متعلقین کو دیکھنے کے لیے خوردبین رکھتے ہیں، اور دوسروں کو دیکھنے کے لئے ان کی آنکھیں بھی بند ہوتی ہیں، بعض لوگ دو عینکیں رکھتے ہیں، ایک سے اپنے کو دیکھتے ہیں، دوسری سے تمام دنیا کو دیکھتے ہیں، انہیں نظر بھی نہیں آتا کہ انسان کہاں ہیں، میرا اندازہ ہے کہ ان کے پاس وہ عینک ہے کہ اس کے ذریعہ ان کو اپنے بچے آسمان سے باتیں

کرتے نظر آتے ہیں، ان کو اپنی رائی پربت اور دوسروں کا پہاڑ ذرہ نظر آتا ہے۔

اصلاح اور سدھار کی مختلف تجاویز اور تجربے

دنیا کے مختلف انسانوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق زندگی کے سُدھار کے طریقے سوچے اور ان پر عمل کرنا شروع کردیا۔

کسی نے کہا کہ ساری خرابی کی جڑ یہ ہے کہ انسانوں کو پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا، یہی زندگی کا سب سے بڑا روگ ہے، انہوں نے اسی مسئلہ کو اپنا مشن بنالیا، اس کے نتیجہ میں پاپ اور بڑھا، پہلے لوگ کمزور تھے، پاپ بھی اسی لحاظ سے کمزور تھا، انہوں نے جب خون کے انجکشن دیئے اور قوت حیات (VITALITY) بڑھائی تو ان کے پاپ بھی طاقتور ہوگئے، دل بدلا نہیں، ضمیر بدلا نہیں، ذہن بدلا نہیں، طاقت بڑھ گئی، بے فکری پیدا ہوگئی، فرق اتنا ہوا کہ پہلے پھٹے کپڑوں میں پاپ ہوتے تھے اب زرق برق لباسوں میں پاپ ہونے لگے، پہلے بے زور اور بے ہنر ہاتھوں سے گناہ ہوتے تھے، اب طاقتور اور ہنر مند ہاتھوں سے وہی سب گناہ ہونے لگے۔

کسی نے کہا تعلیم کا انتظام کیا جائے، جہالت، ناخواندگی ہی فساد کی جڑ ہے اور تمام خرابیوں کی اصل وجہ ہے، علم بڑھا لوگوں نے معلومات حاصل کئے اور نئی نئی زبانیں سیکھیں، لیکن جن کا ضمیر فاسد اور ذہن ٹیڑھا تھا، اور دل کے اندر پاپ بسا ہوا تھا، انہوں نے علم کو فساد اور تخریب کا ذریعہ بنالیا، کھلی بات ہے کہ اگر چور کو لوہاری کا فن آجائے تو وہ تجوری توڑنا سیکھے گا۔ اب اگر کسی میں خدا کا خوف اور انسانی ہمدردی کا رجحان نہیں ہے، اور ظلم و ستم اس کے خمیر میں پڑا ہوا ہے تو علم اس کے

ہاتھ میں ظلم اور فتنہ و فساد کا آلہ دے دے گا۔ اور اس کو گناہ اور چوری کے نئے نئے ڈھنگ سکھائے گا۔

بعض لوگوں نے تنظیم کو اصلاح کا ذریعہ سمجھا اور اپنی ساری قوتیں لوگوں کی تنظیم پر صَرف کیں، نتیجہ ہوا کہ بگڑے ہوئے افراد کا ایک بگڑا ہوا مجموعہ تیار ہو گیا، جو کام اب تک غیر منظم طریقے پر ہوتے تھے، اب منظم طریقہ پر ہونے لگے، اب سازش اور تنظیم کے ساتھ منظم چوریاں ہونے لگیں، لوگوں نے اخلاقی تربیت، دل اور ضمیر کی اصلاح کی طرف تو توجہ کی نہیں، جیسے بُرے بھلے لوگ تھے، ان کو منظم کرنے ہی کو کام سمجھا، نتیجہ یہ ہوا کہ بد اخلاقی کو نئی طاقت حاصل ہو گئی، میں تو کہوں گا کہ ڈاکوؤں اور چوروں اور بد اخلاقوں کی تنظیم نہ ہوتی تو اچھا تھا۔

کسی نے کہا کہ زبانوں کا اختلاف اور کثرت فتنہ و فسا کی جڑ ہے، زبان ایک اور مشترک ہونی چاہیے اسی میں ملک کی ترقی، قوم کی خوشحالی اور انسانیت کی خدمت ہے، لیکن اگر لوگ نہ بدلیں، خیالات نہ بدلیں، دلوں کی خواہشات اور اندر کے رجحانات نہ بدلیں، تو زبان کے بدل جانے یا بولی کے ایک ہو جانے سے کیا خاص فائدہ ہو گا، فرض کیجیے کہ اگر ساری دنیا کے چور اور جرائم پیشہ ایک بولی بولنے لگیں، اور ایک ہی زبان اختیار کر لیں تو اس سے دنیا کو کیا فائدہ ہو گا، اور اس سے چوری اور جرائم کا کیا سدباب ہو گا؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس سے بجائے اس کے کہ چوری اور جرائم کم ہوں، زیادہ ہوں گے اور مجرم کی شناخت میں اور دقت ہو گی۔

کسی نے کہا کہ وقت کا سب سے بڑا کام اور انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ کلچر ایک ہو جائے، مگر کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یہاں تہذیبیں نہیں ٹکراتیں، ہوس ٹکراتی ہے ''ہم چو ما دیگرے نیست'' کا مہلک جذبہ ٹکراتا ہے،

ہمارے بہت سے رہنما بے سوچے سمجھے کہنے لگے ہیں کہ اگر تمام دنیا کا کلچر ایک ہو جائے تو انسانیت کی ناؤ پار لگ جائے گی، اگر پورے ملک کا کلچر ایک ہو جائے تو اس ملک کا رہنے والے شیر و شکر ہو جائیں گے، لیکن دوستو! کلچر کا ایک ہونا مفید نہیں دل کا ایک ہونا مفید ہے، کہنے والے نے غلط نہیں کہا کہ :-

یک دلی از یک زبانی بہتر است

اگر لوگ ایک دل نہ ہوئے تو ایک زبان یا تہذیب ہونے سے کچھ فائدہ نہیں، جو لوگ پہلے سے ایک زبان ہیں، اور جن کی تہذیب اور کلچر مشترک ہے، انہیں میں کون سی محبت اور اتحاد ہے، کیا وہ ایک دوسرے پر ظلم نہیں کرتے، کیا وہ ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دیتے، کیا ان میں سے ایک دوسرے سے عاجز اور پریشان نہیں ہیں، کیا ایک کلچر، ایک زبان اور ایک تہذیب کے لوگ آپس میں نہیں لڑتے۔

بعضوں نے کہا کہ لباس ایک ہو لیکن جب کسی زبردست کو گریباں پکڑنے کی عادت پڑ جائے، اور جیب کترنے کی لت لگ جائے تو کیا وہ لباس کا احترام کرے گا، کیا وہ محض اس وجہ سے اپنے ارادہ سے باز رہے گا کہ اسی کا جیسا لباس دوسرے کے جسم پر ہے، انسانیت کا احترام دل میں نہ ہو تو لباس کا احترام کیسے پیدا ہوگا؟ لباس کی قدر و قیمت تو انسان کی وجہ سے ہے۔

دل کی تبدیلی کے بغیر زندگی تبدیل نہیں ہو سکتی

دوستو! انسانیت کے مسائل اور مشکلات کا حل نہ لباس کی یکسانی ہے، نہ زبان اور تہذیب کا اشتراک، نہ ملک و وطن کی وحدت، نہ علم و دولت، نہ تہذیب و تنظیم، نہ وسائل و ذرائع کی کثرت، ان سب میں کوئی ایک بھی ایسی طاقت نہیں جو

دنیا کو بدل دے جب تک دل کی دنیا نہیں بدلتی باہر کی دنیا نہیں بدل سکتی، پوری دنیا کی باگ ڈور دل کے ہاتھ ہے، زندگی کا سارا بگاڑ دل کے بگاڑ سے شروع ہوا ہے، لوگ کہتے ہیں، مچھلی سر کی طرف سے سڑنا شروع ہوتی ہے، میں کہتا ہوں انسان دل کی طرف سے سڑتا ہے، یہاں سے بگاڑ شروع ہوتا ہے اور ساری زندگی میں پھیل جاتا ہے۔

پیغمبر انسانیت کا مزاج بدلتے ہیں

پیغمبر یہیں سے اپنا کام شروع کرتے ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ سب دل کا قصور ہے، انسان کا دل بگڑ گیا ہے، اس کے اندر چوری، ظلم، دغابازی کا جذبہ، اور ہوس پیدا ہو گئی ہے، اس کے اندر خواہش کا عفریت ہے، جو ہر وقت اسکو نچا رہا ہے، اور وہ بچے کی طرح اس کے اشاروں پر حرکت کر رہا ہے، پیغمبر کہتے ہیں کہ ساری خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ انسان پاپی ہو گیا ہے، اس کے اندر برائی کی جذبہ اور اسکا زبردست میلان پیدا ہو گیا ہے، اس لئے سب سے ضروری اور مقدم کام یہ ہے کہ اس کے دل کی اصلاح کی جائے، اور اس کے من کو مانجھا جائے۔

وہ لوگوں کو فاقہ کرتے دیکھتے ہیں، اس منظر سے ان کا دل جس قدر دکھتا ہے، دنیا میں کسی کا نہیں دکھتا، ان کو کھانا پینا دشوار ہو جاتا ہے، مگر وہ حقیقت پسند ہوتے ہیں، وہ یہ نہیں کرتے کہ اسی کو مسئلہ بنا کر اس کے پیچھے پڑ جائیں، اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ خرابی کا نتیجہ ہے، خرابی کی جڑ نہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر لوگوں کے پیٹ بھرنے کا سامان کر دیا جائے اور زائد غلہ لے کر بھوکوں کو دے دیا جائے تو یہ ایک وقتی اور سطحی انتظام ہوگا، وہ ایسی فضا اور ایسے حالات پیدا کرتے ہیں

کہ لوگوں سے دوسروں کی بھوک نہ دیکھی جاسکے اور خود اپنے گھر سے غلہ لاکر لوگوں کے پاس ڈال جائیں۔

اسکے برخلاف لوگ ایسے حالات پیدا کرتے جاتے ہیں کہ غلہ کھسکتا اور ایک جگہ جمع ہوتا چلا جائے، یاد رکھئے کہ اگر ذہنیت میں تبدیلی نہیں ہوئی اور غلہ کی تقسیم یا رَسَد کا انتظام کردیا گیا تو اس کے بعد بھی لوگوں کو ایسا فن معلوم ہے کہ دوسروں کی جھولی کے دانے ان کی جھولی میں آجائیں، اور دولت ہر طرف سے سمٹ کر ان کے قدموں سے لگ جائے، آپ نے شاید الف لیلہ کا قصہ پڑھا ہو کہ سندباد جہازی اپنے ایک سفر میں ایک مقام پر پہنچا، اس نے دیکھا کہ جہاز کا کپتان بہت فکر مند اور غمگین ہے، سندباد نے سبب پوچھا تو جہاز کے ناخدا نے بتلایا کہ ہم غلطی سے ایک ایسے مقام پر آگئے ہیں، جہاں سے قریب مقناطیس کا ایک پہاڑ ہے، ابھی تھوڑی دیر میں ہمارا جہاز اس کے قریب پہنچ جائے گا، مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے، جب وہ پہاڑ کشش کرے گا تو جہاز کی سب کیلیں اور تختوں کے قبضے نکل کر پہاڑ سے جا ملیں گے، اور جہاز کا بند بند جُدا ہو جائے گا، اس وقت ہمارا جہاز ڈوبنے سے نہ بچ سکے گا، چنانچہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا، مقناطیس نے لوہے کو کھینچنا شروع کیا اور جہاز میں جتنا بھی لوہے کا سامان تھا سب کھنچ کھنچ کر پہاڑ پر پہنچ گیا اور دیکھتے دیکھتے جہاز غرق ہو گیا، خوش قسمت سندباد ایک بہتے ہوئے تختہ کے سہارے کسی جزیرے میں پہنچ گیا، اور اس کی جان بچی۔

یہ قصہ غلط ہو یا صحیح اس سے مجھے کچھ سروکار نہیں، مگر مجھے آپ کو یہ سنانا تھا کہ ہماری سوسائٹی میں بھی مقناطیس صفت سرمایہ دار اور تاجر موجود ہیں، انہیں آپ بھی (MAGNATE) کہتے ہیں، وہ ایسی سازش کرتے ہیں کہ دولت سمٹ کر

ان کے گھر میں آجاتی ہے، وہ ایسا معاشی جال پھیلاتے ہیں کہ لوگ چاروناچار سب کچھ ان کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں، اور اپنے وسائل زندگی اور ضروریات ان کے سپرد کر کے پھر غربت اور فاقہ کشی کی زندگی گزارنے لگتے ہیں، پیغمبر قلب کی ماہیت بدل دیتے ہیں، وہ انسان کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کرتے ہیں کہ وہ دوسرے انسان کی فاقہ کشی کو دیکھ نہ سکے، وہ اس کے اندر ایثار کی روح اور قربانی کا جذبہ اور سچی انسانی ہمدردی پیدا کرتے ہیں، اس کو دوسروں کی زندگی اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہو جاتی ہے، وہ اپنی جان کھو کر دوسروں کی زندگی بچانا چاہتا ہے، وہ اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کر دوسروں کا پیٹ بھرنا چاہتا ہے، وہ خطروں میں اپنے کو ڈال کر دوسروں کو خطروں سے محفوظ کرنا چاہتا ہے۔

ایثار کے دو واقعے

آپ میرے ان لفظوں پر تعجب نہ کریں، یہ سب تاریخ کے واقعات ہیں، ہماری آپ کی اسی دنیا میں ایسا ہو چکا ہے، تاریخ میں ایسے واقعات گزرے ہیں جو ان فرضی قصوں اور افسانوں سے کہیں زیادہ حیرت انگیز اور تعجب خیز ہیں، جو آج فلموں میں اور اسکرین پر دکھلائے جاتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی دنیا میں آمد کے کچھ عرصہ بعد کا قصہ ہے کہ ایک مسلمان اپنے ایک زخمی بھائی کی تلاش میں پانی لے کر نکلے کہ شاید پانی کی ضرورت ہو تو میں ان کی خدمت کروں، زخمیوں میں ان کو اپنے بھائی نظر آگئے جو زخموں سے نڈھال اور پیاس سے بے قرار تھے، انہوں نے پیالہ بھر کر پیش کیا تو زخمی بھائی نے ایک دوسرے زخمی کی طرف اشارہ کیا کہ پہلے ان کو پلاؤ، اگر واقعہ یہیں ختم ہو جاتا

تب بھی انسانیت کی بلندی کے لئے کافی تھا، اور تاریخ کا ایک یادگار واقعہ ہوتا، لیکن واقعہ یہیں ختم نہیں ہوتا، جب اس زخمی کے سامنے پیالہ پیش کیا گیا تو اس نے تیسرے زخمی کی طرف اشارہ کیا، اس طرح ہر زخمی اپنے پاس والے زخمی کی طرف اشارہ کرتا رہا یہاں تک کہ پیالہ چکر کاٹ کر پہلے زخمی کی طرف پہنچا تو وہ دم توڑ چکا تھا، دوسرے کے پاس پہونچا تو وہ بھی رخصت ہو چکا تھا، اسی طرح سے یکے بعد دیگرے یہ سب زخمی دنیا سے چلے گئے لیکن تاریخ پر اپنا ایک نقش چھوڑ گئے، آج جب کہ بھائی بھائی کا پیٹ کاٹ رہا ہے، اور ایک انسان دوسرے انسان کے منہ سے روٹی کا ٹکڑا چھین رہا ہے، یہ واقعہ روشنی کا ایک مینار ہے۔

ایک دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ مہمان آئے آپ کے یہاں کچھ کھانے کو نہیں تھا، آپ نے فرمایا ان کو کون اپنے گھر لے جائے گا، ایک صحابی حضرت ابو طلحہؓ انصاری نے اپنے کو پیش کیا اور مہمانوں کو لے گئے، گھر میں کھانا کم تھا، گھر میں یہ مشورہ ہوا کہ بچوں کو سلا دیا جائے گا اور کھانا مہمانوں کو سامنے رکھ کر چراغ بجھا دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا مہمانوں نے شکم سیر ہو کر کھایا اور ابو طلحہ بھوکے اٹھ گئے، مہمانوں کو اندھیرے میں پتہ چلنے نہیں پایا کہ ان کا میزبان کھانے میں شریک نہیں ہے، اور وہ خالی ہاتھ منہ تک لے جاتے رہے ہیں۔

انسانیت کا درخت اندر سے سرسبز ہوگا

پس پیغمبر انسان کے اندر تبدیلی پیدا کرتے ہیں، وہ نظام بدلنے کی اتنی کوشش نہیں کرتے، جتنا مزاج بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، نظام ہمیشہ مزاج کا تابع رہا ہے، اگر دل نہیں بدلتا، مزاج نہیں بدلتا تو کچھ نہیں بدلتا، لوگ کہتے ہیں کہ

دنیا خراب ہے، زمانہ خراب ہے ، میں کہتا ہوں کہ یہ کچھ نہیں بلکہ انسان خراب ہے کیا زمین کی حالت میں فرق پڑ گیا، کیا ہوا کا اثر بدل گیا، کیا سورج نے گرمی اور روشنی دینی چھوڑ دی ، کیا آسمان کی حالت تبدیل ہوگئی، کس کی فطرت (NATURE) میں فرق پڑا ؟ زمین اسی طرح سونا اگل رہی ہے ، اس کے سینہ سے اسی طرح اناج کا ذخیرہ ابل رہا ہے، پھلوں کے ڈھیر نکل رہے ہیں، لیکن تقسیم کرنے والے پاپی ہوگئے ، یہ ظالم جب اپنی ضروریات کی فہرست بناتے ہیں ، تو اخبارات کے صفحات اس کے لئے تنگ اور دفتر کے دفتر ان کے لئے کم ، اور جب دوسروں کی ضروریات پر سوچتے ہیں تو ساری علم معاشیات (ECONOMICS) کی قابلیت کا کمال اس کے مختصر کرنے میں صرف کردیتے ہیں ، جبتک یہ رجحان نہیں بدلتا، انسانیت کراہتی رہیگی ، پیغمبر دلوں میں انجکشن لگاتے ہیں ، لوگ باہر کی ٹیپ ٹاپ کرتے ہیں ، اور اسی پر سارا زور صرف کرتے ہیں، پیغمبر اندر کے گھن کی فکر کرتے ہیں، آج ساری دنیا میں یہی ہو رہا ہے، انسانیت کا درخت اندر سے خشک ہوتا چلا جارہا ہے، کیڑا اس کے گودے کو کھائے چلا جارہا ہے، ، لیکن زمانہ کے بقراط اوپر سے پانی چھڑکوا رہے ہیں درخت کے اندر سر سبزی اور اس کے نشو نما کی جو قوت تھی ، وہ ختم ہو چلی ہے ، لیکن پتیوں کو سرسبز کرنے کو ہوائیں (GASES) پہنچائی جارہی ہیں ، پانی چھڑکا جارہا ہے کہ خشک پتے ہرے ہوں ، پیغمبروں نے انسان کو انسان بنانے کی کوشش کی انھوں نے اسے ایمانی انجکشن دیا ، اور کہا کہ اے بھولے ہوئے انسان اپنے پیدا کرنے والے کو پہچان اور سوتے جاگتے ، چلتے پھرتے اسے نگراں مان "لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ" نہ اس پر اونگھ کا غلبہ ہوتا ہے، نہ اسے نیند آتی ہے۔

انسانیت کے صحیح نمائندے

بس جب تک انسان کے قلب وجگر سے محبت کا چشمہ نہ اُبلے، جب تک دل کے اندر ایثار کا جذبہ نہ پیدا ہو، انسانیت کی اصلاح ناممکن ہے، بس وہ ایسی انسانی تربیت کرتے ہیں، کہ اس میں بھائی کے لئے ایثار اور تکلیف اٹھانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، وہ محض قانون سے دنیا کا علاج نہیں کرتے بلکہ وہ انسان کے اندر حقیقی انسانیت، انسانیت کا جوہر پیدا کرتے ہیں، وہ ایسی قوم پیدا کرتے ہیں، جو صحیح انسانیت کا مظاہرہ (DEMONSTRATION) کر کے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ ہم معدہ، پیٹ اور سر کے غلام نہیں، وہ زبانِ حال سے اعلان کرتی ہے کہ وہ شکم پرست، شوق پرست، دولت پرست، بادشاہ پرست، یا اہل وعیال پرست نہیں، جب تک ایسی قوم سامنے نہیں آتی، انسانیت کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

اگر کسی ملک میں ایسی قوم پیدا ہوتی ہے کہ سب کو نفع پہنچائے اور خود کو بھول جائے تو وہ انسانیت کو سُدھار سکتی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ بڑے بڑے انسانیت کے خیر خواہ گزرے ہیں، لیکن کسی نہ کسی اسٹیج پر آپ یہ بتائیں گے کہ انھوں نے بالآخر اپنا انتظام کر لیا، ایسے بے شمار قوم کے سیوک گزرے ہیں، جنھوں نے قومی سدھار کا کام بڑی مشکلات میں شروع کیا، جیلیں کاٹیں، لیکن بالآخر جیل سے نکل کر حکومت کی کرسیوں پر جا بیٹھے، ان کا یہ حق تھا انھیں مبارک ہو،

پیغمبروں کی زندگی

لیکن اللہ کے پیغمبر دنیا سے بے داغ چلے گئے، انھوں نے دنیا کے آرام کی خاطر اپنا عیش تج دیا، انھوں نے سوفی صدی دوسروں کے فائدے میں بے آرام

زندگی گزاری اور ایک فی صدی بھی اپنا فائدہ نہیں اٹھایا، وہ اور ان کے صحابی اور ساتھی جہاں سے گزرے دنیا کو نہال کر دیا، دنیا آج تک ان کے لگائے ہوئے باغ کا پھل کھا رہی ہے، جسے انھوں نے اپنے خون سے سینچا تھا، جو دوسروں کے گھر میں چراغاں کر گئے، لیکن ان کے گھر میں دنیا سے جاتے وقت اندھیرا تھا، محمد رسول اللہ ﷺ کی عطا کی ہوئی روشنی جھونپڑوں اور شاہی محلوں میں یکساں جگمگائی، لیکن جاتے ہوئے ان کے گھر کا چراغ مانگے ہوئے تیل سے جل رہا تھا، حالانکہ مدینہ کے سیکڑوں گھروں میں ان ہی کا جلایا ہوا چراغ جل رہا تھا آپ فرماتے تھے "**نحن معشر الانبیاء لا نرث ولا نورث ما ترکنا صدقة**" (ہم پیغمبر نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں، نہ ہمارا کوئی وارث ہوتا ہے، ہم جو کچھ چھوڑیں وہ سب غریبوں کا حق ہے) اس سے بڑھ کر آپ کا ارشاد تھا کہ جو کوئی مر گیا اور وہ کچھ ترکہ چھوڑ کر گیا، وہ اس کے ورثاء کو مبارک ہو، ہم اس سے ایک پیسہ نہیں لیں گے، لیکن اگر کوئی قرض چھوڑ کر گیا ہے، تو وہ میرے ذمہ ہے، اسے میں ادا کروں گا، کیا دنیا کے کسی بادشاہ یا قائد نے یہ نمونہ چھوڑا ہے، آپ کی زندگی انسانیت کا شاہکار ہے، آپ دنیا کے سامنے ایسا نمونہ پیش کر گئے جس میں سوائے ایثار و محبت اور دوسروں کے غم میں گھلنے کے کہیں اپنا رتی برابر فائدہ نظر نہیں آتا، آپ عرب کے واحد بادشاہ تھے دلوں پر ان کی بادشاہی تھی، لیکن دنیا سے دامن بچائے ہوئے بے منت چلے گئے، آپ ہی نہیں بلکہ جو جتنا آپ سے قریب تھا، اتنا ہی وہ خطرے سے قریب اور فائدے سے دور تھا، اپنے گھر والیوں سے علی الاعلان کہہ دیا کہ اگر دنیا کی بہار اور عیش چاہتی ہو تو ہم تم کو کچھ دے دلا کر اچھی طرح سے تمہارے گھروں کو رخصت کر دیں گے، تم وہاں واپس جاؤ، اور راحت و آرام کی زندگی گزارو اور ہم سے فارغ

خطی لے لو، ہمارے ساتھ رہنا ہے تو درد، دکھ، تنگی ترشی برداشت کرنا ہے، یہی اس گھر کا تحفہ ہے، اور اسی پر اللہ کے یہاں سے انعام ملیگا۔

دوستو! ہم چاہتے ہیں کہ پھر یہی زندگی عام ہو، انسانیت کی بے لوث خدمت اور بے غرض محبت کا رواج ہو، پھر دوسروں کے نفع کے لئے اپنے نقصان کو ترجیح دی جائے، پھر ایسی قوم پیدا ہو جو خطرے کے موقع پر پیش پیش اور نفع کے موقع پر دُور دُور نظر آئے۔

خواہشات کی تسکین سکون کا راستہ نہیں

آج دنیا کی ساری ریاستیں و حکومتیں اس محور پر گھوم رہی ہیں کہ قوموں اور طبقوں کو ہر طرح سے مطمئن کیا جائے اور خواہشات کی تسکین کی جائے، لیکن دانایانِ فرنگ! یہ اصلاح و تسکین کا راستہ نہیں، یہاں ایک فرد کی خواہشات بھی پوری ہونا مشکل ہے، خواہشات کا یہ حال ہے کہ وہ لامتناہی ہیں، اور دنیا کا یہ حال ہے کہ وہ محدود اور مختصر اور کروروں انسانوں میں مشترک ہے، واقعات کی دنیا میں آکر دیکھئے تو اس دنیا میں در حقیقت ایک آدمی کی منہ مانگی خواہشات کو بھی پورا کرنے کی گنجائش نہیں، یہاں کسی بوالہوس کی ہوس پوری نہیں ہوسکتی، یہاں نفس کی تسکین کا خواہشات مند پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

آج دنیا کے بڑے بڑے رہنما کہہ رہے ہیں کہ انسانی خواہشات سب جائز اور فطری ہیں، سب کو پورا ہونا چاہئے اور اسی پر ساری دنیا میں عمل ہو رہا ہے۔

دوستو! یہی بنیادی غلطی ہے، خواہشات کی تسکین اور تکمیل سے انسانیت کی تشفی نہیں ہو سکتی، خواہشات کی تسکین سے خواہشات میں کمی اور قلب میں سکون پیدا نہیں ہو گا، یہ تو سمندر کا کھاری پانی ہے، جس قدر اس سے پیاس بجھایئے گا، پیاس بھڑکے گی، آج ساری دنیا میں حکومتیں، ادارے اور تہذیبیں اسی فلسفہ کے مطابق کام کر رہی ہیں کہ انسانوں کی صحیح غلط خواہشات کی تسکین کا سامان کیا جائے، قومیں، طبقے، جمہور اور افراد جو کچھ مانگیں ان کو دیا جائے، اس سے سکون پیدا ہو گا، امن قائم ہو گا، لیکن نتیجہ بالکل الٹا ہے، آج ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے، دل کی لگی کسی سے بجھتی نہیں، خواہشات کا ایک الاؤ جل رہا ہے، اور اس میں ہر قوم ایندھن ڈالتی جا رہی ہے، اور اس کو ہوا دے رہی ہے، آج اس کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے ہیں، اور قوموں اور ملکوں کی طرف لپک رہے ہیں، آج "وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" (اس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہیں) کا منظر نظر آرہا ہے، لوگ اس آگ کی شکایت کرتے ہیں، مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ آگ کس نے جلائی، یہ الاؤ کس نے روشن کیا اس پر تیل کس نے چھڑکا، اس میں ایندھن کون ڈال رہا ہے، خواہشات کی تکمیل اور تسکین کے راستہ کا یہی انجام اور منزل ہے۔

لطیفہ یہ ہے کہ یہی لوگ جو قوم کی ہر خواہش اور ہر فرمائش کو پورا کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے لئے تفریح و تسکین کا سامان بہم پہنچانا ضروری جانتے ہیں، اپنی اولاد کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کرتے، اس کی بہت سی غلط اور مضر خواہشات کی روک تھام کرتے ہیں، بچہ اگر آگ سے کھیلنا چاہے تو نہیں کھیلنے دیتے،

لیکن وہ ان قوموں کی ہر خواہش اور فرمائش کو پورا کرنے کے لئے تیار ہیں، جو وہ کریں، اس کا مطلب یہ ہے کہ انکو اپنی رعایا سے اپنی اولاد کی طرح ہمدردی نہیں، یہی لوگ جو قوموں پر حکومت کرتے ہیں، ان کو خوش رکھنے کے لئے اور انکے افراد سے رائے حاصل کرنے کے لئے ہر غلط اور صحیح خواہش کی تکمیل ضروری سمجھتے ہیں" آج کسی ملک میں کوئی ایسی جماعت نہیں، اور کسی شخص میں یہ اخلاقی جرأت نہیں کہ وہ تفریحات اور تعیشات پر تنقید کرے، لہوولعب کے بڑھتے ہوئے ذوق، تماش بینی، موسیقی، رقاصی اور مصوری کے حد سے بڑھے ہوئے شوق اور انہماک پر اعتراض کرے، آج کوئی ایسی حکومت نہیں جو ان چیزوں پر ضروری پابندیاں عائد کرے اور قوم اور اہل ملک کی ناراضگی مول لے۔

اللہ کے پیغمبر خواہشات میں اعتدال پیدا کرتے ہیں اور صحیح ذہنیت اور صلاحیت عطا کرتے ہیں

اللہ کے پیغمبروں کا راستہ اس سے بالکل مختلف ہے، انھوں نے جائز اور ناجائز خواہشات کی تکمیل اور تسکین کے بجائے خواہشات کو لگام دی انھوں نے خواہشات کے رخ کو موڑا اور صرف جائز خواہشات کو اس کا مستحق سمجھا کہ ان کی تکمیل کی جائے، انھوں نے زندہ اور بیدار ضمیر پیدا کیا، اس سے زندگی میں اعتدال اور دلوں میں سکون پیدا ہوا، تمہاری درس گاہوں، تمہاری تجربہ گاہوں (LABORATORIES) تمہاری سائنس نے دنیا کو بہت کچھ دیا، انھوں نے حیرت انگیز ایجادوں کو جنم دیا، لیکن انسانوں کو پاک ضمیر نہیں دیا، تمہارے ان اداروں نے انسان کے

ہاتھ کھول دیئے، بچوں کو ہتھیار تو دیئے، لیکن ان کی تربیت نہیں کی، آج وہ نادان بچے شوخیاں کر رہے ہیں، اور آزادانہ ان ہتھیاروں کا استعمال کر رہے ہیں لیکن۔

اے باد صبا ایں ہمہ آوردہ تست

اللہ کے پیغمبروں نے خواہشات پر پہرے بٹھائے، خواہشات میں توازن اور اعتدال پیدا کیا، نفسانی خواہشات کے بجائے اللہ کو راضی کرنے کی زبردست خواہش پیدا کی، انسانی ہمدردی اور غمگساری کا جذبہ پیدا کیا، انھوں نے چیزیں ایجاد کر کے نہیں دیں، مگر انھوں نے وہ ذہنیت پیدا کی جس سے خدا کی بنائی ہوئی، اور انسان کی تیار کی ہوئی چیزوں کے استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا ہو، انھوں نے ضمیر بخشا، یقین بخشا، آج دنیا کے پاس سب کچھ ہے، یقین نہیں ہے، آج دنیا کے کارخانے سب کچھ پیدا کر سکتے ہیں، لیکن یقین پیغمبروں کے کارخانہ سے ملتا ہے، آج دنیا خدا سے ڈرنے والوں سے خالی ہے، یقین سے خالی ہے، انسانیت کی بے لوث خدمت کون کرے، خدا کا خوف اور اس کی رضا کا یقین، اس کے کنبے کی بے لوث خدمت کا جذبہ دیتا ہے، انسانیت کے ایسے خادم ہر نعرہ سے دور، حکومت کے لالچ سے الگ، سیاسی چالوں اور سیاسی جوڑ توڑ سے بیزار، بے لوث خدمت کرتے ہیں، آج ایسے ہی خدمت گاروں کی ضرورت ہے، جن کے پاس کچھ نہ ہو، پھر بھی کچھ لینا نہ چاہیں، بلکہ دینا ہی چاہیں۔

ہمارا پیغام اور ہماری صدا

ہم لوگوں میں اس جذبہ کو پیدا کرنا چاہتے اور ان میں ان حقیقتوں کی پیاس پیدا کرنا چاہتے ہیں، زندگی محض کھانے پینے کا نام نہیں، انسان کی زندگی محض مادّی یا حیوانی زندگی کا نام نہیں، ہم ایک نیا ذوق لے کر آئے ہیں، آج کی مادی دنیا میں یہ بات نئی ہے، در اصل یہ بات نئی نہیں، دنیا کے سب پیغمبر جو ہر قوم میں آئے یہی پیغام لائے اور سب سے زیادہ طاقت اور وضاحت کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ نے آخری طور پر یہ بات کہی، یہ حقیقت چوراہوں پر کہنے کے لائق ہے، لوگ پیٹ کے گرد چکر لگا رہے ہیں، اصل زندگی دم توڑ رہی ہے، انسانیت کی پونجی لُٹ رہی ہے، ہم ایک صَدا لگانے آئے ہیں، حق کی صَدا، دنیا اس صَدا سے نامانوس ہے، مگر ہم دنیا سے مایوس نہیں، انسانوں کے پاس اب بھی ضمیر ہے یہ ضمیر مردہ نہیں ہوا، اس پر گرد و غبار آگیا ہے، اگر وہ گرد و غبار جھاڑ دیا جائے، اور اس کی آلودگی سے صاف کر دیا جائے تو اب بھی اس کی گنجائش ہے کہ وہ حق کو قبول کر لے اور اس میں ایمانی شعور پیدا ہو۔

وآخر دعوانا أن الحمدلله ربّ العالمین

☆☆☆☆

اخلاص، جذبۂ قربانی اور جوہر ذاتی

دار العلوم ندوۃ العلماء میں حسب روایت طلبہ کی الوداعی تقریب ۲۵ر دسمبر ۱۹۶۳ء کو جمالیہ ہال میں منعقد ہوئی، اس میں حضرت مولانا نے طلباء کے سامنے الوداعی تقریر کی اور وہ صفات اور شرائط بیان کئے، جن کے بغیر ان کے مقصد کی تکمیل ناممکن ہے اور جو انکی زندگی کے لئے مشعلِ راہ اور زادِ سفر بن سکتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اخلاص، جذبۂ قربانی اور جوہر ذاتی

حمد وصلوٰۃ کے بعد!

میرے عزیز طلباء! ایسے موقعہ پر اگر آپ رنجیدہ ہیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، یہ موقع ایسا ہے جو رنج و مسرت دونوں کا جامع ہے، لیکن وہ ماں قابل مبارکباد نہیں، جو ہمیشہ اپنے بچوں کو سینے سے لگائے رہے، اور آنکھوں سے اوجھل کرنے کے لئے تیار نہ ہو، بلکہ اس کا ایک وقت مقرر ہے، اس وقت تک وہ بچے کی پرورش کرتی ہے، پھر وہی ماں اس بچے کو اپنی آنکھوں سے اوجھل کر دیتی ہے، تاکہ وہ اسکی پیری کے لئے سہارا بن سکے، اسی طرح آپ نے ایک مدت یہاں گذاری، اس میں آپ کا ہم سے مانوس ہونا یا ہمیں آپ سے انس ہونا بالکل قدرتی چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے اندر انس پیدا کیا ہے، لیکن انسانوں کے اندر یہ جوہر بہت زیادہ نمایاں ہے، صرف لسانیت ہی نہیں نفسیات کے بھی بعض بڑے بڑے ماہروں کا یہ کہنا ہے کہ انسان کا لفظ اسی انس سے مشتق ہے، اس موقع پر یقیناً ہمیں اس حیثیت سے تو رنج ہے کہ آپ ہم سے جدا ہو رہے ہیں، ہمارا آپ کا

جو ایک ساتھ تھا، وہ چھوٹ رہا ہے، لیکن دوسری حیثیت سے تو رنج ہے کہ آپ ہم سے جدا ہو رہے ہیں، ہمارا آپ کا جو ایک ساتھ تھا، وہ چھوٹ رہا ہے، لیکن دوسری حیثیت سے ہمیں یہ مسرّت ہے کہ آپ نے تعلیمی مدّت حسن وخوبی کے ساتھ پوری کرلی، آپ نے اس زمانے میں جبکہ بالکل ہی مخالف ہیں، اور زمانے سے سکون واطمینان رخصت ہو چکا ہے، دین کی تعلیم حاصل کی اس حیثیت سے آپ قابل مبارکباد ہیں اور ہمیں اس پر دلی مسرت ہے۔

فراغت کا غلط تخیل

لیکن ایسے موقع پر جب "فارغ" کا لفظ آتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس کا مفہوم سمجھنے میں لوگ غلطی کریں، دار العلوم کو ایک ایسی تعلیمی مدّت تو رکھنی ہی چاہئے تھی، جس مدّت کو آپ طے کرتے اور اس مرحلے سے فارغ ہوتے، لیکن اس موقعہ پر جو اہم بات آپ سے کہنی ہے وہ یہ ہے کہ اگر آپ نے اسکا مفہوم یہ سمجھ لیا کہ ہم تعلیم سے فارغ ہو گئے، اب ہمیں تعلیم وتربیت کی کوئی ضرورت نہیں، تو بلا کسی حجاب کے اور تردّد کے میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ آپ نے کچھ بھی نہیں سیکھا اور آپکا ادارہ اپنے مقصد میں بالکل ناکام ہے، اور ہم لوگ بالکل ناکام ہیں، لیکن جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ نے فارغ ہونے کا یہ مفہوم نہیں سمجھا ہے، بلکہ فارغ ہونے کا مفہوم آپ کے نزدیک بھی یہ ہے کہ آپ اس قابل ہو گئے کہ کتابوں کو ہاتھ لگا سکیں اور حسب ضرورت ان سے استفادہ کر سکیں، بلکہ یوں کہا جائے کہ آپ کو اب علم کے حاصل کرنے کی کنجی دے دی گئی تو زیادہ صحیح ہوگا، آپ اس کنجی کے ذریعہ ہر قفل کھول سکتے ہیں، اور علم کے خزانے اپنے پاس جمع کر سکتے ہیں، آپ اس کنجی کو جتنا ہی استعمال کریں اسی قدر وہ کام دیتی چلی جائے گی۔

ہر نصاب کی ایک خصوصیت ہوتی ہے، اگر وہ نصاب اپنے فارغ شدہ طلباء کے اندر اس احساس کو پیدا کردے یعنی جہل کا اعتراف، شاید یہ لفظ بعض کانوں کو نامانوس معلوم ہو، لیکن مجھے اس لفظ پر اصرار ہے، جسے لوگ ذوق علمی سے تعبیر کرتے ہیں، اگر آپ کے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا ہے تو آپ کامیاب اور قابل مبارکباد ہیں، اور میں آپ کے ادارے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، اس کے بعد اس مختصر وقت میں اپنے جانے والے بھائیوں کو میں صرف تین باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔

اخلاص

پہلی چیز اخلاص ہے، آپ کسی بڑے سے بڑے بزرگ یا جس کا نام آپ دنیا میں روشن پڑتے ہیں، اگر آپ اس کی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو اسکی زندگی کی تعمیر میں اخلاص کو ایک اہم عامل پائیں گے، آپ دیکھیں گے کہ اس کی ہر چیز کو اخلاص نے دوام بخشا ہے، آپ ملا نظام الدینؒ کو دیکھ لیجئے، جن کے درس نظامی کا سکہ صرف ہندو پاک ہی نہیں اقصائے عالم میں چل رہا ہے، اور جسکو باوجود کوششوں کے اپنی جگہ سے ہلایا بھی نہیں جاسکا، محض انکی علمیت کی بنا پر ایسا نہیں ہو لیکہ انکے ساتھیوں اور انکے معاصرین میں بہت سے ایسے اشخاص تھے، جو علم و فضل اور ذہانت و ذکاوت میں اگر بڑھے ہوئے نہیں تو ان کے ہم پلہ ضرور رہے ہوں گے، لیکن کیا بات ہے کہ آج ملا نظام الدین تو زندہ جاوید ہیں، لیکن ان کے معاصرین کا تذکرہ اگر آتا ہے تو انکے سلسلے ہی میں آتا ہے، اگر آپ غور کریں اور انکی زندگی کا مطالعہ کریں تو اسکی پشت پر اخلاص کی وہ زبردست قوت کار فرما پائیں گے، جس نے ملا نظام الدین کو قیامت تک کے لئے زندہ جاوید بنا دیا، بات صرف اتنی تھی

کہ انھوں نے پڑھنے کے بعد یہ محسوس کرلیا کہ انھوں نے کچھ بھی نہیں سیکھا ہے، اور انہوں نے اپنے زمانے کے ایک ایسے اُمّی شخص سے جو گوشۂ گمنامی میں اودھ کے ایک چھوٹے سے گمنام گاؤں "بانسہ" میں اخلاص کا سرمایہ لے کر پڑا ہوا تھا، اپنے آپ کو متعلق کرلیا، اگر ملا نظام الدین چاہتے تو بہت سے ایسے بھی خدا کے بندے انکو مل سکتے تھے، جو اپنے وقت کے امام تصور کئے جاتے تھے، لیکن ملا نظام الدین نے اپنے آپ کو ایک ایسے شخص کے سپرد کیا جس کی شہرت اگر ہوئی تو ملا نظام الدین کے ذریعے سے ہوئی، بہر صورت اس کی اگر مثالیں دی جائیں تو سیکڑوں مثالیں ملیں گی۔

جذبۂ قربانی

دوسری بات جو ہمیں آپ سے کہنی ہے، وہ ایثار و قربانی ہے، ایثار و قربانی اور عزم یہ وہ طاقت ہے کہ اگر افراد میں ہوتی ہے، تو انہیں ثریا تک پہونچادیتی ہے، اور اگر کسی ادارہ یا قوم کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو دنیا اسکے سامنے جھک جاتی ہے، اور اسکی بالادستی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

جوہر ذاتی

اس کے بعد جو تیسری بات ہے، وہ جوہر ذاتی ہے، انسان کا ذاتی جوہر اور اسکی قابلیت ہی وہ چیز ہے، جو ہر وقت اور ہر زمانے میں اس کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے، اگر آپ نے ان تینوں چیزوں یعنی اخلاص، جذبۂ قربانی اور جوہر ذاتی کو حاصل کرلیا ہے، تو آپ کے لئے زمانہ بالکل نہیں بدلا ہے، اور ہر وقت آپ کے لئے چشم براہ ہے، لیکن ان صفات سے اگر کوئی خالی ہے تو وہ جہاں بھی جائیگا، اور جس جگہ کی بھی سند یا ڈگری اس کے پاس ہوگی، حالات کو بدلا ہوا اور اپنے مخالف پائے گا، پھر

میں کہتا ہوں کہ اگر آپ نے یہ صفات اپنے اندر پیدا کرلیں تو آپ کے لئے عالمگیر کا زمانہ، نظام الملک طوسی کا زمانہ، اور امام غزالی، امام رازی، امام ابن قیم، اور امام ابن تیمیہ کا زمانہ آج بھی منتظر ہے، اور وہ آپ کے لئے واپس ہو سکتا ہے، یہ غلط ہے کہ زمانے میں کوئی جگہ خالی رہتی ہے، کبھی زمانے میں ایسا نہیں ہوا کہ کوئی جگہ پہلے سے خالی ہو اور کسی کی منتظر ہو کہ جب وہ شخص فارغ ہو لے گا تو اسکو وہ جگہ مل جائے گی، زمانہ "بقائے اصلح" کا قائل ہے، وہ بہت ہی حساس اور نقاد ہے، وہ صالح کے بجائے اصلح اور نافع کے بجائے انفع کو ترجیح دیتا ہے، لہٰذا اگر آپ کے اندر یہ چیزیں ہیں تو ہر۔۔۔۔ زمانہ آپکا ہے، اور آپکا منتظر ہے، زمانے کا شکوہ دراصل اپنی کمزوری چھپانے کی کوشش اور احساس کہتری کی علامت ہے، دنیا نہیں بدلی ہے ہم بدل گئے ہیں، زمانہ آج بھی وہی ہے، جو پہلے تھا، تبدیلی صرف ہمارے اندر پیدا ہوئی ہے۔

آخری بات

اگر ہمارے سامنے یہ تصور اور یہ خیال نہ ہوتا تو یقیناً ہمارے لئے اس زمانے میں قطعاً یہ جائز نہ تھا کہ ہم کسی ایک مسلمان بچے کو اس کے ماں باپ سے الگ کر کے ایسی تعلیم دلاتے جس کی دنیا میں بظاہر کوئی قیمت نہیں، لیکن یہی تین باتیں ہیں، اخلاص، جذبۂ قربانی اور جوہر ذاتی، جس کی وجہ سے ہم کو اس کا پورا پورا حق حاصل ہے، اور اس کا پورا پورا جواز بلکہ ضرورت ہے کہ صرف ایک دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی نہیں ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، اور اس طرح کے جتنے بھی ادارے قائم ہیں، وہ قائم رہیں، اور ترقی کریں، ہمیں امید ہے کہ ہمارے وہ طلباء جو ہم سے رخصت ہو رہے ہیں وہ اپنی آنے والی زندگی میں ان اصولوں کو اپنائیں گے، اور وہ طلباء جنہیں ابھی موقع حاصل ہے، اور وہ کچھ سال یہاں گذاریں

گے، زیادہ سے زیادہ ان اصولوں سے فائدہ اٹھائیں گے، اس کے ساتھ ہمیں اپنے رخصت ہونے والے بھائیوں سے یہ امید ہے کہ وہ اپنے دارالعلوم سے ہر حال میں تعلق رکھیں گے، اور اس کو اپنا نصب العین بنائیں گے۔

وآخر دعوانا أن الحمدللہ رب العالمین

انسان خود پرست بھی ہے خود فراموش بھی

یہ تقریر ۲۲ جنوری ۱۹۵۴ء رات کو ساڑھے سات بجے ٹاؤن ہال غازیپور کے ایک جلسۂ عام میں ہوئی، جس میں ہندو، مسلمان، تعلیم یافتہ اصحاب کی کافی تعداد تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انسان خود پرست بھی ہے خود فراموش بھی

انسان اور جانور کا فرق

دوستو اور بھائیو! جانوروں اور انسانوں میں ایک بہت بڑا فرق ہے، اور وہ یہ کہ جانوروں میں اپنی حالت سے بے اطمینانی اور اپنی زندگی کی ترقی کی کوئی صلاحیت نہیں ہوتی، لیکن انسان اسکا احساس رکھتا ہے، ہم اور آپ اپنی زندگی سے غیر مطمئن ہیں، اس بے اطمینانی کو عام طور سے بُرا سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر یہ بے اطمینانی جو انسان کا جوہر ہے، ختم ہو جائے تو پھر زندگی کی خوبی اور دلچسپی ختم ہو جائے، ہر شخص زندگی کی شکایت کرتا ہے، اور اکثر گفتگو اس بے اطمینانی پر ہوتی ہے، مگر اس کو دُور کرنے کی فکر اور اس کے اسباب پر غور کرنیکی تکلیف بہت کم لوگ گوارا کرتے ہیں، کیونکہ یہ ایک ذمہ داری کی چیز ہے، اور انسان ذمہ داری سے گھبراتا ہے۔

اگر کسی مشین یا ایک گھڑی میں خرابی ہو جائے، تو اس کو گرانے اور پٹکنے سے وہ درست نہیں ہوتی، بلکہ اس کو آسانی اور سہولت سے درست کرنے ہی سے کام چلتا ہے، اسی طرح غور کرنا ہے کہ اس وقت انسانیت کی چول تو اپنی جگہ سے ہٹی

ہوئی نہیں ہے، اور یہ سارا بگاڑ اور بے اطمینانی انسانیت کی پستی ہی کا نتیجہ تو نہیں ہے، جس کے ذمہ دار ہم اور آپ ہیں،

انسان کے لئے سب سے محبوب اپنی ذات ہے۔

انسان کو سب سے زیادہ اپنی ذات سے محبت ہے، اور جس سے جتنی دلچسپی ہے، وہ اپنی ذات کے تعلق کی بنا پر، ہر محبت میں انسان کی اپنی ذات چھپی ہوتی ہے، اور اس کو دیکھنے کے لئے ایک خوردبین کی ضرورت ہے، محبت کے فلسفہ پر غور فرمایئے کہ کسی شخص کو آپ سے محبت ہے تو یقیناً آپ کو بھی اس سے محبت ہوگی، اولاد، بھائیوں اور دوستوں کی محبت میں درحقیقت انسان کی اپنی محبت کام کرتی ہے، انسانی محبت کے لئے سائیکالوجیکل خوردبین کی ضرورت ہے اگر انسان کو اپنی ذات سے محبت نہ ہو تو یہ سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے، اب تو یہ تسلیم کیا جارہا ہے، کہ قوت کشش کا فلسفہ بھی دراصل ایک تعلق اور محبت کا رشتہ ہے، جو نظامِ شمسی کو قائم رکھتا ہے، اس دنیا میں جو رونق ورنگینی اور چہل پہل معلوم ہوتی ہے، وہ سب انسان کی اپنی ذات سے دلچسپی رکھنے کا نتیجہ ہے، اگر انسان کو اپنی ذات سے دلچسپی نہ ہو تو بازار، کارخانے اور کاروباری سرگرمیاں سرد پڑ جائیں، کیونکہ ذاتی تو کسی چیز سے نہیں بلکہ انسان کو اپنی ذات کا عشق، دوسری چیزوں سے تعلق اور محبت پر مجبور کرتا ہے، یہ لاکھوں برس کی پرانی اور فطری حقیقت ہے، اس دنیا میں جو کچھ طاقت، زینت اور نظام آپ دیکھتے ہیں، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ انسان اپنی ذات سے دلچسپی رکھتا ہے، انسان اس دنیا کا مرکز ہے، اور ساری چیزیں اس کے گرد گھوم رہی ہیں، اگر انسان اپنی ذات سے دلچسپی نہ رکھے اور اس کو فراموش کردے، اپنی حقیقت سے ناواقف ہو اور اپنی ذات کو بھول جائے تو بڑی انار کی پھیل جائے، اور بڑی ابتری اور

بد نظمی رونما ہو۔

ایک ذہنی طاعون

انسان کے لئے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو سمجھے، اپنی حیثیت کو پہچانے اور یہ جانے کہ یہ ساری دنیا میرے لئے بنائی گئی ہے، اور انسان ہی اس دنیا کی پیدائش کا مقصد ہے، ذریعہ کو ذریعہ اور مقصد کو مقصد سمجھنا چاہئے، انسانی تاریخ کا یہ ایک بحرانی دور اور ذہنی پلیگ ہے کہ وہ اپنی ذات کو فراموش کردے، اپنے مقصود اور وسائل وذرائع کو الگ الگ پہچانے اور ذرائع کو مقصود سمجھے، انسان پر خود فراموشی کا طاری ہونا ایک خطرناک بیماری ہے، جب کہ یہ بھلادے کہ وہ کس مقام پر رکھا گیا تھا، اور اس کی کیا حیثیت اور ذمہ داری ہے، اسے کون سا پارٹ ادا کرنا ہے، اور اس کا اس عالم سے کیا تعلق ہے۔

اس زمانہ میں ایک خاص قسم کا ذہنی پلیگ پھیلا ہوا ہے، جو مشرق سے مغرب تک ہے، بظاہر تو انسان اپنی ذات سے اس قدر دلچسپی اس زمانہ میں رکھتا ہے، اس کے لئے جو محنتیں اور کوششیں کر رہا ہے، اور جو ایجادات، اختراعات اور مصنوعات سامنے آرہی ہیں، وہ یہ دھوکہ دیتی ہیں کہ انسان کو اپنی ذات سے جس قدر دلچسپی اس زمانہ میں ہے، ایسی دلچسپی کسی زمانہ میں نہیں رہی، انسان پچھلے دور میں گویا سویا ہوا تھا، اب جاگا ہے، زندگی کو جیسا پر تکلف اور راحت آشنا بنادیا گیا ہے، وہ یہ دعویٰ کرتی ہے کہ انسان کو اپنی ذات سے اس وقت ہمیشہ سے زیادہ دلچسپی ہے، انسان اپنی ذات کے لئے جو ذہانتیں دکھارہا ہے، اور جو قوتیں استعمال کر رہا ہے، ایسا تاریخ میں کبھی نہیں ہوا اور اب بظاہر انسان کو اپنی ذات سے بے انتہا شیفتگی ہے، لباس نئے، کھانے عجیب وغریب اور راحت وسہولت کے کتنے ذرائع

نکل آئے ہیں۔

اس زمانہ کی خود فراموشی

میں یہ عرض کروں گا کہ دراصل انسان نے اپنی ذات، اپنی آدمیت، اپنے جوہر، اپنے اصل ذائقہ اور اپنی حقیقی لذت کو جس قدر اس زمانہ میں بھلایا ہے، ایسا کبھی نہیں بھلایا تھا، انسان اس وقت سب سے کم اپنی ذات اور اپنے ذاتی مسائل پر غور کرتا ہے، اور جو چیزیں اس کے لئے پیدا کی گئی تھیں ان پر اپنی زندگی کو قربان کر رہا ہے، ظاہری چیزیں، جھوٹے تقاضے اور بیرونی لذتیں اس پر ایسی حاوی ہو چکی ہیں کہ وہ اپنے باطن اور اپنی حقیقت کو بالکل فراموش کر چکا ہے۔

یہ دور دراصل دو متضاد پہلو رکھتا ہے، ایک ظاہر اور دوسرا باطن، اگر پرکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ اس مادی ترقی کے دور میں انسان نے اپنے روحانی جوہر اور حقیقی مقصد اور زندگی کی اصل لذت کو بالکل بھلا دیا ہے، جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی اور لطف یہ کہ اپنے فرض کو نہیں پہچانتا، اپنی بیماری کو سنجیدگی سے نہیں سوچتا، اس کے ذرائع مقاصد بن گئے ہیں، انسان ان چیزوں پر کیسے مر رہا ہے، جو اسی کے لئے ہیں، ذرا غور کیجئے، کیا انسان اپنی ذات سے واقف ہے، اپنی زندگی کا جائزہ لیجئے، کیا انسان اپنی حقیقی راحتوں کو یاد کرتا ہے، ہرگز نہیں، بلکہ انسان پر ایک جنون طاری ہے، اور وہ ایک عجیب کھیل کھیل رہا ہے، صبح سے شام تک ایک چکر میں رہتا ہے، جانوروں سے زیادہ محنت کرتا ہے، بہت سے انسان ایسے ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو روپیہ ڈھالنے کی مشین سمجھ رکھا ہے۔

لاحاصل کوشش

میرے بچپن میں بچے ایک کھیل کھیلا کرتے تھے کہ بڑھیا بڑھیا کیا

ڈھونڈ رہی ہے، جواب ملتا تھا سوئی، سوئی کا کیا کرے گی، جواب ملتا تھا، تھیلی سیوں گی، تھیلی کا کیا کرے گی جواب ملتا، روپیہ رکھوں گی، روپیہ کیا کرے گی، جواب ملتا، گائے خریدوں گی، گائے کا کیا کرے گی، جواب ملتا، دودھ پیوں گی، ادھر سے جواب ملتا، دودھ کے بدلے "موت" آج ساری دنیا یہی کھیل کھیل رہی ہے، ساری دنیا اپنی محنتوں کے صلہ میں جو حاصل کرنا چاہئے تھا، اس کے بجائے بے مقصد اور غیر حقیقی چیزوں میں الجھ کر رہ گئی ہے، انسان تعلیم حاصل کرتا ہے، اور تعلیم اس لئے کہ روپیہ کمائے اور روپیہ اس لئے کہ آرام پائے، یہ ایک مسلسل زنجیر ہے جس میں سارے انسان جکڑے ہوئے ہیں، انسان جس کے سب کچھ کرتا ہے، اس کو بھول جاتا ہے، آج حقیقی مقاصد زندگی بالکل فراموش کئے جا چکے ہیں، زندگی کا سارا سفر اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ انسانیت جس کے لئے چلی تھی، وہ اس کا راستہ نہیں۔

سکہ کی انسان پر حکومت

سکہ کس لئے ہے، اس کی قیمت یہی تو ہے کہ انسان اس سے کام لے آپ نے بے جان سکہ میں جان ڈالی مگر سکہ کے یہ معنی تو نہیں کہ آپ اس سے عشق کریں، اس سے جو کام لینا چاہئے تھا، وہ نہیں لیا جاتا بلکہ سکہ اس وقت انسان پر حکومت کر رہا ہے، اس سکہ کے لئے دنیا میں دو بڑی لڑائیاں ہوئیں، آپ نے عہدوں، کوٹھیوں اور کرسیوں کو اپنے اوپر حکمراں بنالیا، انسان نے انسان کے خلاف خوفناک ہتھیار استعمال کئے، انسان نے انسانیت سے سرکشی کی، بغاوت کی، جس کے نتیجہ میں انسان کو انسان سے ہزار گنا ادنیٰ چیزوں کو اپنا کر حکمراں بنانا پڑا وہ چیزیں جن میں زندگی نہیں، لوچ نہیں، کوئی برتری نہیں، وہ انسان پر مسلط ہیں، یہ ایک عجیب اور عبرتناک حال ہے کہ اشرف المخلوقات پر اس کے بنائے قانون اور

بے جان اشیاء حکومت کریں۔

ذرائع مقاصد بن گئے

اس دنیا میں اکثر انسان ایسے ہیں، جن کو یاد نہیں کہ ان کا مقام اور مقصد حیات کیا ہے؟ جو چیزیں انسان کے مقاصد کا صرف ذریعہ ہیں، ان پر ایسی محنتیں کی جارہی ہیں کہ گویا وہی اصلی مقاصد ہیں، اصل مقاصد کو بھلا کر انسان ہوس کے جال میں پھنسا ہوا ہے، انسان چاہتا ہے کہ دوسروں پر حکومت کرے لیکن جب ایک کو دوسرے پر فتح ہوتی ہے تو اس پر دوسری چیزیں حکومت کرتی ہیں، ایک قوم کو ایک فرد بھی گوارا نہیں کرتا کہ اس پر دوسرا حکومت کرے، مگر انسان سے ہزار درجہ پست چیزوں کو مثلاً کپڑوں کو، کوٹھیوں کو، روپیہ کو آج ہم نے اپنے اوپر حکمراں بنا رکھا ہے، انسان پر، آج خواہشات کی، اپنے بنائے ہوئے قانون کی اور جمادات کی حکومت ہے، حالانکہ ان چیزوں میں ہرگز کوئی جاذبیت نہیں اور وہ ہرگز ہمارا مقصود بننے کے قابل نہیں، مگر ہم نے جمادات کو ترجیح دی، انسانوں پر ہم نے نباتات کو انسان سے افضل سمجھا، حالانکہ ہم میں آج لاکھوں انسان حقیقی آرام سے محروم ہیں، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان نے انسانیت کو فراموش کردیا اور اس پر ایک خود فراموشی طاری ہے۔

یقیناً ہم لوگ بھول چکے ہیں کہ ہمارا اصل مقام کیا ہے، ہماری غلط روش ہی سے ساری دنیا میں آج انتشار ہے، آج ہم عہدوں کیلئے جان دیتے ہیں، اور اپنی حقیقی عزت اور اصل راحت کو فراموش کر چکے ہیں، جغرافیہ کس لئے ہے، اگر اس دنیا میں انسان نہ پیدا ہوتا تو تاریخ و جغرافیہ کی کیا ضرورت تھی، سارے علوم وفنون انسان ہی کے لئے تو ہیں، پھر یہ کیا کہ انسان اپنی پوزیشن نہیں سمجھتا اور اپنی حقیقت

سے دور ہوتا چلا جارہا ہے، آپ کا اس دنیا سے کیا تعلق ہے، ہم کس لئے آئے، کیا ہم اس دنیا میں اس لئے بھیجے گئے کہ دریاؤں پر دوڑیں، اور ہوا میں اڑیں، اور مادی ترقیوں کو اپنا مقصد حیات بنالیں، ہماری زندگی کا جو لباس ہے اس میں برابر جھول پڑتے جارہے ہیں، اور دامن انسانیت آج تار تار ہے۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

خدا کے برگزیدہ بندے جنہیں پیغمبر کہتے ہیں، دنیا میں اسی لئے آئے کہ انسان کو اس کا مقام اور مقصد زندگی بتلائیں اور انہوں نے ایک موٹا اصول بتلایا کہ انسان اللہ کے لئے بنایا گیا ہے، اور یہ ساری مخلوق انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے، اگر ہم اور آپ یہ سمجھ لیں کہ ہم اس دنیا کے امین، ٹرسٹی اور نگراں ہیں تو یقیناً ہمارا اور آپ کا رویہ اور طرز زندگی بدل جائے اور دنیا میں جو فساد اور تباہی برپا ہے، وہ یقیناً دور ہوسکتی ہے۔

دولت مند بننے کی ریس

لیکن اگر آپ یہ سمجھ بیٹھیں کہ آپ صرف روپیہ ڈھالنے کی مشین ہیں تو انسانیت کے لباس میں جھول پڑتے ہی جائیں گے، غیر محدود تعداد میں روپیہ پیدا کرنا جب آپ کا مقصد حیات ہوگا تو نہ آپ انسانی رشتہ کو ملحوظ رکھیں گے نہ کسی کے دل کو ستانے میں عار ہوگا نہ کسی پر ظلم کرنے میں ہچکچائیں گے۔ اگر آپ کا آئیڈیل یہ ہوگا کہ زندگی صرف عیش وآرام و دولت مند بننے اور تھوڑی مدت میں جلد از جلد روپیہ سمیٹنے کا نام ہے، پھر اس کا نتیجہ یہی ہوگا، جو آج ہمارے سامنے ہے، خواہ انسانیت کا خون ہو، اور آدمیت برباد ہو، مگر ہر انسان دولتمند بننے کی اس ریس میں آگے نکلنے کی کوشش کررہا ہے، ساری اخلاقی تعلیمات طاق پر رکھی ہوئی ہیں، اور ہر ایک شہر میں ایک ریس کا میدان گرم ہے، دفتروں میں شام ہونے سے پہلے کلرک

چاہتا ہے کہ جیب بھرے، اس وقت فلسفہ شاعری اور فائین آرٹس کا مقصد بھی دولت کمانا اور شہرت حاصل کرنا ہے، اور ولایت میں تو روحانیت کا مقصد بھی

دولت کمانا اور شہرت حاصل کرنا ہے، اور ولایت میں تو روحانیت کا مقصد یہی بن گیا ہے کہ دولت حاصل ہو۔

سکہ کے اخلاق

آپ جس چیز سے محبت کریں گے اس کا عکس آپ پر ضرور پڑے گا، آج روپیہ کی محبت کا عکس بھی پوری انسانیت پر پڑ رہا ہے، روپیہ کی بے وفائی اور اس کا تلون آج ہمارے دماغوں اور دلوں میں گھس چکا ہے، سارا دھیان گیان آج اس سکہ کے دھیان میں مٹ چکا ہے، ہم میں سکہ کی خاصیت یعنی سختی، تلون اور بے وفائی پائی جا رہی ہے، ساری عمر کی کوشش کے باوجود اور روپیہ زیادہ سے زیادہ کمانے پر بھی آج دنیا کو وہ فائدہ نصیب نہیں ہوتا جو سکہ کا مقصد تھا، کیونکہ انسانی ہمدردی اور جذبۂ خدمت کے بغیر سکون کی دولت حاصل نہیں ہو سکتی، انسانوں کی حق تلفی انسانیت کا خون ہے، آئیڈیل کی حکومت ہر زمانہ میں رہی، مگر کسی زمانہ میں بھی انسانی زندگی کا یہ آئیڈیل رہا ہے کہ دولت کے حصول کی خاطر انسان کا نازک دل بھی ملے تو اس کو روندتا چلا جائے، انسانی اخلاق آج ہم سے رخصت ہو گیا، سکہ کے نام پر آج انسان انسان کا دشمن بنا ہوا ہے۔

تاجر اور خریدار

آج بھائی بھائی کو گاہک یا خریدار کی نظر سے دیکھتا ہے، اور ساری دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے، ایک تاجر اور دوسرا خریدار، آج دنیا کو اصرار ہے کہ ساری زندگی اسی بازار میں گزارے، انسانوں نے انسانوں کے دلوں میں گھر کرنا،

دلوں کو آباد کرنا، صور توں پر نظر ڈالنا اور باہمی رشتوں کو قائم رکھنا اور ایک دوسرے کے حقوق کو سمجھنا بالکل ختم کر دیا، اس دنیا میں گویا سارے رشتے ختم ہو چکے، تمام جذبات سرد پڑ گئے اور ساری محبتیں اٹھ چکیں اور اب ایک تاجر دوسرا خریدار بن کر زندگی گزارنا چاہتا ہے، اور ایک دوسرے کی جیب پر نظر جمائے ہوئے ہے، اس دولت نے اولاد کے دلوں سے والدین کی محبت نکال دی، چیلوں کے دلوں سے گروؤں اور استادوں کی عظمت ختم کر دی، ماں باپ کے دلوں سے اولاد کی شفقت کھو دی اور ساری زندگی ایک دوکان بن کر رہ گئی، بے لوث ہمدردی اور خدمت کا جذبہ نیست و نابود ہو چکا، اور حقیقی لطف اب زندگی سے اٹھ چکا، ہر شخص دوسرے کو گاہک کی نظر سے دیکھتا اور سوچتا ہے کہ کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اگر دنیا میں صرف دوکاندار اور گاہک ہی بستے ہوں تو کیا خاک لطف زندگی ہو۔

۱۹۴۷ء سے پہلے انگریزوں کے دورِ حکومت میں ایسے استاد دیکھنے میں آئے جو پڑھانے کا بل بنا کر دیتے تھے، اور ایک کلکٹر صاحب نے جن کا لڑکا ان کے پاس آکر ٹھہرا تھا، اس کے قیام کا بل بھی بنا کر دیدیا تھا، اب تو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا ہے کہ بے جان اور بے زبان چیزیں بھی بل پیش کرنے لگیں، درخت اپنے سایہ میں کھڑے ہونے کا بل بنانے لگیں، زمین اپنے اوپر چلنے کا معاوضہ نہ طلب کرنے لگے، یہ زندگی کیا ہے؟ ایک منڈی بن گئی ہے، لیکن ساری زندگی منڈی میں کیونکر گزرے؟

دولت کا ضرورت سے زائد احترام

سب سے پہلے ہماری نظر جب کسی پر پڑتی ہے تو اس کے لباس، معیار زندگی اور مالی حیثیت کو دیکھتے ہیں، اس کے اخلاق اور اس کی انسانیت کی ہمارے بازار

میں کوئی قدر و قیمت نہیں، آج انسان بالشتیوں کی طرح ایک سونے کے پہاڑ کے گرد چکر لگا رہے ہیں، مگر میں پوچھتا ہوں کہ آج ہمیں کون سی چیز زندگی کی حقیقی خوشی اور لذت سے آشنا کر رہی ہے۔

پیغمبروں نے انسانوں کو بتلایا تھا کہ اگر تم نے اپنے کو دنیا کا تابع کر لیا، اور اپنی خواہشات کو اپنے اوپر مسلط کر لیا تو یہ ساری زندگی غیر فطری اور بد نظم ہو جائے گی اور ایک ایسی انارکی پھیلے گی کہ یہی دنیا تمہارے لئے جہنم بن جائے گی۔ اگر انسان نے اپنے کو نہیں پہچانا تو وہ اپنے مقام کو گرتا چلا جائے گا، اور انسانیت تباہ و برباد ہو گی۔

مقام انسانیت

قرآن شریف میں بتلایا گیا ہے کہ انسان کو پیدا کر کے فرشتوں کو اسکے آگے جھکایا گیا، جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسانیت کی یہ ایک تذلیل ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کے سوا کسی کے سامنے جھکے جب کہ خدا کے بعد اس کے فرشتے ہی سب سے زیادہ جھکنے کے قابل تھے، کیونکہ وہ اس عالم کے کارپرداز ہیں، وہ اللہ کے حکم سے بارش لاتے ہیں، ہوائیں چلاتے ہیں، جس طرح ایک حاکم اپنے نائب کا اپنے اہل کاروں سے تعارف کراتا ہے، اسی طرح خدا نے انسان کے آگے فرشتوں کو جھکا کر ایک تعارف یا انٹروڈکشن کرایا کہ انسان کی نسل کو قیامت تک کے لئے یہ سبق یاد رہے کہ وہ بجز خدا کے کسی کے آگے جھکنے کے قابل نہیں، مگر انسان اپنی ہستی اور ذات کو فراموش کر کے انسانیت کی تذلیل اور خون کر رہے ہیں۔

انسان کا اصل دشمن

جنگی تاریخیں صاف بتلاتی ہیں کہ بجز ہوس کی آگ اور پیٹ کی آگ کو

بجھانے کے اور کوئی اہم مقصد حکومتوں کے سامنے نہیں رہا، کسی سیارے اور کسی مریخ سے کوئی دشمن نہیں اترا، باہر سے کوئی ستانے کے لئے نہیں آیا، کسی دوسرے ملک سے بھی ہمیں تباہ کرنے کے لئے کوئی نہیں آیا۔ بلکہ جو کچھ ہماری مصیبتیں ہیں، وہ ہمارے ہی ہاتھوں کی لائی ہوئی اور ہماری اخلاقی پستی کا نتیجہ ہیں۔

آپ سے پہلے جو قومیں دنیا میں تباہ ہوئیں ان پر کسی مرض یا وبا سے تباہی نہیں آئی بلکہ وہ اپنے اخلاق کی خرابی، دولت پرستی اور کیرکٹر کی گراوٹ سے تباہ ہوئیں، سیاسی پارٹیاں چاہے جو مرض اور بیماری بتلائیں، مگر میں تو یہی کہتا ہوں کہ اصلی بیماری انسانیت کی تباہی اور اخلاقی پستی ہے۔

آنکھوں کی ہوس

میں چیلنج کرتا ہوں کہ کوئی ماہر اقتصادیات یہ ثابت کرے کہ جتنی پیداوار ہے اس سے زیادہ آبادی ہے، کیونکہ اللہ نے جس انسان کو پیدا کیا ہے، اس کا رزق بھی پیدا کیا ہے، مگر آج انسان کی ہوس اتنی بڑھ چکی ہے کہ وہ چاہے، ایک سیر نہ کھا سکے، مگر اپنے پاس ایک من دیکھنا چاہتا ہے، یہ آنکھوں کی ہوس کبھی پوری نہیں ہو سکتی، آج فرضی ضرورتوں کی فہرست اتنی طویل ہو چکی ہے کہ جس کی تکمیل کبھی ہو ہی نہیں ہو سکتی ، ہماری ضرورتوں کا پورا کرنا اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے، مگر اللہ نے یہ ذمہ نہیں لیا کہ آپ چار موٹروں کی ہوس کریں، آپ سینما کی ہوس کریں، آپ روپیہ جمع کرنے کی ضرورت سمجھیں، آج اگر انسانوں میں سکون پیدا ہو سکتا ہے، اگر زندگی بہتر بن سکتی ہے تو اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ ایک اچھا قانون تلاش کریں۔

مذہب کو کسی سفارش کی ضرورت نہیں

مذہب کو کسی سفارش کی ضرورت نہیں، جو لوگ مذہب کو ایک مظلوم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، میں ان لوگوں میں نہیں، ہماری مصیبتیں، ہماری پریشانیاں ہمیں اس بات پر خود مجبور کرتی ہیں کہ ہم مذہب کو اپنائیں آپ کب تک ضد کریں گے، اور کب تک اپنی آنکھوں میں خاک ڈالے رہیں گے، آخر آپ کو اپنی اس بے لطف اور تلخ زندگی کا چسکا کب تک پڑا رہے گا، آج میں دعوئی کے ساتھ کہتا ہوں کہ کوئی قانون اور کنٹرول انسانوں کو بد اخلاقی اور جرائم سے نہیں روک سکتا بلکہ خدا کا خوف، اس کا مذہب سے تعلق، انسانوں سے محبت ہی ہماری بیماریوں کا واحد علاج ہے، آج افسوس یہ ہے کہ اس لمبے چوڑے ملک میں جس میں کروڑوں انسان بستے ہیں، اور بڑے سے بڑے انسان ہیں، جو ہمارے لئے قابل فخر ہیں، مگر اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے اور روحانی اور انسانی زندگی کو رواج دینے کے لئے کوئی تحریک اور کوئی جماعت نظر نہیں آتی۔ ہم نے بہت انتظار کیا اور آخر یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہم سے بن پڑے اس کو شروع کریں۔

آزادی کی حفاظت

میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ آزادی حاصل کرنا تو بہت اچھا ہے، مگر اس کو برقرار رکھنا اس کے بغیر ناممکن ہے کہ ہماری اخلاقی حالت درست ہو، اور ہماری زندگی میں انسانیت زندہ ہو، دنیا کی تاریخ بتلاتی ہے کہ کوئی ملک اور کوئی حکومت بغیر اخلاقی ترقی اور انسانیت کی بقا کے قائم نہیں رہ سکتی۔

آج یہ کام ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لئے ضروری ہے، آپ اس یقین کے ساتھ اس سے تعاون کریں کہ بغیر ایک بے لوث خدمت کے جذبہ اور اخلاقی بلندی اور انسانیت کی بیداری کے ہماری زندگی کی مصیبتیں دور نہیں ہو سکتیں۔

یورپ زندگی سے مایوس ہے

یورپ جو آج دنیا کا امام بنا ہوا ہے، اپنی مادی ترقی کے ساتھ ساتھ زندگی سے مایوس ہو رہا ہے، اور زندگی کے حقیقی لطف اور اصل سکون سے محروم اور خالی ہاتھ ہے، اور اپنی مادہ پرستی سے بددل ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کا فرض منصبی

مسلمانوں سے میں صاف کہتا ہوں کہ آپ کو جتنا اصرار خدا کی وحدانیت پر، خدا کی ذات پر اور خدا کے دین پر ہے، اس کا تقاضہ یہ تھا کہ آپ دنیا میں اس اعلان کو عام کرتے اور اس دبی ہوئی حقیقت کو ابھارتے، دوسرے بھائیوں کو یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتے، مگر آپ نے تو اس کی فکر تک نہ کی، آپ دوسرے ملکوں پر نظریں لگانا چھوڑ دیں، اپنے اسلاف کی تاریخ پر نظر ڈالئے کہ اسپین میں لنگر انداز ہونے پر جب طارقؒ نے اپنے جہازوں کو آگ لگوادی، جب ان سے دریافت کیا گیا کہ ایسا کیوں کیا تو تلوار پر ہاتھ ڈال کر جواب دیا کہ جو بزدل جہازوں کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہو، وہ ناامید ہو جائے لیکن ہمارا معبود تو صرف ایک اللہ ہے، جو حی وقیوم ہے، ہم اس کے پیغام کو لے کر آئے ہیں، اور اب ہمیں اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے، آپ اس ملک میں توحید کا تحفہ دے سکتے ہیں، اور یہ تحفہ قبول کرنے کے قابل ہے، میں مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ تم اس ملک میں رہنے کا فیصلہ کرو، کوئی مانے یا نہ مانے مگر تم اس ضرورت کو محسوس کرو۔

ہر چیز اپنے مقام سے ہٹی ہوئی ہے

اس ملک کا سدھار اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک بے لوث خدمت صحیح جذبۂ اخوت و مساوات اور انسانی ہمدردی کا جذبہ نہ پیدا ہو، انسان کی زندگی کا

اصل مقام اور حقیقی مقصد خلیفۃ اللہ (خدا کا نائب) ہونا ہے مگر تم ایک سکہ کے پاؤں تلے اپنا سر رکھنے لگے، تم نے سکہ کو جیب میں جگہ دینے کے بجائے اپنے دلوں میں اور دماغوں میں جگہ دی، گھر گھر جو شوالہ او مسجد بنی ہوئی ہے، وہ روپئے کا شوالہ اور مسجد ہے، جہاں روپئے کی پرستش ہو رہی ہے، خدا کے نائب اور سچے پرستار بن جاؤ اس زندگی کی چول بیٹھ جائے گی، تم اپنے مقام پر آجاؤ، ہر چیز اپنے مقام پر آجائے گی۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

آج دُنیا پر خود غرضی اور بد اخلاقی کا مانسون چھایا ہوا ہے
اسے چادروں سے رُوکا نہیں جا سکتا

یہ تقریر ۱۵ جنوری ۱۹۵۴ء کو جون پور کے ٹاؤن ہال میں کی گئی، شہر کا تعلیم یافتہ اور چیدہ مجمع تھا، کثیر تعداد میں غیر مسلم اصحاب اور مختلف سیاسی جماعتوں اور انتظامی اداروں کے لوگ موجود تھے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آج دُنیا پر خود غرضی اور بد اخلاقی کا مانسون چھایا ہوا ہے اسے چادروں سے رُوکا نہیں جا سکتا

انوکھا جلسہ

دوستو اور بھائیو! زمانہ کی ایک ریت ہے، وہ ایک لکیر سی بن گئی ہے، اس سے ہٹ کر کوئی کچھ کرے یا کہے تو تعجب ہوتا ہے، ہم اس زمانہ کے رواج کے خلاف آپ کے شہر میں آئے، اور عام دستور کے خلاف یہ جلسہ کر رہے ہیں، اس کا نہ کوئی صدر ہے، نہ کوئی تحریک، نہ کوئی تجویز، تعارفی تقریر بھی ہمارے دستور کے خلاف ہوئی، ہمارے عزیز دوست نے اپنی محبت سے ہمارے متعلق بہت کچھ کہا، ہمارے منھ پر ہماری تعریف کچھ کھلتی نہیں، یہ واقعہ ہے، ساتھ ہی ہمیں ان کی محبت کا اعتراف ہے، ہم آپ کے پاس حاضر ہوئے، ہمارے ساتھ ہمارے ستّر اسّی ساتھی اور ہیں، ہم نے کوئی کمال کی بات نہیں کی، خود ہمارے اس ملک میں اور اس کے باہر لوگوں نے تن من دھن سے انسانیت کی خدمت کی ہے، ہمیں انسانیت کے ان محسنوں کی خدمات کو دیکھ کر شرم آتی ہے، جنھوں نے بے نام ونشان رہ کر

بغیر کسی انجمن اور کمیٹی کے انسانیت کی ٹھوس خدمت کی، خدا بھلا کرے یورپ کا کہ اب انجمن اور کمیٹی صدر اور تعارف کے بغیر سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی کام کیا جاسکتا ہے، ہم نے کیا کیا، ہم یہاں محض مالک کی توفیق سے آئے اور مالک کی عطا کی ہوئی زبان سے ہم بول رہے ہیں۔

مجھے آپ سے بے تکلف بات کرنی ہے، مجھے یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ یہ میکروفون ہمارے آپ کے درمیان حائل ہو، اور اس کا احسان لیا جائے، مگر مجبوری ہے، میں اوپر بیٹھ گیا ہوں، تاکہ اپنے بھائیوں کو اچھی طرح دیکھ سکوں ورنہ میں اس وقت جو کہونگا گھر کی سی بے تکلف بات ہوگی، آپ اسے گھر کی بے تکلف مجلس ہی سمجھئے۔

آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے

حضرات!

مجھے آپ سے جس مسئلہ پر کچھ کہنا ہے، وہ ہمارا آپ کا مشترک مسئلہ ہے، مسائل بہت ہیں، ایک ایک مسئلہ کو الگ الگ پیش کروں تو بہت دیر لگے گی اور بات بہت دُور پہنچ جائے گی، یہ زندگی کا بڑا اور دردناک سانحہ ہے کہ یہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے، اس کی خرابی کی جڑ کیا ہے؟ اس پر ہاتھ رکھنا ہے۔

آپ میونسپلٹی کے واٹر ورکس (water works) کے نظام سے واقف ہیں، اگر یہاں نلوں سے خراب پانی آنے لگے جو معدہ کو خراب کرے، اور اس میں بیماریوں کے جراثیم ہوں تو ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے گھر کے نل میں کپڑا باندھ لے، چھان کر پئے یا اُبال کر پئے، لیکن ہوشیاری یہ ہے کہ واٹر ورکس

کو صاف اور درست کرنے کی فکر کی جائے، شہر کے منتظم (-ADMINISTRA
TOR) سے درخواست کی جائے کہ وہ اسے درست کرے، ہم اگر کپڑا باندھ کر یا چھان کر پی لیں گے تو بہت سے راستہ چلتے ناواقف پیاسے ہوتے ہیں، منھ لگا دیتے ہیں، ان کی حفاظت کا کیا طریقہ ہے، آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ اس میں کون سا طریقہ درست ہے؟

آج انسانیت کا واٹر ورکس خراب ہو گیا ہے، جہاں سے زندگی اُبلتی ہے، وہ دہانہ خراب ہو گیا ہے، زندگی کے بجلی گھر (power house) میں خرابی آگئی ہے، جہاں سے سارے شہر میں بجلی تقسیم ہوتی ہے، انسانیت گھلتی پگھلتی جارہی ہے، چور بازاری، رشوت ستانی، دھوکہ بازی کا دَور دَورہ ہے، آج کا انسان ان سب گندگیوں میں مبتلا ہے، آج کے فکر مند انسان ان نتائج پر جھنجھلا رہے ہیں، لیکن غصہ کس پر اُتارا جائے اور اس کا ذمہ دار کس کو سمجھا جائے؟

اصل مجرم کون ہے؟

آپ تو انسان ہیں، جانور بھی اس حقیقت کو سمجھتے ہیں، کہ ان کا دشمن کون ہے، کتا بھی مارنے والے ہاتھ پر دَوڑتا ہے، ڈھیلے سے نہیں الجھتا، گدھے کی بے وقوفی ضرب المثل ہے، اسے ڈھیلا ماریئے تو وہ مارنے والے ہی کے پیچھے غصہ میں دوڑے گا، وہ سمجھتا ہے، خرابی کی جڑ اور مصیبت کا سرچشمہ کہاں ہے، ہم آپ جانوروں سے بھی گئے گزرے، شیشہ کے محل میں رہتے ہیں، چاروں طرف سے ڈھیلے برس رہے ہیں، ایک ہاتھ ہے، جو برسا رہا ہے، ہمیں وہ ہاتھ نظر نہیں آتا، ڈھیلے پر غصہ اتار رہے ہیں، وہ ہاتھ مطمئن ہے کہ نظر سے اوجھل ہے، اور دل

کھول کر ڈھیلے بر سا رہا ہے ، بڑے بڑے لال بھبھکر ڈھیلوں میں الجھے ہوئے ہیں، انسانیت کے سدھار کے غور و فکر میں عام مفکرین (thinkers) کا یہی حال ہے ، ہر ایک کے سوچنے کا طریقہ (way of thinking) ہوتا ہے۔

پیغمبروں کے سوچنے کا طریقہ

ہمارے سوچنے کا طریقہ پیغمبروں کا طریقہ ہے ، ہم پورے غور و فکر اور کافی تجربے کے بعد بالکل مطمئن (convince) ہو گئے ہیں کہ پیغمبر سسکتی ہوئی انسانیت کے مسائل کو جس انداز سے حل کرتے ہیں ، وہی صحیح طریقہ ہے ، جب اس طرز پر ، اس بنیاد پر کام ہوا انسانیت کے دل کی پھانسیں چن چن کر نکل گئیں، آنکھوں کی سوئیاں خود بخود باہر ہوئیں ، ایسی محبت کا زمانہ آیا کہ سب طرف آرام واطمینان ہو گیا ، قرآن کہتا ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا راستہ بتلانے والے آئے ، ان کی تعلیمات پر زمانہ کے پردے پڑ گئے ، کچھ ہمیں علمی غرور بھی ہو گیا ، ہم پڑھ لکھ گئے اس لئے ہمیں ہزار دو ہزار برس پہلے کے طریقہ کار فرسودہ (out of date) معلوم ہوتے ہیں ، اور اس طریقہ پر سوچنا ہمارے لئے عار سا بن گیا ہے ، لیکن یہ حقیقت ہے کہ سورج سب سے پُرانا ہے ، نئی روشنی والے پُرانے سورج سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے ، ہم نے پیغمبروں کا طریقہ اپنایا ، ہم نے انسانیت کے سدھار کا مسئلہ ان سے سیکھا۔

خود غرضی اور بد اخلاقی کا مانسون

وہ بتلاتے ہیں کہ ہر چیز کا ایک مادہ ہوتا ہے ، اگر کسی چیز کا سلسلہ کوئی بند کرنا چاہے اور اس کے نتائج سے بچنا چاہے تو اس کو کوشش کرنی چاہئے کہ اس کا مادہ

ہی نہ پیدا ہونے پائے، آپ کو ایک عام فہم مثال دوں، گرمیوں میں سمندر میں ابخرات (vapours) پیدا ہوتے ہیں، وہ ابخرات اٹھتے ہیں، گرمی سے وہ تحلیل ہوتے ہیں، پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں، اور مُوسلا دھار بارش بن کر برستے ہیں، ہم مانسون (monsoon) کو چادر یا شامیانہ سے نہیں روک سکتے، آج دنیا پر بد اخلاقی کا مانسون چھایا ہوا ہے، یہ زرگری کا مانسون ہے، یہ خود غرضی کا مانسون ہے دل کے سمندر سے خود غرضی اور، نفس پرستی کا شوق جب حد سے بڑھ جائے گا، عیش پرستی کی گرمی اسے گھلائے گی تو خود غرضی کا مانسون برسے گا، جو چادروں سے روکا نہیں جا سکتا۔

اس کا علاج

دل کے مانسون کو روکنے کے لئے اللہ تعالیٰ کا یقین، مرنے کے بعد اپنے اعمال کی جوابدہی کا یقین اور جزا و سزا کا یقین ضروری ہے، ایک ایسا شخص جو ان بجیادوں کو نہیں مانتا اپنے پیدا کرنے والے، روزی دینے والے خالق و رازق کو نہیں پہچانتا، وہ دینا پر اقتدار حاصل کر کے اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائے، وہ کمزوروں کا کیوں لحاظ کرے، وہ جانتا ہے کہ کوششوں سے اسے ایک موقع (chance) ملا ہے، وہ کہتا ہے، زندگی کے پورے مزے لے لو، جو لوگ کسی نہ کسی طرح اپنی چالاکی اور ہوشیاری سے اُوپر آگئے، وہ کیوں کسی کی بالادستی مانیں، کیوں کسی کے قانون کا احترام کریں، اور آج کا عیش کل پر کیوں چھوڑ دیں، اگر مجھے بھی معلوم ہو کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں اور لے دے کر یہی زندگی ہے تو پھر اس دنیا کا عیش کس دن کے لئے اٹھا رکھوں؟ عرب کا ایک نوجوان شاعر بڑا حوصلہ مند (-Am

bitions)اور صاف گو تھا، وہ کہتا ہے، دو قبروں کے ڈھیر برابر ہیں، اچھا وہ رہا جو خوب عیش کے مزے اڑا کر گیا، اور بڑا نامراد وہ ہے، جو تکلیفیں اٹھاتا رہا ہے، جب مرنے کے بعد دونوں کو خاک ہونا چاہیے، اور دونوں کا انجام ایک ہے، تو میں کیوں اپنی حسرتوں کا خون کروں اور کس لئے ایثار کروں جتنا زندگی کا لطف اٹھاؤں (-en joy) کروں، میرا حق ہے۔

دوستو! ایک پرانے شاعر کا جو خدا اور آخرت کا قائل نہ تھا، فلسفۂ زندگی ہے، آج ہمارے اس ترقی یافتہ دور کا بھی یہی فلسفۂ زندگی ہے، آج کا فلسفہ اور تعلیم بھی یہی ہے کہ کھاؤ پیو اور مست رہو (eat drink and be marry) جب زندگی کا یہ نظریہ بن جائے تو اس سے یہی کردار (character) تیار ہوگا جو ہم دیکھ رہے ہیں۔

موجودہ حالات قدرتی اور ہماری ذہنیت وتربیت کا نتیجہ ہیں

انبیاء کہتے ہیں کہ جس میں یقین نہ ہو اس میں خواہشات کا جو مانسون اٹھے گا وہ ضرور برسے گا، آج ساری دنیا پر نفسانی خواہشات کے مانسون منڈلا رہے ہیں، دنیا کے لوگ کیسے عجیب ہیں، سمندر سے ابخرات اٹھے، خاموش رہے، ہندوستان کی طرف بڑھے خاموش رہے، ہمالیہ سے ٹکرائے تو کچھ نہ بولے اب جب ٹکرا کر برس پڑے تو کپڑے بھیگنے کا گلہ ہے آج ساری دنیا کے لال بجھکڑ امریکہ، یورپ اور روس سب اسی طرح کی بولی بولتے ہیں، دل کے بخارات کی پرورش کرتے ہیں اور جب خواہشات کے مانسون برستے ہیں تو اس پر غصہ کرتے ہیں، ہوس کے تالابوں

کو برابر گراتے رہے، ساری عمر تم خواہشات کی تربیت کرتے رہے، اسی کی تعلیم دیتے رہے، تم نے برابر اسی کا استقبال واحترام کیا جو مال ودولت میں تم سے بڑھا ہوا تھا، تمہارا (Ideal) یہ ہے کہ جو جتنا مالدار ہے اتنا ہی اقبال مند اور قابل تعظیم ہے' تم برابر دولت کی تعریفیں کرتے رہے، تمہارا معیار شرافت مالداری ہے، میں کچھ عرصہ ہوا ایک صاحب سے ملنے گیا، وہ بڑی بے التفاتی اور لاپرواہی سے باتیں کرتے رہے، اسی اثناء میں ایک صاحب آئے جن کو میں پہچانتا نہ تھا، وہ سروقد تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے، اور جب تک وہ رہے ہاتھ جوڑ کر باتیں کرتے رہے، جب وہ چلے گئے تو کہنے لگے کہ یہ بتیس روپے فیس والے ڈاکٹر صاحب ہیں، شیخ سعدی نے اپنا واقعہ لکھا ہے کہ وہ ایک دعوت میں معمولی کپڑے پہنے ہوئے چلے گئے، کسی نے ان کی بات نہیں پوچھی، دوسری دفعہ وہ اچھا لباس پہن کر گئے تو کھانے پر ان کو بڑے ادب اور تپاک سے بٹھایا گیا، وہ اپنے کپڑوں پر سالن ڈالتے رہے، جب پوچھا گیا کہ آپ یہ کیا کررہے ہیں تو فرمایا کہ دعوت تو ان کپڑوں کی ہے، انھیں کے طفیل میں کھارہا ہوں اس لئے ان کی خاطر کررہا ہوں، میری ہوتی تو میں تو پہلے ہی میلے کپڑوں میں آچکا ہوں۔

آج دنیا میں یہی ہورہا ہے، آپ نے بچہ کو کب بتلایا کہ اصل شرافت اخلاق اور کردار ہے، اس نے جب سے ہوش سنبھالا آپ کا یہی رویہ دیکھا کہ جو موٹر پر آیا اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور جو یکہ پر آیا اس سے بے التفاتی برتی گئی، اس نے اگر معیار شرافت اخلاق اور انسانیت کے بجائے مالداری کو سمجھا تو کیا بیجا کیا۔

اللہ کے پیغمبر اس کے بَرخلاف تقویٰ اور اخلاق کو معیار شرافت بتلاتے ہیں حضرت عمرؓ سے عرب کے نامی سردار ملنے آئے، ان سے کہا گیا کہ انتظار کریں،

اتنے میں غریب حبشی مؤذن حضرت بلالؓ آئے، وہ فوراً اندر بلا لئے گئے، مدینہ کے ایک اور غریب آئے بلا لئے گئے اور یہ اپنا اپنا کام بارگاہ خلافت سے پورا کرا کے واپس چلے، جیسے کہی بدی بات تھی، عرب کے سردار بادشاہوں کا سا دماغ رکھتے تھے، انھوں نے اسے بہت محسوس کیا، انھوں نے کہا خدا کی شان! ہمارے سامنے یہ فقیر و حقیر بلا لئے جائیں اور ہم بیٹھے رہیں، عجیب معاملہ ہے! ان میں سے ایک سمجھ دار آدمی بولے عمرؓ ترازو میں تول تول کر معالہ کرتے ہیں، اس میں نہ ان غریبوں کا قصور ہے، نہ عمر کا سب کو اللہ کے نام پر پکارا گیا تھا، یہ بڑھ گئے تم بیٹھے رہ گئے تم نے اللہ کے کام کی قدر نہیں کی، وہ آج عمر کے دربار میں تم سے زیادہ قدر والے ہیں، کل خدا کے یہاں بھی تم سے پہلے پوچھے جائیں گے۔

جنگوں کا ذمہ دار کون ہے؟

موجودہ طرزِ زندگی میں انسانیت کی بڑائی مالداری اور مادی عروج ہے، ہمارا لٹریچر، ہمارا آرٹ، ہمارا ادب سب یہی تعلیم دیتے ہیں کہ جس کے پاس مادی وسائل زیادہ ہوں، اور جو جتنا زیادہ مالدار ہو اتنا ہی وہ شریف ہے، دولت مند ہی آدمی ہے، غریب آدمی ہی نہیں، آج دنیا میں سارا فساد اسی طرزِ فکر اور اسی معیار زندگی کا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص جلد سے جلد مالدار بننا چاہتا ہے، اور اسی کے لئے جائز و ناجائز سب طریقے اختیار کرتا ہے، اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ عزت، دولت ہی سے ہے۔

گزشتہ دونوں جنگیں مال و دولت اور عزت اور وجاہت کی ہوس کا نتیجہ تھیں، میرا ٹرین میں ایک ہندو دوست سے تعارف کرایا گیا، وہ چھوٹتے ہی کہنے لگے

کہ دنیا میں سارا فساد مولویوں اور پنڈتوں کا برپا کیا ہوا ہے، ان کا پیشہ ہی یہ ہے، میں نے عرض کیا کہ جی ہاں! پہلی اور دوسری جنگ مولیوں اور پنڈیوں ہی کی برپا کی ہوئی تھی، اس پر وہ خاموش ہو گئے، میں آپ سے کہتا ہوں کہ دنیا بھر کا خون پینے اور خون کی ہولی کھیلنے والے یہودی صفت کارخانہ دار تھے، ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں یہودی کارخانہ داروں کا ہاتھ تھا، ان کے اسلحہ (Ammunitions) کے بڑے بڑے کارخانے تھے، ان کو کھپانے کے لئے ان کو بڑی بڑی منڈیوں کی ضرورت تھی، ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت انھوں نے سازشیں کیں، وارداتیں کیں، اور ملکوں اور قوموں کو لڑادیا، ایک کارخانہ کو چلانے کے لئے انھوں نے اتنا بڑا فساد برپا کیا کہ جس میں لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں، اور ملک کے ملک تباہ ہو گئے، بس آج قوموں کو ٹکرانے والا جذبہ یہ ہے کہ بس ہماری تجوری بھرے اور ہمارا بول بالا ہو، ہمارا سکہ چلے، ہماری قوم سرفراز ہو، یہ بڑے پیمانہ کی خود غرضیاں سارے فتنہ وفساد کی جڑ ہیں، تہذیب یا کلچر یا زبان کا اختلاف فساد کا باعث نہیں ہوا، میں پوچھتا ہوں کیا ایک کلچر، ایک تہذیب اور ایک قومیت کے لوگ نہیں لڑے، ہمارے یہاں کورو پانڈو لڑے ہیں، جو ایک ہی خاندان کے لوگ تھے، عرب میں قبیلہ سے قبیلہ لڑا ہے، جس کی ایک ہی زبان اور ایک ہی کلچر تھا، افغانستان میں پٹھان پٹھان سے، پاکستان میں مسلمان مسلمان سے اور یہاں ہندوستان میں ہندو ہندو سے لڑتا ہے، اس ٹکراؤ میں نفسانی اغراض کام کر رہے ہیں، خود غرضیاں ٹکرا رہی ہیں، غرض کا مذہب ٹکرا رہا ہے۔

اندر کا لاوا باہر کو پھونک رہا ہے

پیغمبروں کا طریقہ یہ ہے کہ دل کی خرابی دُور ہو، باہر جو بگاڑ ہے، وہ اندر سے پھوٹ رہا ہے، اندر کا لاوا باہر کو پھونک رہا ہے، ہم سمجھے باہر کی خرابی اندر گھس گئی ہے، اور باہر کی اصلاح میں لگ گئے، جس طرح سارے جسم پر دل کی بیماری کا اثر پڑتا ہے، اسی طرح پورے نظام زندگی پر نیتوں کے فتور اور ذہنیت کی خرابی کا اثر پڑتا ہے، پرانے قصوں میں آتا ہے کہ ایک بادشاہ سیر و شکار میں اپنے ہمراہیوں سے جُدا ہو گیا اور اس کو رات ایک بڑھیا کی جھونپڑی میں گزارنا پڑی، بڑھیا نے دودھ دوہا وہ سیروں اترا، بادشاہ نے یہ ماجرا دیکھا تو اس پر ٹیکس لگانے کا ارادہ کیا، دوسرے وقت بکری کا دودھ کم ہو گیا، بادشاہ وہیں بیٹھا تھا، بڑھیا اسکو پہچانتی نہیں تھی، بڑھیا نے بڑے افسوس سے کہا کہ آج بکری کا دودھ کم ہو گیا، شاید بادشاہ کی نیت میں فتور آگیا۔

انسان اس دنیا کا بادشاہ ہے، اس کی نیت میں فتور آگیا، اس کا دل بگڑ گیا اس لئے یہ سب فساد اور خرابی نظر آرہی ہے، پیغمبر کی نظر بہت گہری ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں دل کا پاپ دھو، دلوں کو مانجھو، دل ٹھیک کرو، دل کا بگاڑ ہی تو ہے کہ (Food control) ہوا، چور بازاری شروع ہو گئی، اور جب قیمتوں کا کنٹرول (Price Control) ہوا تو سامان مفقود ہو گیا، اور لوگ ضرورت کی چیزوں کو ترسنے لگے، جب تک انسان کا پاپی مَن درست نہیں ہوتا، کچھ نہیں ہوتا ہے، کمیونزم (Com-munism) نے بھی اس حقیقت کو نظر انداز کیا کہ بگاڑ اندر سے شروع ہوتا ہے، وہاں بھی من کی کوئی فکر نہیں کی گئی، مزدور فاقہ مستی کر رہے ہیں، وہ ان کے خون اور پسینہ پر عیش پرستی کر رہے ہیں، ان کی لاشوں پر شاندار عمارتیں تیار کر رہے ہیں، انھوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ ہر طرف من مانی ہو رہی ہے۔

نشہ بندی کی کوشش میں امریکہ کی ناکامی

ہماری سوسائٹی پاپی ہوگئی ہے، اس میں ظلم کا رجحان پیدا ہوگیا ہے، صرف شکوہ گِلہ سے دنیا کی اصلاح نہیں ہوسکتی، دل صرف خدا کے خوف سے سُدھر سکتا ہے، وہ صرف پیغمبروں کے بتلائے ہوئے طریقہ سے درست ہوسکتا ہے، اگر محض علم وادب یا آرٹ اور سائنس سے درست ہوسکتا تو یورپ کا من پاپ سے بالکل پاک ہوتا، امریکہ میں نشہ بندی کا منصوبہ بنایا گیا، اس کے خلاف محاذ جنگ قائم ہوا، امریکہ نے کروروں روپے پانی کی طرح بہائے، ایک زبردست مہم (campaign) چلائی گئی، اور ایڑی چوٹی کا زور شراب بند کرنے پر لگادیا گیا، اس کے خلاف اتنا زبردست اور وسیع لٹریچر تیار کیا گیا کہ اگر اب اخبارات اشتہارات اور میگزینوں کو پھیلایا جائے تو کئی میل تک پھیل جائے، لیکن جتنی کوشش کی گئی امریکہ کی مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کو اس کی اور زیادہ ضِد ہوگئی۔ شراب کا استعمال پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوگیا، آخر حکومت نے عاجز آکر قوم کے ارادہ اور ضِد کے مقابلہ میں ہار مان لی اور قانون واپس لے لیا، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ، خارجی انتظامات اور دماغ کے راستہ سے جو کوششیں کی جاتی ہیں، وہ ناکام رہتی ہیں، اور کوئی بڑا نتیجہ نہیں پیدا کرتیں، امریکہ کی پڑھی لکھی اور مہذب دنیا نے لٹریچر اور ادب کے معقول اور وزنی دلائل کی ذرا پرواہ نہیں کی اور اپنے نفس اور خواہش کا ساتھ دیا۔

ملک کے لئے سب سے بڑا خطرہ

اس ملک میں جو اخلاقی انارکی پھیلی ہوئی ہے، وہ یہاں کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے، افسانے اخلاق سوز باتیں پھیلا رہے ہیں، ہماری نئی نسلوں کو

سوز حیا انجیکشن دیئے جارہے ہیں، سنیما کے پردوں پر پاپ دکھایا جارہا ہے، آنکھوں سے، کانوں سے دل میں پاپ اتارا جارہا ہے، اخبار اور رسالے پاپ کی کھلم کھلا تبلیغ کررہے ہیں، اور اس کا کوئی توڑ نہیں، ہم صفائی سے علی الاعلان کہتے ہیں، ہمیں آزادی طی اللہ کی بڑی نعمت ہے، لیکن اگر ہم اخلاق پر کنٹرول نہیں رکھ سکتے تو آزادی بھی قائم نہیں رہ سکتی۔

یورپ اور ہندوستان کا فرق

یورپ میں ہزاروں خرابیاں ہیں، لیکن وہ تھما ہوا ہے، کچھ شک نہیں مغربی زندگی میں بہت سے اخلاقی جرائم اور بداخلاقیاں پائی جاتی ہیں، لیکن وہ ذرا آراستہ (refined) قسم کی ہیں، وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بااصول، پابند اور مہذب ہیں، ان میں گھٹیا قسم کی چھوٹی چھوٹی بے ایمانیاں نہیں پائی جاتیں، وہ ذمہ داری کا احساس رکھتے ہیں، اور ان کی شہری اور مجلسی زندگی زیادہ منظم اور باقاعدہ ہے، میرے ایک دوست نے بتلایا کہ وہ لندن میں برٹش میوزیم میں کچھ علمی کام کررہے تھے، لائبریری کے ساتھ وہاں رستورنٹ بھی ہوتے ہیں، اور ان میں عموماً (Girls) کام کرتی ہیں، وہ کہتے تھے کہ میرا روزانہ کا معمول تھا کہ جب تھک جاتا تو ہوٹل میں جاکر مچھلی کے کباب کھایا کرتا، اور جتنے پیسے، مجھے بتلائے گئے تھے، اتنے روز دے آیا کرتا تھا، ایک دن جب میں پیسے دینے لگا تو وہاں کی منتظمہ نے مجھ سے کہا اچھا آپ ہی ہیں جو روزانہ دو پیسے زیادہ دے جایا کرتے ہیں، ہمارا حساب بڑھتا تھا، اور ہم کئی روز سے اس شخص کی تلاش میں تھے، جو زیادہ (Payment) کرجاتا ہے، آپ کو غلطی سے دام زیادہ بتلا دیئے گئے، یہ آپ کے

پیسے ہیں، جو الگ رکھ لئے گئے ہیں، یورپین لڑکی میں ایمانداری کا وصف خدا پرستی کے جذبے سے نہیں پیدا ہوا، وہاں چرچ فیل ہو چکا ہے، ایمانی قدریں (values) ضائع ہو گئیں، تو انھوں نے خالص مادی نفع کے لئے یہ تجارتی اخلاق وضع کر لئے اور ایسا ذہن بنا لیا جو کامیاب تاجر کے لئے ضروری ہے۔

اخلاق کی دو قسمیں

یورپ کے اخلاق میں توازن نہیں، ان کی مثال وہی ہے، کہ گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز، افراد کے چھوٹے چھوٹے معاملوں میں وہ بڑی ایمانداری سے کام لیتے ہیں، لیکن جب اپنی قوم کی مصلحت کا تقاضہ ہوتا ہے تو ایسے ایماندار افراد قوموں کو نگل جاتے ہیں انفرادی زندگی میں ان کا یہ حال ہے کہ اگر ۹ بجکر ۱۲ منٹ پر آنے کا وعدہ کریں تو ٹھیک اسی وقت پہونچیں، لیکن قومی معاملات میں دوسری قوموں کو دھوکا دینے میں انھیں ذرا تامل نہیں، عربوں کے ساتھ ان کی عہد شکنی ضرب المثل ہے، ہم خود ان کا یہاں تجربہ کر چکے ہیں، ان میں اخلاق، خدا پرستی اور آخرت کی جوابدہی کی بنیاد پر نہیں آئے، بلکہ نفع اندوزی اور مصلحت کے لئے انھیں اخلاقی ذہن بنانا پڑا جب مصلحت کا تقاضا ہو تو بڑے بااخلاق، وعدہ کے پکے، اور جہاں ان کی مصلحت کا تقاضا کچھ اور ہو تو بڑی سے بڑی بد اخلاقی میں ان کو باک نہیں۔

پیغمبروں کے پیدا کئے ہوئے اخلاق

پیغمبروں کی تعلیم سے جو اخلاق بنتے ہیں وہ مستقل اور مصلحت اندیشی سے پاک ہوتے ہیں، نفع ہو یا نقصان، جان جائے یا رہے، وہ اعلی اخلاق کو نہیں

چھوڑتے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم سے ایسا ذہن بنا تھا کہ خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ جو اس وقت متمدن دنیا کے سب سے بڑے فرمانروا تھے، ایک رات حکومت کا کام کر رہے تھے، سرکاری چراغ جل رہا تھا، ایک ملنے والے آگئے، وہ سلام کر کے مزاج پوچھنے لگے، انھوں نے جواب دینے سے پہلے چراغ بجھا دیا، پھر ٹمٹماتا ہو دیا منگایا، آنے والے نے جب دریافت کیا تو کہا وہ بیت المال کا چراغ تھا، تم آپس کی باتیں کرنے لگے، اس لئے میں نے اس کو گل کر دیا کہ اگر اس کی روشنی میں گھریلو باتیں کروں گا تو اللہ کو کیا جواب دوں گا، ایسی احتیاط کے نمونے کہیں کریملن (krem-lin) کے حدود میں نظر آسکتے ہیں، یہ اخلاقی قدریں اور روحانی بلندیاں ان کے خیال میں نہیں آسکتیں، وہ زیادہ سے زیادہ اتنا سوچ سکتے ہیں، اور ان کے خیال کی پرواز یہیں تک محدود ہے کہ ہر انسان کو پیٹ بھر کھانا، دوا اور رہنے کا مکان ہو، بیگار نہ لو، خواہشات کا احترام کرو، وغیرہ وغیرہ۔

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ جو ایران اور رومن امپائر کی دو زبردست شہنشاہیوں کے زبردست فاتح تھے، ان کے زمانے میں قحط پڑا تو اچھی غذا اپنے اوپر حرام کرلی، وہ سرخ و سفید تھے لیکن تیل کھاتے کھاتے ان کے چہرے کا رنگ سانولا ہو گیا۔

سب سے بڑی وطن دوستی اور ملک کی وفاداری

ہم سیدھی سادی بات یہ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے راستہ کی دعوت دینے آئے ہیں، ہم اس بنیاد پر انسانوں کو انسانیت کی دعوت دینے آئے ہیں، ہم اس کو سب سے بڑی وطن دوستی اور ملک کی وفاداری سمجھتے ہیں، ہم سے زیادہ کوئی اس کی

خدمت نہیں کر سکتا، ہم مانتے ہیں کہ ملک کے لئے ایسے ادارے ضروری ہیں، جن سے ملک ترقی کرے، ہم ان کی تحقیر نہیں کرتے، ملک کے لئے تعلیمی اداروں، شفاخانوں، صفائی کے محکموں کی ضرورت ہے، رسل ورسائل (Communi-Cation) دفاع (Defence) اور دوسرے محکموں کی ضرورت ہے، ان سب کے باوجود ملک میں ظلم، اندھیر اور دوسرے کے پیٹ کاٹنے کا جو طاعون پھیلتا جارہا ہے، اسے نہ روکا گیا تو اسکی عزت، اس کا وقار، اس کی آزادی خاک میں مل جائیگی، ہم سب سے کہتے ہیں کہ یہ ملک کی سب سے پہلی ضرورت ہے، وہ تمام ادارے جنھیں میں پہلے ضروری اور مفید کہہ چکا ہوں سب اس کے بعد آتے ہیں ہم اس حقیقت کے پرچار کے لئے گھر سے نکلے ہیں، کوئی اور اس کام کو کرتا ہوتا تو اس کے ساتھ تعاون (Co-operate) کرتے۔

ہماری دعوت

ہم علی الاعلان ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ ہم اس ملک میں حصہ رسد بٹانے نہیں آئے تھے، ہم ان ملکوں کو چھوڑ کر جو خود دولت سے بھرے ہوئے تھے، یہاں کی دولت میں حصہ لگانے نہیں آئے تھے، ہم ایک مشن، ایک خدمت پر آئے تھے، ہم یہاں خدا کے بندوں کو خدا کا بندہ بنانے آئے تھے، یہاں جو مسلمان آئے تھے، وہ اخلاق، محبت، خدا پرستی کا پیغام لے کر آئے تھے، انھوں نے اس ملک کو کچھ دیا لیا نہیں، وہ یہاں سے کچھ لینے نہیں آئے تھے، اس کو کچھ دینے آئے تھے، وہ رہنے آئے تھے، یہاں سے جانے کے لئے نہیں آئے تھے۔ اگر ایسا سوچتے تو تاتالہ کی ایسی شاندار و پائدار مسجد نہ بناتے، وہ تو خدا پرستی اور انسان دوستی کی دعوت دیتے تھے،

کہاں کے عرب، کہاں کے عجم، یہ سب ہماری بنائی ہوئی خود ساختہ حدیں ہیں، ساری دنیا کے پیدا کرنے والے خالق ومالک اور رازق اور ساری دنیا کو بغیر شرکت کے چلانے والے، ایک اللہ کی طرف سے وہ یہ تعلیم لائے تھے انہوں نے دنیا سے لئے بغیر ساری دنیا کی خدمت کی، انھوں نے سچے موتیوں سے انسانیت کی جھولی بھر دی اور اپنے ہاتھ خالی رکھے، اپنے بچوں کی مطلق فکر نہ کی اور اپنے کنبے کی طرف سے آنکھیں بند کر کے، پیٹ پر پتھر باندھ باندھ کر لوگوں کی سیوا کی، ان کی تکلیفوں کو راحتوں سے بدلا، جو آیا غربا میں تقسیم کیا، ضرورت مندوں کی جھولیاں بھر دیں، انھیں خادم اور ملازم دیئے اور اپنے بچوں کو بالکل محروم رکھا، ایک دفعہ جناب رسول اللہ ﷺ چٹائی پر لیٹے تھے، جسم پر نشانات پڑ گئے تھے، حضرت عمرؓ نے دیکھا تو کہا کہ اللہ اکبر! آپ اللہ کے رسول ہو کر اس تکلیف میں رہیں، اور دنیا کا خون چوسنے والے ظالم قالینوں اور مسہریوں پر آرام کریں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا، عمر! عیش تو آخرت کا عیش ہے۔

مسلمانوں کی غلطی

ہم مسلمانوں سے کڑوی بات کہتے ہیں، ہم ان سے کہتے ہیں، تم نے ان باتوں کو مانا ہے، تمہارا ان پر ایمان ہے، تم ان اخلاق و کردار کو چھوڑ کر جانوروں کی سطح پر آ گئے، تم اپنے کردار اور عمل سے اسلام کو بدنام کرتے ہو، اس کے روشن نام کو بٹہ لگاتے ہو، تم دنیا کو اسلامی زندگی کی جو چلتی پھرتی فلم دکھلا رہے ہو، وہ بڑی افسوس ناک ہے، تم نے جو زندگی کا نمونہ پیش کیا ہے، اس میں کون سی جاذبیت (Attraction) ہے، پہلے تم جس راہ سے گزر جاتے تھے، نقش چھوڑ

جاتے تھے، دیر تک تمہاری خوشبو محسوس ہوتی رہتی تھی، جیسے نسیم کی خوشگواری محسوس ہوتی رہتی ہے، مسلمان جدھر سے گذر گئے، گلی کوچے معطر کر گئے، اور جہاں سے چلے آئے وہاں سے سفارتیں بھیجی گئیں کہ ہمارے ملک میں سب کچھ ہے، مسلمان نہیں ہیں، جنھیں دیکھ کر لوگ اپنی زندگی درست کریں، اور جو ان کے مقدمات و معاملات میں بے لاگ فیصلہ کریں، ان کی خواہش پر مسلمان بھیجے گئے، افسوس! اب تم ایسے بن گئے کہ تمہارے نہ ہونے سے ملک میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی، آج تک کسی نے اپنے ملک سے ماہرین فن، ڈاکٹروں اور دستکاروں کو نکالا ہے؟ مشرقی پنجاب میں لوہاروں کی ضرورت تھی، تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ بسائے گئے، اگر تم میں اخلاقی برتری (Moral Superiority) ہوتی تو اخلاقی ضرورت کا احساس مجبور کرتا کہ تمہیں ملک کی امانت سمجھ کر رکھا جائے، تمہارے دودھ والے پانی ملانے سے پرہیز کرتے، تمہارے درزی کپڑا چھپانے کو عیب سمجھتے، تمہارے دستکار اور مزدور محنت سے پورا دن لگ کر کام کرتے، تمہارے حاکم رشوت کو حرام سمجھتے تو دنیا کا کوئی ملک تمہاری جدائی کو گوارا نہ کرتا۔

ایک کشتی کے سوار

اپنے وطنی بھائیوں سے بھی مجھے دلی محبت ہے، ہمارا آپ کا مستقبل ایک دوسرے سے وابستہ ہے، آپ اچھے تو ہم بھی اچھے، آپ کی تکلیف ہماری تکلیف ہے، اللہ کے پیغمبر کسی خاص ملک کو نوازنے نہیں آئے، وہ سارے عالم کے لئے رحمت بن کر آئے "وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" خدا کے آخری نبی حضرت محمد عربی ﷺ نے آکر عربوں کے قومی غرور کو پاش پاش کر دیا، انھوں نے فرمایا کہ اللہ نے

تمہارے نسلی غرور کو توڑ دیا ہے، میں انھیں اپنے قدموں سے روند رہا ہوں، عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، نہ عجمی کو عربی پر، تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے بنے تھے، ہم سب ایک کشتی کے سوار ہیں، کشتی میں ایک اوپر کا درجہ (Sto-rey) ہے، اور ایک نیچے کا، نیچے والے اگر اس میں سوراخ کریں، اور اوپر والے ان کا ہاتھ نہ پکڑیں تو کشتی غرق ہو جائے گی، اور نیچے اوپر والے سب ڈوب جائیں گے'

آج ہمارے ملک کی زندگی کے نچلے حصہ میں شگاف کیا جارہا ہے، اسے روکنے کی فکر کریں، اس میں پاجامے اور دھوتی کی کوئی تمیز نہیں، کسی کلچر اور تہذیب کی کوئی قید نہیں، سمندر کسی کی رعایت نہیں کرتا، ہمیں اللہ سمجھ دے، سینوں کو روشن کرے، ہم انسانیت کا درد محسوس کریں، اپنے اس پیارے ملک کو جس پر ہمارا حق ہے، جس کو ہم نے اپنے خون پسینہ سے سینچا ہے، ہم پیغمبروں کے راستے سے سنواریں، ہم اس کو ایک نمونہ کا ملک بنادیں جس میں ایمان، یقین اخلاق، انسانیت اور ہمدردی وایثار کی فضا ہو، اس کے لئے ایک جری قدم (Bold step) کی ضرورت ہے، قدم اٹھائیے، ہمت کیجئے، میں نے کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے' آپ اس کا وزن محسوس کریں، یہ بوجھ تنہا ہماری طاقت سے باہر ہے، اس کا پرچار کریں، اور سنجیدگی سے اس کے لئے کچھ کرنے کا فیصلہ کریں۔

وآخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمين

حرمین شریفین اور جزیرۃ العرب کے بیرونی مقیمین کی ذمہ داریاں اور اہلِ وطن کے حقوق

یہ اہم تقریر ۱۳/اپریل ۱۹۸۶ء کو جدہ میں ہندوستانی وپاکستانی احباب کے ایک عظیم مجمع میں کی گئی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرمین شریفین اور جزیرۃ العرب کے بیرونی مقیمین کی ذمہ داریاں اور اہلِ وطن کے حقوق

خطبۂ مسنونہ کے بعد!

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ط اِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ. یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں تو میری ہی بندگی کرو۔

حضرات! میں اس کو بڑی صحت مندانہ علامت سمجھتا ہوں کہ بغیر کسی بڑے اعلان واہتمام کے آپ حضرات اپنی مصروفیتوں کے باوجود اتنی بڑی تعداد میں یہاں تشریف لائے اور ذوق وشوق کے ساتھ تشریف رکھتے ہیں، یہ زندگی اور

زندہ دلی کی بھی علامت ہے، اور اس ایمانی رشتہ کی طاقت کی بھی دلیل ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے آپ کے اور دنیا کے تمام مسلمانوں کے درمیان قائم کیا ہے، میں نے ابھی جو آیت پڑھی اس میں خود کہا گیا ہے کہ یہ تمہاری امت ایک ہی جماعت ہے، اور میں تمھارا رب ہوں تم میری ہی بندگی کرو۔

یہ مجمع اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ مختلف ملکوں کے مسلمان بھائی اپنے ایک دینی بھائی کی بات سننے کے شوق میں دُور دُور سے تشریف لائے ہیں۔

حضرات!

میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے معاش کے مسئلہ کو اس سرزمین سے مربوط فرمایا، لیکن یہ آپ کو نہیں بھولنا چاہئے کہ اس سرزمین کا اصل پیغام، اس سرزمین کا اصل تحفہ اور اس سرزمین کی اصل نعمت وہ چیز ہے جو ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے اور جس کے بغیر نہ معاش کا نظام درست ہو سکتا ہے، نہ معاد کا، یہ تو سب جانتے ہیں کہ معاد کا نظام تو درست ہی نہیں ہو سکتا، لیکن یہ کم لوگ جانتے ہیں کہ معاش کا نظام بھی درست نہیں ہو سکتا، اور جو ملک محض معاشی مسئلہ پر قائم ہیں، اور انکے افراد کا آپس کا تعلق محض معاشی ہے وہ ایک غیر فطری نظام کے ماتحت زندگی گذار رہے ہیں، جس کے ساتھ نہ اللہ کی مدد ہے نہ اللہ کی رحمت ہے، جتنے مسائل بھی اس وقت ان ملکوں میں اور ان ملکوں کے اثر سے دوسرے ملکوں میں پیدا ہو رہے ہیں، وہ سب اسی کا نتیجہ ہیں کہ وہاں معاش معاد کے ساتھ مربوط نہیں ہے، اور زندگی کا وہ صحیح مقصد وہاں نہیں پایا جاتا جو خالق انسان نے انسان کے لئے متعین کیا ہے، وہ مقصد وہی ہے جس کا آیت ذیل میں

تذکرہ ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ مَا اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَا اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں، میں ان سے طالب رزق نہیں، اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے (کھانا) کھلائیں، خدا ہی تو رزق دینے والا ہے، زور آور اور مضبوط ہے۔

یہ حقیقت ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے، اس لئے وہاں معاد کا معاملہ تو الگ رہا معاش بھی خطرہ میں ہے، وہاں وہ معاشی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں جن کا کوئی حل نہیں ہے، وہاں ایک فرد کا مفاد دوسرے فرد کے مفاد سے، ایک جماعت کی ترقی دوسری جماعت کی ترقی سے، ایک حکومت کا نظام دوسری حکومت کے نظام سے ٹکرا رہا ہے، معاش معاش سے ٹکرا رہی ہے، بلکہ اس ملک کی معاش دوسرے ملکوں کی معاش کو خراب کرنے یا استحصال پر آمادہ کرتی ہے، اس ملک کی معاشی ترقی کا انحصار بھی دوسرے ملکوں کی معاشی ابتری اور بد نظمی پر موقوف ہے، اس لئے نہ صرف اس ملک میں مسائل پیدا ہو رہے ہیں بلکہ اس ملک کی وجہ سے دوسرے ملکوں میں بھی نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں، اور وہ معاش انکے لئے وہاں جان بن گئی ہے، یہ ایک ایسا مسئلہ لا ینحل ہے، جس کا حل انکی سمجھ میں نہیں آرہا ہے، ان کے بڑے بڑے عقلاء و مفکرین سرگرداں و پریشان ہیں، مگر راستہ نظر نہیں آتا۔

لیکن اس سرزمین پر اللہ تعالیٰ کا جو گھر (کعبۃ اللہ) ہے، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ اللہ نے کعبہ مکان محترم کو (اجتماعی

زندگی کے) قیام کا ذریعہ، اور انسانوں کے باقی رہنے کا مدار ٹھہرا لیا ہے۔

اس حقیقت پر ابھی تک کم لوگوں کی نگاہ گئی ہے کہ نظام عالم کعبۃ اللہ اور اس کی دعوت و مقام سے وابستہ ہے، اس کو ہماری ظاہری نگاہیں نہیں دیکھ رہی ہیں، لیکن اہل بصیرت سمجھتے ہیں کہ جس طرح پہاڑوں کا وجود ملک اور زمین میں ایک استقرار و توازن پیدا کرتا ہے، اسی طریقہ سے اس سے ایک بالاتر نظام ہے، اور وہ نظام وابستہ ہے بیت اللہ سے، جب تک بیت اللہ قائم ہے اور اس کا وہ پیغام زندہ ہے، اس وقت تک گویا نظام عالم قائم ہے۔

آپ اسکو نہ بھولیں کہ اس سرزمین مقدس کا پیغام یہ نہیں تھا کہ خوب کماؤ اور کھاؤ، پھلو پھولو، نسل انسانی میں اضافہ کرو، اور اپنی زندگی راحت کے ساتھ گزار کر چلے جاؤ، حضرت ابراہیمؑ نے جب یہ کہا کہ:

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَوٰةَ (سورة ابراهيم. ۳۷) اے پروردگار میں نے اپنی اولاد میدان (مکہ) میں جہاں کھیتی نہیں، تیرے عزت (و ادب) والے گھر کے پاس لا بسائی ہے، اے پروردگار تاکہ یہ نماز قائم کریں۔

تو ابراہیمؑ نے اس وادی مکہ اور حجاز کے مقام کا قیامت تک کے لئے تعین کر دیا، اصلاً اس وادی کی فطرت "وادی غیر ذی زرع" ہونے کی ہے، اس لئے اگر اس میں بھی کبھی سرسبزی و خوش حالی، باغات اور کھیتیاں، مرغزار و سبزہ زار، پانی کی بہتات، دولت کی فراوانی اور تجارت کی گرم بازاری دیکھنے میں آئے تو یہ اوپری چیز ہوگی، یہ اندر کی چیز نہیں ہوگی، یہ اس کے لئے ایک غیر فطری، مصنوعی اور عارضی عمل ہے، اس وادی کے اصل مزاج کا پہچاننے والا حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ

کون ہو سکتا ہے، اور کون اس کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ انھوں نے الہام ربانی اور ہدایت آسمانی سے اپنی اولاد کو یہاں لاکر چھوڑا تھا، اور کہدیا تھا کہ میں نے اپنی اولاد کو "وادی غیر ذی زرع" میں بسایا ہے، یہاں اپنا خاندان چھوڑ کر جارہا ہوں، گویا قیامت تک کے لئے اس وادی کا مزاج اس وادی کا مقام اور اس وادی کی فطرت کو متعین کر دیا، اب یہاں اگر رزق اور معاش کی برکتیں زمین سے ابلیں اور آسمان سے برسیں، جب بھی اس وادی کا مزاج وہی رہے گا جو سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے بیان کیا اور جس کے ساتھ انھوں نے اس کا رشتہ اور ربط قائم کیا۔

غور فرمایئے "اِنّی اَسْکَنتُ مِنْ ذُرِّیّتی بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ" سے "رَبَّنا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" کا ربط کیا ہے؟ فرماتے تو یہ ہیں کہ میں نے اپنی اولاد کو اس وادی غیر ذی زرع میں آباد کیا ہے، اے ہمارے پروردگار تاکہ یہ نماز قائم کریں، نماز پڑھیں، آپ نے لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃ کہا یہ نماز کے قائم کرنے والے ہوں، یہ نماز کے داعی بنیں، یہ نماز کے قیام کے روئے زمین پر ذمہ دار ہوں، اگر وہ اپنی اولاد کو نینوا کی سرزمین یا دجلہ وفرات کی وادی میں چھوڑتے (جہاں کے وہ رہنے والے تھے) یا مصر میں جس سے گزر کر آئے تھے، یا شام میں جہاں پھر مسجد اقصیٰ بنی، اور آپ ہی کی اولاد نے بنائی، کیا وہاں لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃ کا ظہور و تحقق نہیں ہو سکتا تھا؟ آپ سب جانتے ہیں کہ وہاں نمازیں پڑھی جارہی ہیں، خدا کے فضل وکرم سے مسلمان موجود ہیں، جگہ کے انتخاب اور اسکی تعریف اور نماز کے قیام واہتمام کے درمیان جو ربط ہے وہ یہی ہے کہ یہ جب نظر اٹھا کر دیکھیں گے تو انھیں جلے ہوئے پہاڑ نظر آئیں گے، انھیں خشک زمین نظر آئے گی، انکو کہیں بہتا ہوا دریا، چلتی ہوئی نہر نظر نہ آئے گی، تو ان کی فطرت صحیحہ اور انکا ذہن سلیم ان کی رہبری

کرے گا کہ ہمارے جدِ امجد ہمارے مورث اعلیٰ کے اس زمین کا انتخاب کرنے کا راز کیا ہے؟ راز یہ ہے کہ اگر ان کو ہم سے معاشی مسئلہ حل کروانا ہوتا، ہم کو خوشحالی عطا کرنی اور آسودگی کی زندگی بسر کروانی ہوتی تو پھر کسی سرسبز و متمدن زمین کا انتخاب کیا ہوتا، یہاں ٹھہرانے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ہم سے زیادہ مناسبت ہے،

ان آیات قرآنی کی روشنی میں یہاں کے رہنے والوں کے ذہن میں (چاہے وہ باہر سے آئے ہوں یا یہیں کے رہنے والے ہوں) وادی غیر ذی زرع اور اقامتِ صلوٰۃ کے درمیان جو رشتہ اور روابط ہے، ہمیشہ مستحضر اور تازہ رہنا چاہیے، اس سر زمین کا اصل پیغام ہے: دنیا میں خدا کی عبادت کی دعوت دینا، اسکے خدائے واحد ہونے کا اقرار کروانا، اور اس کے سامنے سجدہ ریز کرنا، اور اسی کی عبادت کو زندگی کا مقصود سمجھنا، اور اسی کو راضی رکھنے کی کوشش کرنا، اور سارے معاشی اور دنیاوی نظام کو اسی کے احکام کا تابع بنانا، اور لوگوں کو بتانا کہ وہ اس نظام کے باغی نہ ہوں، بلکہ اس نظام کے فرماں بردار ہوں، خلاصہ یہ ہے کہ یہ ضروری ہے کہ آپ سمجھیں کہ یہاں کا پیغام اور یہاں کی سوغات کچھ اور ہے، یہاں کے ذرہ ذرہ سے کوئی اور صدا آرہی ہے، یہاں کی ہوا کا ہر جھونکا ایک دوسری زندگی کا پیغام دیتا ہے، ایسی زندگی گزارنے کا پیغام دیتا ہے جس میں مادیت روحانیت کے تابع ہو، معاش معاد کے تابع ہو، جہاں اعمال عقائد کے تابع ہوں، اقتصادیات اخلاق کے تابع ہوں، اور جہاں ہر محبت خدا کی محبت کے تابع ہو۔

یہ بات تو میں نے یہاں اسی مناسبت سے عرض کی، اب یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ حضرات زیادہ تر ہندوستان وپاکستان سے تشریف لائے ہوئے

ہیں، توآپ حضرات کو (یہاں تک کہ جن کو تابعیہ یا اقامہ مل گیا ہے) اپنے ان ملکوں کو نہیں بھولنا چاہیئے، جہاں سے آئے تھے، اور وہاں اپنے بھائیوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے وہاں رہنا مقدر فرمایا ہے، اور جن کا رزق اللہ نے وہیں رکھا ہے، ان کی زندگی وہیں گزر رہی ہے، اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، یہاں کی مشغولیت میں (خواہ معاشی مشغولیت ہو یا عبادتی مشغولیت) یہاں کے احترام اور یہاں کی محبت میں اور اپنے ملک کے لوگوں کے حالات سے واقف ہونے میں، ان کا درد محسوس کرنے میں، اور ان کی طرف سے فکر مند رہنے میں قطعاً کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ مسلمان ایک جسد واحد کی طرح ہیں، ایک جسم ہیں، ''اذا اشتکی منه عضو تداعی له سائر الجسد بالسهر والحمی'' کہ اگر کسی عضو میں تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم اسے محسوس کرتا ہے، بخار چڑھ آتا ہے، درد ہو جاتا ہے، آپ کے برصغیر ہندوپاک نے (اب تو خیر وہ دو ملک ہیں لیکن پہلے تو وہ برصغیر ہی تھا) اسلامی تاریخ کی بعض صدیوں میں عالم اسلام کی قیادت ورہبری کی ہے، عالم اسلام کو ایک نئی ایمانی طاقت اور ایک نیا اعتماد عطا کیا ہے، تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ بعض اوقات ایسا ہوا کہ کئی صدیاں ایسی گزری ہیں کہ تمام عالم اسلام پر دینی انحطاط یا ذہنی و علمی انحطاط کا بادل سایہ فگن رہا ہے، تقریباً آٹھویں صدی کے بعد ہمیں واضح طور پر یہ نظر آتا ہے، کہ وہ عرب ممالک جو اسلامی ثقافت، اسلامی تہذیب، اور اسلامی دعوت کے مرکز تھے، وہ تنزل وانحطاط کا شکار ہو گئے ہیں، اس وقت ہندستان نے اس خلاء کو پُر کیا ہے، اور ہندستان نے ایسی ہستیاں پیدا کی ہیں، جنہوں نے افغانستان، ترکستان، ایران ہی میں نہیں بلکہ ممالک عربیہ میں بھی

زندگی کی ایک نئی لہر دوڑادی ہے، اور انکا فیض ممالک عربیہ تک پہونچا ہے، خاص طور پر دسویں، گیارہویں، بارہویں، تیرہویں صدی، یہ چار صدیاں در حقیقت بر صغیر کی روحانی، علمی اور دینی ترقی کی صدیاں ہیں، جب وہاں وہ شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کی نظیر پورے عالم اسلام میں ملنی مشکل ہے۔

مثال کے طور پر میں اسوقت چند ہی نام لے سکتا ہوں، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، پھر انکے اولاد و احفاد کا پورا سلسلہ جو تقریباً سو برس تک چلتا رہا، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب، انکے بعد حضرت سید احمد شہید، حضرت شاہ اسماعیل شہید، تین صدیوں میں پورے عالم اسلام میں ان شخصیتوں کا جواب نہیں ملتا، انہوں نے اپنے ملک بلکہ اپنے عہد کے مسلمانوں کے دلوں اور سینوں کو ایک نئی ایمانی طاقت سے بھر دیا ہے، شام و ترکی کے علاقہ سے مولانا خالد رومی دہلی آئے، اور واپس جاکر عراق، شام ترکی کو ذکر الٰہی، محبت الٰہی اور ایمانی طاقت سے بھر دیا، اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور سید احمد شہیدؒ کا (جو انہیں کے خاندان کے تربیت یافتہ تھے) فیض دُور دُور پہونچا، اور ہندوستان کا تو پوچھنا ہی کیا ہے کہ لوگوں کا اندازہ ہے کہ کم سے کم تین لاکھ آدمی حضرت سید صاحب سے براہ راست فیض یاب ہوئے، اور چالیس ہزار سے زیادہ آدمی انکے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، رسوم کی جو اصلاح، بدعات کا جو رد، اتباع سنت کا جو ذوق، اور اشاعت کتاب و سنت کا جو جذبہ پیدا ہوا، پھر قرآن مجید کے تراجم کے ذریعہ سے مسلمان خاندانوں کی جو اصلاح ہوئی، اور جاہلیت سے مسلمان نکل کر صحیح اسلام کے دائرہ میں آئے، اور ان کے اندر ذوق عبادت پیدا ہوا، خدا طلبی اور حمیتِ دینی کا جو شعلہ موجزن ہوا، اس کی مثال تو دُور دُور نہیں ملتی، اپنے زمانہ کے

بڑے مبصر وباخبر عالم نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم والئی بھوپال کے بقول (جو اپنے زمانہ کے عظیم ترین مصنف اور محدث تھے) دوسرے ملکوں ترکستان اور ممالک عربیہ تک میں بھی حضرت سید صاحب جیسا صاحب تاثیر آدمی سنا نہیں گیا۔

حضرات! اس کے بعد میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج ہندوستان کی ملت اسلامیہ ہندیہ ایک نئے موڑ پر پہونچ گئی ہے، آپ حضرات کو اجمالی طور پر اس کا حال معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کے لئے ایک امتحانی گھڑی آگئی ہے، آپ جانتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ جہاں رہیں اپنے امتیازی عقائد، اپنی عبادات وفرائض، اسلامی شعائر اور اپنے ملی تشخص، اپنے مخصوص تمدن ومعاشرت اور اللہ ورسول کیساتھ مستحکم اور واضح تعلق کے ساتھ رہیں یہی رہنا معتبر ہے، اور اسی کو اسلامی اور صحیح ایمانی زندگی کہتے ہیں، اگر یہ نہیں تو پھر وہ اسلامی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں، یہ جاہلیت کی زندگی ہے، ہمارے اسلاف برابر اسکی کوشش کرتے رہے کہ مسلمان صرف جسمانی وجود اور نسل کے اعتبار سے ہندوستان میں نہ رہیں، بلکہ اپنی اسلامی شخصیت کے ساتھ رہیں، اپنی دعوت، اپنے پیغام اور اپنی خصوصیات کے ساتھ رہیں، یہ تسلسل خدا کے فضل سے ابھی تک قائم رہا۔

اس وقت اچانک ایک موڑ آیا، جس کو میں آپ حضرات کے سامنے مجملاً بیان کرنا چاہتا ہوں، آپ حضرات جانتے ہیں کہ جو قومیں اپنے مخصوص تمدن سے محروم کردی جاتی ہین، ان کا دین ان کی عبادت گاہوں، ان کی شب کی خلوتوں اور ان کی عبادت کے طریقوں کے اندر محدود ہو کر رہ جاتا ہے، پھر رفتہ رفتہ اب کا

رشتہ زندگی سے کٹ جاتا ہے، اس لئے ایک صاحبِ شریعت ملت کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ اپنے امتیازی عقائد، اور اپنی عبادات کے ساتھ رہے، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی مخصوص معاشرت و تمدن کے ساتھ رہے، اس لئے کہ ہمارے دین کا اصول یہ نہیں ہے کہ "جو خدا کا ہے وہ خدا کو دے دو، اور جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دے دو" اور "مذہب ایک پرائیویٹ معاملہ ہے اس کا تعلق باہر کی زندگی سے نہیں ہے"

جو ملتیں اپنی مخصوص معاشرت اور تمدن کے سانچوں سے محروم رہ گئیں، ملل و ادیان کی تاریخ بتاتی ہے، کہ وہ ملتیں برائے نام ان ادیان سے وابستہ رہیں، مذہب کی گرفت ان کے اوپر سے ڈھیلی ہوتے ہوتے بالکل چھوٹ گئی، اور وہ آزاد ہو گئیں، ان کے اندر الحاد اور اپنے مذہب سے بغاوت پیدا ہوئی اس لئے ہم مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم جہاں رہیں عقیدۂ توحید کے ساتھ رہیں، ایمان بالمعاد، شریعت کے اتباع بلکہ سنت کے اتباع کے شوق اور جذبہ کے ساتھ رہیں، جاہلیت سے (خواہ وہ ہمارے اندرون ملک کی جاہلیت ہو یا باہر کی جاہلیت ہو) جاہلیت قدیمہ ہو، جاہلیت مغربیہ ہو، جاہلیت علمیہ ہو، جاہلیت فکریہ ہو یا جاہلیت خلقیہ ہو، ہر قسم کی جاہلیت سے دور اور محفوظ رہیں۔

ہندوستان جیسے بر صغیر کے لئے یہ بات یوں بھی ضروری ہے کہ وہ مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا گہوارہ ہے، وہاں مسلمانوں کی ذمہ داری دوسرے ملکوں کے مقابلے میں (جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں،) بہت بڑھ جاتی ہے، اس لئے کہ وہاں ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ ان کی گرد و پیش کی آبادی اور اکثریت جس کو جمہوری نظام اقتدار اعلیٰ کا حق دیتا ہے، اور اقتدار کی مرکزیت اس کے ہاتھ میں آجاتی ہے، جہاں

سر دں کا شمار ہو تا ہے، سینوں کا اور دلوں یا صلاحیتوں کا شمار نہیں ہو تا، وہاں ایسی ملت کے لئے بڑی پیچیدگی اور بڑی نزاکت ہے، اگر اس نے اپنی بنیادی وملی خصوصیات سے ذرا بھی دستبرداری اختیار کی، اور ذرا بھی تساہل برتا، اپنے کسی عقیدہ میں مفاہمت یا سودا کرنے کا طرز عمل اختیار کیا، یا وحدت ادیان اور "ہمہ اوست" کے چکر میں پڑ گئی، یا اس نے یہ منظور کر لیا کہ ہم نماز پڑھیں گے، لیکن مسجدوں میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے اور بلند آواز سے اذان دینے سے دستبردار ہوتے ہیں تو پھر وہ ملت رفتہ رفتہ اکثریت کے مذہب اور تہذیب میں تحلیل ہو کر رہ جائے گی، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جو شریعت کے پورے مزاج داں تھے، یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "ذبح بقرہ در ہندوستان از اعظم شعائر اسلام است" یہ ان کی بصیرت تھی کہ انھوں نے کہا کہ گائے کی قربانی ہندوستان میں بہت بڑا اسلامی شعار ہے، کہیں اور ہو نہ ہو لیکن ہندستان میں اسلامی شعار ہے، اسلئے کہ گائے وہاں کا معبود ہے، اس لئے مسلمانوں نے اگر اس سے دستبرداری اختیار کی تو اس کا خطرہ ہے کہ وہ کسی زمانہ میں اس کے تقدس کے قائل ہو جائیں گے، ایسے ملکوں میں مسلمان رہنماؤں، علمائے دین، حامیانِ شریعت اور اسلام کے ترجمانوں کی ذمہ داری اضعافاً مضاعفةً ہو جاتی ہے، جہاں ہر وقت خاکم بدہن ایک تہذیبی ارتداد، پھر معاشرتی وتمدنی ارتداد، پھر معاذاللہ اعتقادی ارتداد کا خطرہ ہے، اللہ تعالیٰ درجے بلند فرمائے ہمارے ان بزرگوں، ہمارے ان دینی پیشواؤں حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ، مولانا اسماعیل شہیدؒ، مدارس عربیہ اور دینی اداروں وتحریکوں کے متوسسین کے، کہ انھوں نے ہندوستان کی ملت اسلامیہ کو اسکے شعائر کے ساتھ قائم رکھنے کی پوری کوشش کی، الحمدللہ آج ہندوسان کا

مسلمان اپنی ان تمام خصوصیات کے ساتھ باقی ہے، وہاں صرف یہی نہیں کہ اذانیں دی جارہی ہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مسلمان عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر قربانی بھی کرتے ہیں، اپنے دین کا اظہار بھی کرتے ہیں، بڑے بڑے دینی اجتماعات کرتے ہیں، اور آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت کی سب سے بڑی وسیع دعوت تبلیغ بھی وہیں سے نکلی ہے، اس کا مرکز بھی دہلی اور ہندوستان ہے۔

ان عجمی نژادوں کو یہ سعادت بھی نصیب ہوئی کہ وہ عربوں کو یاد دلائیں کہ تم سے ہم کو اسلام ملا تھا، اس لئے تمہیں سب سے زیادہ اسلام کے معاملہ میں ذکی الحس اور غیور ہونا چاہئے، تمہیں اب بھی اس کا علمبردار ہونا چاہئے الحمدللہ ساری دشواریوں، بعد مسافت اور عربی زبان کے وہاں رائج نہ ہونیکے باوجود (جو صرف مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے) اللہ نے ہندوستان کے فرزندوں کو توفیق دی کہ وہ عربوں کو خطاب کریں، قاہرہ میں خطاب کریں، دمشق میں خطاب کریں، حد یہ ہے کہ مکہ اور مدینہ میں خطاب کریں، اور عربوں سے کہیں کہ تم کو اسلام کا نمونہ بننا چاہئے، قومیت عربیہ کے خلاف سب سے زیادہ طاقتور آواز اٹھانے والے ہندوستان کے فرزند، اور عربی کے وہ نوجوان اہل قلم تھے، جنہوں نے اس زور سے اس کا صُور پھونکا کہ اس کی آواز قاہرہ اور دمشق اور مکہ ومدینہ (شرفہما اللہ) کی دیواروں سے گونجی، اور اس کا یہاں کے فضلاء وقائدین نے اعتراف کیا کہ جس جرأت ووضاحت کے ساتھ قومیت عربیہ اور تجدد وتقدمیت اور مغربیت کے خلاف ہندوستان کے عربی رسائل اور عربی کے اہل قلم نے مضامین لکھے ان کی نظیر خود عالم عربی میں بھی ملنی مشکل ہے۔

میں یہ عرض کررہا تھا کہ ہندوستان میں اچانک ایک موڑ آیا، اور وہ یہ کہ

ہندوستان کی سب سے بڑی عدالت نے جسے سپریم کورٹ (SUPREME COURT) کہتے ہیں ، ایک مسلمان مدعیہ شاہ بانو کے کیس میں یہ فیصلہ کیا کہ طلاق دینے والے کے ذمہ یہ ہے کہ مطلقہ کو جب تک وہ زندہ رہے نفقہ دے ، اور اسکی مقدار مقرر کی جو اس وقت پانچ سو روپیہ ماہانہ ہے ، جب تک وہ شادی نہ کر لے یا زندہ رہے ، اگر شادی نہ کرے تو عمر بھر دے ، یہ بظاہر تو ایک چھوٹی سی بات تھی لیکن فیصلہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے کہ "اسلام کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ اس نے عورت کو صحیح مقام نہیں بلکہ بہت ہی پست درجہ دیا ہے ، اور اسکے بعد اس فیصلہ میں "متاع" کی تشریح کی گئی ہے انگریزی ترجموں کی بنیاد پر کہ "متاع" کا مطلب کہ اس کو نفقہ برابر دیا جاتا رہے۔

اس میں خطرناک تین پہلو تھے ۔

ایک یہ کہ اس کا مطلب یہ کہ عدالت کو یہ حق ہو گا کہ وہ ہمارے مذہب میں ، ہمارے پرسنل لا (قانون احوال شخصیہ) میں مداخلت کرے ، اور اب اس ملک میں شریعت کا حکم نہیں چلے گا ، علماء کا فیصلہ اور مفتیان دین کا فتویٰ نہیں چلیگا عدالت کا فیصلہ چلے گا۔

دوسری بات یہ کہ انگریزی ترجمہ کی مدد سے ایسے لوگوں نے جو ماہرین فن نہیں ، عربی زبان سے واقف بھی نہیں ، عالم دین بھی نہیں ، قرآن کی آیات اور دینی اصطلاحات کی تشریح اپنے ذمہ لی ، یہ بڑی خطرناک بات ہے کہ قرآن مجید کی تشریح جج صاحبان کرنے لگیں ، اگر اس کا دروازہ کھلا رہا ، اور اسکو اپنے وقت پر روک نہ دیا گیا تو پھر نماز کی تشریح بھی کر دی جائے کہ دیکھئے قرآن مجید کی سورۂ توبہ

میں آتا ہے :-

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (سورۃ التوبہ ۱۰۳) ان کے مال میں سے زکوٰۃ قبول کرلو کہ اس سے تم ان کو (ظاہر میں بھی) پاک اور (باطن میں بھی) پاکیزہ کرتے ہو، اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو کہ تمہاری دعا ان کے لئے موجب تسکین ہے اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

آپ ان کے مال میں سے زکوٰۃ قبول کیجئے اور ان کے لئے دعائے خیر کیجئے، آپ کی دعائے خیر ان کے لئے باعث تسکین ہے، تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ نماز کہاں سے آئی؟ اور اسکے لئے اتنی بلند آواز سے اذان دینے سے ہماری نیند خراب ہوتی ہے، اور صبح کی اذان اور نیند خراب کرتی ہے، ہم نے مارماڈیوک پکتھال صاحب کا انگریزی ترجمہ دیکھا ہے۔ اس میں تو "صلوٰۃ" کا ترجمہ دعا سے کیا گیا ہے، اور یہ نماز کہاں سے آئی تو اگر اس کا وقت پر نوٹس نہیں لیا گیا، اور اس کو چیلنج نہیں کیا گیا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آئندہ عدالتیں قرآن مجید کے لفظوں کا سہارا لے کر اور ترجموں کی مدد سے جو چاہیں گی تشریح کریں گی، اور جیسا کہ میں نے ہندوستان میں بعض جلسوں میں کہا کہ یہ بات صرف قانون تک محدود نہیں ہے، یہ دنیا کے اس مانے ہوئے نظام کو توڑنا ہے کہ جس کا جو فن نہیں ہے، وہ اس میں دخل نہ دے، ریاضی والا فزکس میں نہ بولے، فزکس والا ریاضی میں نہ بولے، تو قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے، اور وہ عربی زبان میں نازل ہوئی ہے، اور اس کی تفسیر ان مستند فضلاء نے کی ہے، جو علوم قرآن وسنت اور عربی زبان کے ماہر تھے، اس لئے یہ ایک بڑی خطرناک بات ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ میں نے کہا کہ لکھنے والے لکھ رکھیں کہ جس طرح آج مطلوب جہیز نہ لانے پر دلہنوں کو جلایا جارہا ہے، (اور نیشنل پریس کی رپورٹ یہ ہے کہ دارالسلطنت دہلی میں ہر بارہ گھنٹے پر ایک واقعہ پیش آتا ہے) طلاق دینے کے بجائے بیویوں کو جلایا جائے گا، یا زہر دے کر مار دیا جائے گا یا رات کو انھیں کوئی ایسی دوا دے دی جائے گی کہ صبح لوگ اٹھیں تو معلوم ہو وہ مردہ ہیں، اس لئے کہ کون یہ جھنجھٹ مول لے کہ تیس برس تک، چالیس برس تک، اور اس مدت تک جس کا ابھی کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا، طلاق دینے والے شوہر پانچ سو روپیہ ماہوار دیتے رہیں اس کے بعد خود عدالت فیصلہ کرے گی کہ معیار زندگی بڑھ گیا ہے، پانچ سو روپیہ کافی نہیں ہے، یا وہ خود درخواست دے کہ پانچ سو میں ہمارا گزارہ نہیں ہو رہا ہے، ہمیں ایک ہزار ملنا چاہئے، پھر اس کے بعد وہ اس شوہر کے پاس جائیگی جس نے اسے گھر سے نکالا ہے، اور اس سے پیسے لے گی، اور اس طرح اس سے کوئی نہ کوئی رابطہ رہے گا۔

یہ چند چیزیں تھیں جو بہت خطرناک تھیں، اور مسئلہ صرف مطلقہ کا مسئلہ نہیں تھا، مسئلہ تھا شریعت میں مداخلت کا، مسئلہ تھا شریعت کے کسی حکم کی تشریح کرنے کا، اور اس کے مفہوم بتانے کا، مسئلہ تھا مسلمانوں پر ایک ایسی چیز عائد کرنے کرنے کا جو ان پر خدا اور رسول نے عائد نہیں کی، خدا کا شکر ہے اور میں آپ کو یہ خوشخبری سناتا ہوں کہ ہندوستان میں خلافت تحریک کے بعد ایسا عمومی احتجاج اور مظاہرہ ہندوستان کے اندر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا، تمام مختلف الخیال طبقے، تمام مکاتبِ فکر اور مشہور فرقے اور جماعتیں سب کے سب سو فیصدی اس پر متفق ہو گئیں۔

حکومت نے یہ بات تسلیم کرلی کہ عوام اس مسئلہ میں علماء کے ساتھ ہیں، اور مسلمانوں کی اکثریت اس مسئلہ میں یہی رائے رکھتی ہے، اور یہی چاہتی ہے، وزیر اعظم کے مشورہ واشارہ سے وزیر قانون نے نیا بل بنایا اور ان علماء کو بلا کر جو اس تحریک کے علمبردار ہیں، لفظاً بہ لفظاً سنوا لیا،

وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ ہم نے نامور علماء سے اس مسئلہ میں مشورہ کیا ہے، اور یہ بھی کہا کہ ہمیں معلوم ہوا کہ اسلامی شریعت اور اسلامی قانون عورت کے حقوق کا جو تحفظ کرتا ہے اور جو اس کو دیتا ہے وہ ہمارا قانون بھی نہیں دیتا، اور دفعہ ۱۲۵ مسلمان عورت کے حقوق کا وہ تحفظ نہیں کرتی، اور اسے وہ فائدہ نہیں پہونچاتی جو یہ بل فراہم کرتا ہے، پھر ۲۱ فروری کو یہ بل پارلیمنٹ کے ارکان کے سامنے رکھ دیا گیا، اس حد تک اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی، لیکن ابھی جدوجہد جاری ہے، جب تک وہ بل پارلیمنٹ میں باقاعدہ پیش ہو کر پاس نہ ہو جائے اس وقت تک ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، لیکن آپ حضرات کو حالات کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے اور دعا کرتے رہنا چاہئے۔

میں آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ خالص اکثریت کے ملک میں بھی مسلمانوں کو اپنے تمام ملی تشخصات، اپنے پورے تمدن ومعاشرت، اور اپنے پورے عائلی قانون کے ساتھ رہنا چاہئے، میں نے ایک جلسہ میں (جس میں بڑی تعداد میں ہندو حضرات بھی شریک تھے) کہا کہ میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ اگر مصر میں، شام میں یہاں تک کہ میں جرأت کرکے کہتا ہوں کہ خدانخواستہ حجاز مقدس اور سعودی عرب میں بھی شریعت کے خلاف کوئی قانون بنایا جائے گا تو وہاں کے مسلمانوں کا اور سب سے پہلے علماء کا فرض ہوگا کہ وہ اس کی مخالفت کریں، ہمارے

اس اختلاف، اور ہماری اس جدو جہد کا محرک یہ نہیں ہے کہ یہ ایک ایسی عدالت نے فیصلہ دیا ہے، جو غیر مسلم ہے، اور ایک ایسے ملک میں یہ فیصلہ دیا گیا ہے، جہاں کی اکثریت غیر مسلم ہے، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر کسی خالص مسلم ملک میں بھی قانون شریعت کی مخالفت کی گئی تو ہم اور وہاں کے علماء اور غیور مسلمان اس طریقے سے اس کے خلاف جدو جہد کریں گے اور سینہ سپر ہوں گے، جس طرح ہندوستان میں ہو رہے ہیں، بہت سے ہندوؤں نے اس کا اعتراف کیا، اور کہا کہ مولانا نے یہ بات انصاف کی کہی ہے، اگر معاملہ یہی ہے کہ اس کی مخالفت میں صرف یہ جذبہ کام کر رہا ہے کہ اس سے شریعت متاثر ہوتی ہے، اور مسلمان آزادی کے ساتھ اپنے مذہب پر عمل نہیں کر سکتے، اور ان کا یہی طرز عمل اور موقف مسلم اکثریت کے ملکوں میں بھی رہا تو پھر شکایت کی کوئی وجہ نہیں۔

میں نے مثال کے طور پر اس مسئلہ کو ذرا وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، لیکن میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ آپ کہیں بھی رہیں، یہاں تک کہ آپ حرمین کی سر زمین میں رہیں، آپ کو خود اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ آپ اسلامی معاشرت و اقدار کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں یا نہیں؟ آپ خود اپنے نگراں بنئے کہ آپ حرمین شریفین میں رہ کر بھی تہذیب حجازی اور معاشرت اسلامی کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں، یا مغربی تہذیب و معاشرت کے مقلد و نقال ہیں، اگر واقعہ یہ ہے کہ آپ رہتے اور کماتے تو ہیں، حجاز مقدس اور گہوارۂ اسلام (عرب) میں، مگر آپ کا رہنا سہنا، سوچنا اور برتنا اہل مغرب اور مادہ پرستوں کا سا ہے تو آپ کا حرمین میں رہنا آپ کے اس قصور کو معاف نہیں کروائے گا، بلکہ اس وجہ سے آپ کا جرم بڑھ جائیگا، کیونکہ قرآن مجید میں آتا ہے:۔

وَمَنْ یُرِدْ فِیْهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِیْمٍ (سورة الحج) اور جو شرارت اس میں (حرم میں) سے کج روی (وکفر) کرنا چاہے ہم اس کو درد دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ اور جگہ معصیت پر مواخذہ ہے لیکن حرم مکی میں (پختہ) ارادہ معصیت پر بھی مواخذہ ہوگا، اور اسی بنا پر سیدنا عبداللہ بن عباسؓ جو حبرِ امت ہیں، اور جن کو رسول اللہ ﷺ نے علم و حکمت کی دعا دی ہے، وہ مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر طائف چلے گئے اور وہیں رہے، ان کی قبر مبارک وہیں ہے۔

بھائیو! مجھے یہ دیکھ کر رنج ہوا کہ یہاں شادی کے مراسم میں بہت سی وہ چیزیں داخل ہوگئی ہیں جو ہمارے یہاں بھی معیوب تھیں، لیکن یہاں آگئی ہیں، مجلس نکاح میں کئی وہ چیزیں آگئی ہیں جو خلافِ سنت ہیں، ہم ہندوستانی، پاکستانی مسلمانوں نے جن سنتوں کو ہاتھوں سے نہیں دانتوں سے پکڑ رکھا ہے ان میں سے کتنی یہاں متروک نظر آئیں، ہم نے یہاں سے اور سنت وحدیث سے عقد کے موقعہ پر کھجور و چھوہارے تقسیم کرنا اور لٹانا سیکھا تھا، اور الحمدللہ یہ سنت ہمارے یہاں زندہ ہے، مگر یہاں اسکے بجائے ڈبوں میں مٹھائی یا کھلونے کی تقسیم دیکھی، حالانکہ ہم ان سنتوں کی پابندی پر اپنے غیر مسلم بھائیوں اور برادران وطن کے طعنے سنتے رہتے ہیں، مگر ہم ان سے دستبردار نہیں ہوتے۔

اسی طرح یہاں شادی کو اتنا پر مصارف، بلند معیار اور مشکل کام بنادیا گیا ہے، اور اس کے لئے (ہندوستان کے برخلاف) لڑکی والوں کی طرف سے ایسی شرطیں اور مطالبات رکھے جاتے ہیں کہ یہ سنت وعبادت، اور زندگی کی ناگزیر

ضرورت، ایک دشوار کام اور آزمائش بن گئی ہے، میں نے یہاں کے اخبارات میں نوجوانوں کے مضامین دیکھے ہیں جن میں اس کی شکایت اور اس حقیقت کا برملا اظہار کیا گیا ہے، اسی طرح یہاں گھروں میں وہ خلاف شریعت وسنت چیزیں، اور مغربی تمدن کی لائی ہوئی وہ جدتیں داخل ہوگئی ہیں، اور زندگی کا جزء بن گئی ہیں، جنھوں نے توجہ الی اللہ، گھروں کی دینی فضا اور بچوں کی تعلیمی یکسوئی اور ذہنی ارتکاز پر اثر ڈالا ہے، اور جن سے ہمارے ملکوں کے بہت سے خاندان اور معاشرے ابھی محفوظ ہیں۔

توخود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل!

دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جہاں بھی رکھے اپنے اور اپنے رسولؐ کے قانون اور شریعت کے مطابق زندگی گزارنے اور شعائر اسلام کی حفاظت وپابندی، تعلق باللہ اور تعلق بالشریعت کے ساتھ رکھے، ہمیں دوسری جگہ اگر اتباع سنت کی ایک دفعہ توفیق دے تو یہاں چار مرتبہ توفیق دے، اگر ہم وہاں ان سنتوں کو ہاتھوں سے پکڑیں تو یہاں دانتوں سے پکڑیں، اس لئے کہ یہاں ہماری ذمہ داری بہت زیادہ ہے، ہم اس جگہ ہیں، جہاں شریعت نازل ہوئی، اور جہاں سے شریعت تمام دنیا میں پھیلی، اور آج بھی اس کی نسبت اسی مقدس مقام، یہیں کی دعوت وپیغام، اور اسی ملک کے اُفق سے طلوع ہونے والے آفتاب اور صبح صادق سے ہے، جس نے تمام عالم کو منور کر دیا، اور کہنے والے نے بآواز بلند کہا۔ ؎

عالم تمام مطلع انوار ہوگیا

وصلی الله علی خیر خلقه سیدنا ومولانا محمد واله وصحبه اجمعین، ومن تبعهم باحسان ودعا بدعوتهم الی یوم الدین.

خواص

ملت میں ان کا مقام اور ذمہ داریاں

۲/اپریل ۱۹۷۲ء کو گھورکھپور میں خواص اور شہر کے سربرآوردہ ایک مخصوص مجلس میں یہ تقریر کی گئی تھی، جس میں طبقہ خواص کے مقام اور ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خواص

ملت میں ان کا مقام اور ذمہ داریاں

خواص کی اصطلاح

حضرات!

آپ سب حضرات کا تعلق طبقۂ خواص سے ہے یہ ایک عزت کی بات بھی ہے اور ذمہ داری کی بھی "خواص" کی اصطلاح بہت قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے، اور مذہب و تاریخ، تمدن و معاشرت اور ادب و شاعری سب میں یہ یا اس کے ہم معنی الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں، مگر اس کا صحیح مفہوم کیا ہے، اس کا اطلاق کس طبقہ پر ہوتا ہے؟ یہ بات تشریح طلب ہے، اور اس کی کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے، میں اس وقت اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

"خواص" کا جاہلی مفہوم

خواص کا ایک "جاہلی" مفہوم ہے اور ایک "اسلامی" اس کا جاہلی مفہوم یہ

ہے کہ کسی معاشرے، ملت یا ملک میں ایک ایسا طبقہ وجود میں آجائے جو ہر چیز میں عوام سے الگ ہو وہ اپنی دنیا خود بنائے اور اسی دنیا میں عمر بسر کردے، زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا معیار عوام سے بلند ہو، جہاں ایک روپے سے کام چلتا ہو، وہاں سو روپے سے کام چلائے، جو کام سادہ طریقے پر ہوتا ہو وہ دھوم دھام اور نہایت تزک واحتشام کے ساتھ انجام دیا جائے، ہر چیز میں نام ونمود اور عزت ووجاہت پیش نظر ہو، جب مسرتوں اور شادیوں کا موقع آئے تو تھیلوں کے منھ کھول دیئے جائیں اور دولت پانی کی طرح بہائی جائے اور اس میں ایسی شان وشوکت کا اظہار ہو کہ شہر میں ہفتوں اور مہینوں اس کے چرچے رہیں اور اپنی خیالی دنیا میں پوری عمر گزار دی جائے اور عوام پر جو کچھ گزرتی ہے اور جن مصائب ومشکلات سے دن رات ان کا سامنا ہے ان کی اس طبقہ کو ہوا بھی نہ لگے، کسی دینی تحریک اور کسی اصلاحی کوشش سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ ہو، ساری دلچسپیاں اپنے، اپنی اولاد اور اپنے ذاتی مفادات تک محدود ہوں جس کام سے شہرت وعزت حاصل ہوتی ہو اور حکومت وسوسائٹی کی نگاہ میں وقعت بڑھ سکے اس کے لئے اشرفیوں کی لوٹ ہو اور جس کام سے یہ مفید مقصد حاصل نہ ہوتا ہو اس کے لئے کوڑیوں پر مہر ہو، اخلاقیات میں جو بات عوام کے لئے ناجائز ہے، اس طبقہ کے لئے جائز، جو بات ان کے حق میں عیب، اس کے حق میں ہنر ہے۔

حالؔی نے اپنے زمانے کے امراء وخواص کے اسی طبقے کی تصویر ان اشعار میں کھینچی ہے۔

امیروں کا عالم نہ پوچھو کہ کیا ہے — خمیر ان کا اور ان کی طینت جدا ہے
سزا وار ہے انکو جو ناسزا ہے — روا ہے انھیں سب کہ جو ناروا ہے

شریعت ہوئی ہے نکونام ان سے

بہت فخر کرتا ہے اسلام ان سے

قرآن مجید میں "مترفین" کی اصلاح اور انکا کردار

خواص کے ایسے طبقہ کے لئے جس کی یہ سیرت اور اخلاق ہوں، قرآن مجید میں "مترفین" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، قرآن مجید نے اس کو معاشرے کے ایک مریض وفاسد گروہ کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، جو تکبر وانانیت کے مرض میں مبتلا ہے اور جو ہر نیک دعوت واصلاحی کوشش کی مخالفت میں ہمیشہ پیش پیش رہتا ہے، ارشاد ہے :۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِہٖ کٰفِرُوْنَ (سورہ سبا. ۳٤) اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے کہا کہ جو چیز دے کر تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے قائل نہیں۔

اس کو اپنی اولاد اور دولت کی کثرت پر ناز ہوتا ہے اور اس سے وہ نتیجہ نکالتا ہے کہ وہ ہر نعمت سے بہرہ ور اور ہر مصیبت وناکامی سے محفوظ رہے گا۔

وَقَالُوْا نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ (سورہ سبا. ۳۵) اور یہ بھی کہنے لگے کہ ہم بہت سامال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہم کو عذاب نہیں ہوگا۔

کبھی اس گروہ کو "اکابر مجرمین" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے جس کا کام ہی

سازش کرنا، اصلاحی کوششوں کی راہ میں مشکلات پیدا کرنا اور ان کو ناکام بنانے کی کوشش کرنا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكَابِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں بڑے بڑے مجرم پیدا کیے کہ ان میں مکاریاں کرتے رہیں اور جو مکاریاں یہ کرتے ہیں ان کا نقصان انھیں کو ہے اور وہ (اس سے) بے خبر ہیں۔

ان کا کام ہر فساد و انتشار کا ساتھ دینا ہے، ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:۔
وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (سورہ ہود. ۱۱۶) اور جو ظالم تھے وہ انہی باتوں کے پیچھے لگے رہے جن میں عیش و آرام تھا اور وہ گناہوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔

اس طبقے کا عروج، اس کی بے عنوانیاں، اس کی اخلاقی انارکی، اس کا آزادانہ طریقے سے داد عیش دینا اور ہر قسم کے حدود و قیود کو پھلانگ جانا اور اس کی خرمستی، ملکوں اور قوموں، شہروں اور بستیوں کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے، قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی بستی کی تباہی کے دن آتے ہیں، اور اس کا پیمانہ حیات لبریز ہو جاتا ہے تو پہلے اسی طبقے میں بگاڑ آتا ہے، اور وہ اپنے اعمال و اخلاق سے عذاب خداوندی کو دعوت دیتا ہے اور پوری پوری آبادی پر مصیبت لے آتا ہے، قرآن مجید اپنے خاص اسلوب میں فرماتا ہے:۔
وَاِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيْرًا اور جب ہمارا ارادہ کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ہوا تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو (فواحش) پر مامور کر دیا تو وہ نافرمانیاں کرتے رہے پھر اس

پر (عذاب کا) حکم ثابت ہو گیا اور ہم نے اسے ہلاک کر ڈالا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ (سورہ قصص ۔۵۸) اور ہم نے بہت سی بستیوں کو ہلاک کر ڈالا جو اپنی (فراخی) معیشت میں اترا رہے تھے سو یہ ان کے مکانات ہیں جو ان کے بعد آباد ہی نہیں ہوئے مگر بہت کم اور ان کے پیچھے ہم ہی انکے وارث ہوئے۔ یہ ہے خواص کا جاہلی مفہوم۔

"خواص" کا اسلامی مفہوم اور ان کی سیرت واخلاق

خواص کا اسلامی مفہوم اس سے بالکل جُدا ہے، اس سے مراد ملت اور اسلامی معاشرے کا ایک ایسا طبقہ ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے فہم وفراست کی وافر دولت عطا فرمائی ہے، اس کو ذمہ داری اور اپنے فرائض کا احساس عوام اور دوسرے طبقوں کے افراد سے زیادہ ہوتا ہے، جو اپنی قسمت کو دین وملت کی قسمت سے اور عام فلاح وبہبود سے وابستہ سمجھتا ہے، جس کا عقیدہ ہے کہ افراد کی زندگی جماعت سے ہے اور موج دریا سے باہر اپنی ہستی باقی نہیں رکھ سکتی، وہ ملت کے ہر دکھ درد میں شریک رہتے ہیں بلکہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معاشرے میں دل ودماغ کا درجہ عطا کیا ہے۔ اس لئے ان کو دل ودماغ ہی کی طرح عوام وملت کا درد سب سے پہلے اور سب سے زیادہ محسوس ہوتا ہے انکی حیثیت جب معاشرے کے جسم میں آنکھ کی ہے تو وہ اسی طرح نازک وحساس ہوتے ہیں اور ایک معمولی ذرے سے ان کے اندر کھٹک پیدا ہو جاتی ہے، وہ ملت اور معاشرے میں مقیاس الحرارہ (بیرومیٹر) کی حیثیت رکھتے ہیں کہ وہ سب سے پہلے موسم کے تغیرات اور درجہ

حرارت وبرودت کو بتاتا ہے، وہ ہر خطرے کے وقت سینہ سپر اور ملت کی پہلی صف میں نظر آتے ہیں، اور ہر نفع اور مفاد کے موقع پر ملت کی آخری صف میں دکھائی دیتے ہیں، جب خدمت وقربانی کا کوئی موقع آتا ہے اور عمل وسرگرمی کے لیے پکارا جاتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ انھیں کو آواز دی گئی ہے اور وہی مخاطب ہیں، اور انعامات اور مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کے مستحق نہیں ہیں اور ان کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے، ملی واجتماعی حادثوں کے وقت ان کی راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے، اور خواب وخور حرام ہو جاتا ہے، وہ اس کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں اوہ جب تک اس صورت حال میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی ان کے اندر سکون واعتدال پیدا نہیں ہوتا، وہ دوسروں کے حق میں حاتم اور اپنے حق میں انتہاء درجہ کے محتاط اور کفایت شعار ہوتے ہیں، اس معیار وپیمانہ کو لے کر امت کے "خاص الخاص" افراد کی زندگی کا مطالعہ کریں۔

اپنے "خواص" اور "عزیزوں" کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل

سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا مطالعہ کیا جائے، حضرت علیؓ خاندان نبوت کے ایک فرد اور محرم اسرار تھے، وہ کہتے ہیں کہ جب بڑے زور کا رَن پڑتا تھا اور گھمسان کی لڑائی ہوتی تھی تو آپ ہم لوگوں کو اور خاندان بنی ہاشم کو آگے کر دیا کرتے تھے، لڑائی کا سارا زور ہم پر پڑ جاتا تھا، میدان بدر میں جو کچھ پیش آیا وہ اس کی تصدیق کرتا ہے، جس وقت قریش کے سورما اور نامی گرامی لڑنے والے عتبہ، شیبہ، ربیعہ میدان میں نکلے اور انھوں نے مقابلہ کے لئے للکارا اور عرب

کے دستور کے مطابق "مبارز" طلبی کی تو ان کے مقابلہ کے لئے تین انصاری میدان میں آئے، انھوں نے کہا کہ شریف مقابل ہیں مگر ہم لوگ مقابلہ کے لئے اپنی برادری قریش کے جوان چاہتے ہیں جو مکہ سے آئے ہوں، آپ کو معلوم ہے کہ آپ سرداران قریش کی سپہ گری و مردانگی اور ان کے جنگی کمالات سے خوب واقف تھے، وہ قریش کی بڑی بڑی جنگوں میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھا چکے تھے اور بڑا نام پیدا کیا تھا ان کا مقابلہ کرنے کے لئے مہاجرین میں بھی بڑے بڑے آزمودہ کار سپاہی اور ان کے برابر لڑنے والے موجود تھے، جن میں سے حضرت سعدؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت ابو عبیدہؓ کا نام لیا جاسکتا ہے، جنھوں نے بعد میں پورے پورے ملک فتح کیے اور ایران وشام میں اسلام کا جھنڈا گاڑ دیا، لیکن اس موقع پر آپ نے ان میں سے کسی کو زحمت نہ دی، آپ نے اپنے تین قریب ترین عزیزوں اور افراد خاندان کو حکم دیا کہ وہ ان کے مقابلہ میں جائیں یہ کون تھے؟ ایک حقیقی چچا زاد بھائی علی ابن ابی طالب، ایک چاہنے والا اور جاں نثار چچا حمزہ اور ایک دوسرے چچازاد بھائی عبیدہ ابن الحارث، یہ بھی خیال رہے کہ حضرت علیؓ آپؐ کے داماد ہونے والے تھے اور ان کو جان بوجھ کر ہلاکت میں ڈالنا اپنی چہیتی بیٹی کے مستقبل کو خطرے میں ڈالنا تھا، ایسے موقعوں پر دامادوں کی زندگی فرزندوں کی طرح عزیز سمجھی جاتی ہے، چنانچہ یہ حضرات مقابلہ کے لیے نکلے، حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ فائز المرام زندہ سلامت واپس آئے، اور حضرت عبیدہؓ بن الحارث زخمی ہوئے، یہ اس طرزِ عمل کی ایک مثال تھی جو آپ نے اپنے خاندان اور اپنی ذات کے ساتھ اختیار کر رکھا تھا۔

دوسری مثال لیجئے آپ کو سود کی حرمت کا اعلان کرنا تھا، جس کے لیے آپ کو ایک عملی مثال پیش کرنی تھی، عرب میں جن لوگوں کا بڑے پیمانہ پر سودی کاروبار

تھا ان میں آپ کے چچا حضرت عباسؓ بھی تھے، آپ اس موقع پر کسی قریشی مہاجر اور کسی مسلمان سرمایہ دار کا نام لے سکتے تھے، جو سود کے حرام ہونے سے پہلے یہ کاروبار کرتا تھا، لیکن آپ نے اس کے لئے صرف حضرت عباسؓ کے نام کا انتخاب کیا، مجھے معلوم نہیں ہے اور غالباً سیرت کی کسی کتاب میں اس کا تذکرہ نہیں ہے کہ آپ نے ان سے پہلے ذکر فرمادیا تھا یا نہیں، آپ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں اعلان فرمایا کہ اس قانون کا سب سے پہلا اطلاق حضرت عباس ابن عبد المطلب پر ہوگا، ان کا جو کچھ مطالبہ اور سود دوسروں کے ذمہ ہے وہ کالعدم قرار دیا جاتا ہے، "واول ربا اضعه رباعباس ابن عبدالمطلب" (پہلا سود جو میں ختم کرتا ہوں وہ عباس ابن عبد المطلب کا سود ہے)

اسی طرح آپ کو یہ اعلان فرمانا تھا کہ جاہلیت (ما قبل اسلام) میں جو خون کے مطالبے چلے آرہے تھے، اور ایک مقتول کے بدلے میں قاتل قبیلہ کے کسی آدمی کا قتل کردینا جائز سمجھا جاتا تھا، میں اس جاہلی رسم کو بھی ہمیشہ کے لیے ختم کرتا ہوں اس کے لیے بھی آپ بطور نمونہ کے کسی ایسے مقتول کا نام لے سکتے تھے، جس کے خون کا بدلہ ابھی نہیں لیا گیا تھا، اور آپ کو بہت سی ایسی مثالیں مل سکتی تھیں، لیکن اس کے لیے بھی آپ نے اپنے ہی خاندان کے ربیعه ابن الحارث ابن المطلب کے بچے یعنی اپنے ایک بھتیجہ کا نام لیا، آپ نے فرمایا "وان اول دمائکم اضع دم ابن ربیعه ابن الحارث ابن عبد المطلب وکان مسترضعاً فی بنی لیث فقتله هذیل فهو اول ما بعد ابه من دماء الجاهلیة (سیرة ابن هشام جلد ٤ صـ ٢٧٥"

ترجمہ :۔ اور پہلا جاہلی خون جس کو میں ساقط کرتا ہوں وہ ربیعه ابن الحارث ابن

عبد سالمطلب کے بچہ کا خون ہے جو قبیلہ بنو لیث میں دودھ پیتا تھا، اس کو قبیلہ ہذیل نے قتل کردیا تھا، وہ جاہلیت کا پہلا خون ہے جس سے میں آغاز کرتا ہوں۔

لیکن جب زکوۃ کے مستحقین کے ذکر کا موقع آیا اور یہ بتانے کی ضرورت ہوئی کہ زکوۃ کس کس کو دی جاسکتی ہے، اور اس سے کون کون فائدہ اٹھا سکتا ہے؟ تو آپ نے اپنے خاندان بنی ہاشم اور قیامت تک ان کی نسل کو اس نفع بخش اور دائمی سلسے سے فائدہ اٹھانے سے محروم کردیا اور فرمایا کہ بنی ہاشم کو زکوۃ نہیں دی جاسکتی۔

خواص امت کا طرز عمل

آیئے اب امت کے خواص کے صف اوّل کے لوگوں کی زندگی کا جائزہ لیں ان میں سب سے پہلے رفیق غار اور خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام آتا ہے، انھوں نے جب خلافت کی ذمہ داری سنبھالی تو اپنے گزر اوقات کے لیے مسلمانوں کے بڑے اصرار سے جو روزینہ قبول کیا وہ ایسا تھا کہ جس سے کم میں شاید اس وقت کسی معمولی سے معمولی مسلمان شہری کی گزربسر نہیں ہوسکتی تھی حالانکہ وہ خلافت سے پہلے مسلمانوں کے آسودہ حال طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور مکہ ومدینہ کے ایک کامیاب تاجر تھے، اس روزینہ میں بھی ان کے احتیاط کا یہ حال تھا کہ جب ان کی اہلیہ محترمہ نے منہ کا مزہ درست کرنے کے لیے اس وظیفہ میں سے کچھ رقم حلوے کے لیے پس انداز کرلی تو انھوں نے بیت المال کے ذمہ داروں کو ہدایت کردی کہ اب اتنی رقم کاٹ کر روزینہ دیا جائے اس لئے کہ تجربے نے بتایا ہے کہ اس سے کم رقم میں ابوبکرؓ کے گھرانے کا گزر ہوسکتا ہے۔

یہ ان کی احتیاط اور طرزِ معیشت کا ایک نمونہ تھا کہ وہ طبقۂ خواص میں ہونے اور سب سے بڑے اسلامی منصب پر فائز ہونے کا مطلب یہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہ سب سے اچھا کھائیں، سب سے اچھا پہنیں اور سب سے بہتر زندگی گزاریں بلکہ اس کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ وہ سب سے کم پر قناعت کریں یا کم سے کم سب کے مساوی زندگی گزاریں۔

اب ان کے احساس ذمہ داری کا ایک اور نمونہ دیکھئے، اسلام اور ملت کو جو خطرات پیش آئے اور ان کی زندگی میں جو نازک ترین گھڑیاں آئیں، اس موقع پر ان کا احساس اور ان کا ان کے قلب ودماغ پر کیا اثر ہوتا ہے اور وہ اس کا درد اپنے جگر میں کس طرح محسوس کرتے ہیں؟ اس کے لیے ایک ہی واقعہ اور ان کا ایک ہی جملہ کافی ہے اور اسی میں ان کی سیرت کا پورا جوہر اور ان کا مزاج اور انداز فکر آگیا ہے وہ جملہ طبقۂ خواص کے لئے ایک تازیانہ اور ایک درسِ موعظت وعبرت ہے۔

جب عرب قبائل میں ارتداد کی آگ بھڑکی اور بہت سے قبائل نے صاف صاف یہ کہنا شروع کیا کہ ہم نماز، روزہ اور حج کی فرضیت کے قائل ہیں لیکن ہم زکوٰۃ کو یہ مقام دینے کے لیے تیار نہیں اور اس طرح فرائض وارکان دین میں تبدیلی کا فتنہ اور اسلام میں تحریف کا دروازہ کھل رہا تھا، تو حضرت ابوبکرؓ تڑپ اٹھے، ان کی زبان سے اس وقت جو فقرہ نکلا وہ تاریخ نے جوں کا توں محفوظ کر دیا ہے، انہوں نے فرمایا "اَیَنْقُصُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ" کیا میرے جیتے جی دین میں قطع وبرید ہو سکتی ہے، میں زندہ ہوں اور رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین میں کتر بیونت ہونے لگے؟ یہ قیامت تک نہیں ہو سکتا، بس اسی وقت اس فتنے کے سدِ باب کے لیے اور اس دروازے کو ہمیشہ کے لئے بند کرنے کے لیے اپنی جان کی

بازی لگادی اور بپھرے ہوئے شیر کی طرح میدان میں آگئے ان کی دینی غیرت اور ان کی صدیقی شجاعت واستقامت نے ہمیشہ کے لیے دین کو ایسی تحریف سے اور امت کو ایسے خطرے سے محفوظ کردیا کہ آج زکوٰۃ کارکن اسی طرح زندہ اور تابندہ ہے جس طرح نماز روزہ اور حج۔

اہل فکر وقائدین کا مقام اور ذمہ داری

ملت کو جو خطرات ومصائب پیش آتے ہیں ان میں سے بہت سے خطرات ومصائب وہ ہیں جن کو عامی اور کم پڑھے لکھے افراد بھی محسوس کرتے ہیں، ان کے احساس کے لیے کسی خاص ذہانت وفراست اور کسی خاص دُور بینی اور باریک بینی کی ضرورت نہیں ہے، مثلاً اتلاف جان ومال، فسادات وہنگامے، تنگ دستی اور بے روزگاری وغیرہ وغیرہ، لیکن کچھ خطرات اور مصائب وہ ہیں جن کو صرف وہ خواص ہی محسوس کرسکتے ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے فہم وفراست کی دولت بخشی ہے، ان کی نگاہ معاملات کی تہہ تک پہونچتی ہے، اقوام وملل کی تاریخ پر ان کی نظر ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو دینی حمیت اور ملی غیرت کا جوہر بھی عطا فرمایا ہے، وہ ان خطرات اور مصائب سے بدرجہا زیادہ معنوی خطرات اور مصائب کو محسوس کرتے ہیں، اور مستقبل کے تصور سے ان کی راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے، مثلاً ذہنی وتہذیبی ارتداد کا خطرہ اس زبان وکلچر سے محرومی جو دینی معلومات سے مالا مال اور اسلامی روح ومزاج کی حامل ہو اور جس سے نئی نسلوں کا اپنے اسلاف اور حال کا ماضی سے رشتہ قائم ہوتا ہے۔ نیا نظام تعلیم جس کے اثر سے مسلمانوں کی نئی نسل کا اسلامی تعلیمات سے ناآشنا اور خلاف اسلام اور منافی توحید عقائد وافکار سے متاثر ہونا بالکل

قدرتی امر ہے، مسلمانوں کی اپنی مستقل شخصیت اور ملی خصائص اور اسلامی تہذیب سے محرومی اور اکثریت کی تہذیب، فلسفہ اور شخصیت میں تحلیل ہو جانے کا خطرہ ہے، یہ وہ خطرات ہیں جن کی سنگینی کو صرف طبقۂ خواص کے لوگ ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ وہ اکثر اقبالؔ کے الفاظ میں اس طرح گویا ہوتے ہیں ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

قرآن شریف کی آیت ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ. "اے ایمان والو! صبر کرو ایکدوسرے کو صبر کی ترغیب دو اور مورچوں پر جمے رہو اور ہر حال میں خدا سے ڈرتے رہو تاکہ (اپنے مقصد میں) کامیاب ہو۔"

اس آیت میں "اصبروا" کے ساتھ "صابروا" کی ہدایت و تلقین کی حکمت اور اس کا راز بڑا غور طلب ہے، اقوام و ملل کی زندگی اور قوموں کے عروج و زوال کے مسئلہ میں صرف انفرادی صبر و استقامت کافی نہیں ہوتی، اجتماعی صبر و استقامت اور ہمت و استقلال کی ایک عام فضا اور ماحول کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر فرد دوسرے فرد کے لیے باعث تقویت، اس کا پشت پناہ اپنی جگہ پر صابر و مستقیم اور دوسروں کے لیے صبر و استقامت کا داعی و مبلغ ہو، اس کی زندگی، اس کا ایمان و یقین، اس کا صبر و توکل، اس کا عزم و حوصلہ، اس کا بلند کردار، دوسروں میں اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ اور ان کے لیے مشعل راہ ہو، اس کو دیکھ کر اکھڑتے ہوئے قدم جم جائیں، افسردہ طبیعتیں اور پست ہمتیں بلند و مستحکم ہو جائیں، اس فضا میں بے ہمتی اور بے صبری کی بات کہنا اور کرنا ایسا ہی مشکل

ہو جائے اور معیوب سمجھا ئے جیسے تردد و تذبذب کے ماحول اور خوف و ہراس کے عالم میں صبر و ہمت کی تلقین اور ثبات واستقامت کی ہدایت۔

حفاظت دین وملت کا مورچہ

پھر فرمایا" ورابطوا" (اور مورچوں پر جمے رہو) اس موقع پر یاد رکھنا چاہئے کہ مورچے دو طرح کے ہوتے ہیں ایک فوجی اور زمینی مورچہ، دوسرے معنوی مورچہ، فوجی و زمینی مورچہ بھی بہت اہم ہے، اور زندہ و غیور قومیں اس پر گھٹنے ٹیک دیتی ہیں اور اس کی حفاظت میں جان کی بازی لگادیتی ہیں، مگر یہ مورچہ قومی زندگی میں فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتا، قوموں کی زندگی میں میدان جنگ کی شکست یا کسی مورچے سے پسپائی ان کی قسمت پر مہر نہیں لگادیتی، دنیا میں قومیں شکست بھی کھاتی رہی ہیں، اور فتح بھی حاصل کرتی رہی ہیں، اپنے مورچوں سے ہٹتی بھی رہی ہیں، اور ان کو واپس بھی لیتی رہی ہیں، عہد نبویؐ، دورِ صحابہؓ اور و تاریخ اسلام کے ہر عہد میں یہ نشیب و فراز اور یہ سرد وگرم پیش آتے رہے ہیں اور جو قوم اس نشیب و فراز سے نہیں گزرتی اور شکست کی تلخی سے اس کے کام و دہن کبھی آشنا نہیں ہوتے وہ صرف فتح کی لذت وحلاوت سے آشنا ہوتی ہے اس قوم کی صلاحیت پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اس لیے قوموں کی تربیت کیلیے یہ دونوں تجربے ضروری ہیں اور خدا نے اپنے محبوب پیغمبر اور س کے برگزیدہ اصحاب کو ان دونوں راستوں سے گزارا ہے۔

لیکن معنوی مورچوں کا معاملہ ان سے بالکل مختلف ہے، کسی معنوی مورچہ پر شکست و پسپائی بعض اوقات صدیوں و ہزاروں برس کا فیصلہ کردیتی ہے

اور بعض اوقات اس سے کسی قوم وملت کی قسمت پر مہر لگ جاتی ہے، آج ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ کو یہی معنوی مورچہ در پیش ہے، ملت کی جداگانہ شخصیت کا مورچہ، اسلام کی مستقل تہذیب کا مورچہ، اسلام کے عائلی قانون (پرسنل لا) کا مسئلہ، زبان وکلچر کا مسئلہ، آئندہ نسلوں کی تعلیم کا مورچہ، ان مورچوں کی حفاظت "خواص" ہی کر سکتے ہیں، اس کے لیے جس علم، جس فہم، جس احساس، جس دروں بینی، اور حقیقت شناسی اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے جن وسائل وذرائع کی ضرورت ہے، وہ اسی طبقہ کے پاس ہیں، ان کی بروقت فرض شناسی اور مستعدی، ان کی بے چینی اور دردمندی مدتوں کے لیے اس خطرہ کو ٹال سکتی ہے، اور ملت کو اس خطرے سے محفوظ بنا سکتی ہے اور ان کی ذرا سی غفلت وسستی ملت کے قافلہ کو سالوں اور صدیوں کے حساب سے منزل سے دُور کر سکتی ہے، انہوں نے اگر اپنے ذاتی مقاصد ومفادات کو ملت کے مفاد پر، اپنی ذات کو پیش آنے والے دُور ازکار خطرات کو ملت کے حقیقی خطرات پر ترجیح دی تو ان مورچوں پر شکست یقینی ہے ؎

رفتم کہ خارا ز پاکشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

ملت کے نمائندوں کی کمزوری کا خمیازہ

ان خواص کی جو صرف اپنی دولت، تمول، کاروبار اور نسبی وخاندانی تفوق کی وجہ سے طبقہ' خواص میں سمجھے جاتے ہیں، اور معاشرے میں "بڑے آدمی" کہلاتے ہیں، ملت کے مفادات وضروریات سے غفلت اور چشم پوشی، اسراف بے جا، دولت کا غلط استعمال اور ملت فراموشی کا اثر، ملت اور اس کے مستقبل پر اتنا

اثرانداز نہیں ہوتا اور اس کی قسمت کا فیصلہ اس طرح نہیں کرتا جس طرح ملت کے ان نمائندوں، زعماء و قائدین، ممتاز اہل فکر، اور دانشور طبقہ کی وہ کمزوری کرتی ہے، جس کو اگر ہم ان کے احترام میں ملت فروشی نہ کہیں تو ملت فراموشی کہنے پر مجبور ہیں۔

یہ طبقہ جو اپنے دل کی آواز، ملت کی پکار، اور ضمیر کے تقاضے کے بجائے اپنے ذاتی مفادات اور شخصی کامیابیوں کو ترجیح دیتا ہے، اور جاہ پرستی و حصول اقتدار کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور اسی کو زندگی کا نصب العین اور ترقی کی معراج سمجھنے لگتا ہے، حق بات کہنے میں اس کی زبان گنگ، اور اس کے لب بستہ ہوتے ہیں، بڑے بڑے ملی مصائب کے وقت بھی اس کے اندر حمیت و غیرت کا کوئی جذبہ انگڑائی نہیں لیتا، اور اس کو ظالم کو ظالم کہنے کی توفیق نہیں ہوتی، وہ اپنی نشست محفوظ رکھنے، اپنے عہدے اور اعزاز کو برقرار رکھنے یا اس کے حصول کے لیے بڑے سے بڑے ملی نقصان کو برداشت اور بڑے سے بڑے المیہ کو انگیز کر لیتا ہے، بڑے سے بڑے محضر قتل پر دستخط کرنے میں اس کو باک نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات اپنے ایک موہوم فائدے اور محدود و عارضی جاہ و اقتدار کے لیے پوری ملت کو خطرے میں گرفتار اور اس کے بڑے سے بڑے مقدس اثاثہ اور ورثہ کا سودا کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، اقبالؔ نے "شیخ حرم" کہہ کر اسی طبقہ کی تصویر کھینچی ہے، جس کے ہاتھ میں بدقسمتی سے ملت کی قیادت و نمائندگی آجاتی ہے، وہ کہتے ہیں ؎

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادرِ زہراؓ

ملتوں اور قوموں کی تاریخ اور خصوصیت کے ساتھ اس ملت کی تاریخ

شاہد ہے کہ اسی طبقہ کی ضمیر فروشی، یا بے ضمیری، مفاد پرستی، جاہ طلبی اور اقتدار کی ہوس نے بڑی بڑی مستحکم اور طویل العمر سلطنتوں کا چراغ گُل کر دیا، اور پوری ملت کو آن کی آن میں ذلیل کر کے رکھ دیا، خلافت عباسیہ کا خاتمہ، بغداد کی تباہی، بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ، سلطنت مغلیہ کا زوال، میسور کی ابھرتی ہوئی طاقت کا خاتمہ اور ٹیپو کی ناکامی، ترکوں کی شکست اور مقامات مقدسہ اور ممالک عربیہ کا اتحادیوں کے زیر اثر آنا، سب اسی طبقہ کی ملت فروشی، جاہ و اقتدار کی ہوس اور انانیت کا نتیجہ ہے۔

ملت کے نمائندوں اور منتخب افراد کی ذمہ داری

ایک جمہوری، آزاد و ترقی یافتہ ملک میں یہ اچھا یا برا کردار ملت کی حفاظت یا ملت کی ہلاکت کا پارٹ "خواص" کا وہ طبقہ ادا کرتا ہے جو مجالس قانون ساز پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں اس ملت کا نمائندہ یا حکومت و انتظامیہ میں بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر فائز ہوتا ہے، یا صحافت و سیاست میں اونچا مقام رکھتا ہے، یا ملک کے دانشوروں، اہل قلم اور مفکرین میں انکا شمار ہوتا ہے، اسی طبقہ کا ایک ایک فرد ہزاروں، لاکھوں کے مقابلے میں زیادہ وزن و اعتبار رکھتا ہے۔

اس طبقہ کی دینی حمیت و ملی غیرت، اخلاقی جرأت، معمولی قربانیاں، صدیوں کے لیے ملت کا مستقبل محفوظ کر دیتی ہیں، اور جو کام بعض اوقات لاکھوں کروڑوں انسان انجام نہیں دے سکتے، وہ یہ مٹھی بھر جماعت انجام دے دیتی ہے، وہ اگر کسی ملی مسئلہ پر یک زبان و یک آواز ہو جائے اور ملت کے دین، اس کی تہذیب یا اس کی ثقافت اور کلچر، یا اس کے قانون و شریعت کو بچانے، یا ملت کو باعزت بااصول

رکھنے کے لیے اپنے ذاتی مفاد کو ٹھکرا دیتے ہیں اور اقتدار کی کرسی اور جاہ واعزاز سے دستبردار ہو جانے کا ارادہ ظاہر کرتے، ایوان ہائے قانون ساز کی رکنیت، صدارتیں اور قیادتیں، عہدے اور اس مقصد عزیز کے سامنے پر کاہ کے برابر بھی نہ معلوم ہو، تو چشم زدن میں بڑے بڑے فیصلے بدل جائیں، ناممکن ممکن ہو جائے، خطرے کے پہاڑ اور چٹانیں ریت کے ذرات میں تبدیل ہو جائیں............اور پوری ملت، عزت وتوقیر، شرف واعتبار سے ہم کنار ہو۔

لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے، ان کو ملت کے اجتماعی مفاد کے مقابلے میں اپنی کرسی عزیز ہوتی ہے اور اپنا مفاد مقدم، ان کو ادنیٰ سے ادنیٰ خطرہ مول لینے کی جرأت نہیں ہوتی، یا حکومت واکثریت کی پیشانی پر ادنیٰ سی شکن پڑنے کی ہمت نہیں ہوتی، وہ اپنے حقیر فائدے کے لئے ملت کے بڑے سے بڑے نقصان، اس کی تہذیب کا زوال، اور اس کے ذہنی ودینی ارتداد تک کو گوارا کر لیتے ہیں، اور ملت کے تمام مفادات، اس کی موت وحیات کے مسئلے سے آنکھیں بند کر کے اپنے منصوبوں کی تکمیل، اپنے خوابوں کی تعبیر، اور اپنے محلوں کی تعمیر میں لگے رہتے ہیں، اور کوئی بڑے سے بڑا واقعہ یا حوادث کا تازیانہ، ان کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کیلیے کافی نہیں ہوتا، تو پھر اس ملت کی قسمت پر مہر لگ جاتی ہے اور اس کے بڑے سے بڑے مخلص وناصح اور چارہ گر ومسیحا اس کے درد کی دوا نہیں کر سکتے۔

یہاں آکے دیتا ہے رو ابر نسیاں

☆☆☆

خطبات مفکر اسلام

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

جلد دوم

کی

جھلکیاں

☆نزول قرآن کا مقصد اور حاملین قرآن کی ذمہ داریاں۔

☆آئندہ نسلوں اور پسماندگان کے صحیح العقیدہ رہنے کی ضمانت۔

☆ صحیح دینی تعلیم وتربیت کے انتظام کے سلسلہ میں والدین اور سرپرستوں کی ذمہ داری۔

☆اعلیٰ اخلاقی قدریں دل کے اندر کھوئی ہیں، ان کی باہر تلاش ہے۔

☆ دنیا میں آنے والے انسان چمن کے کانٹے یا پھول۔

☆دنیا کی موجودہ کشمکش یہ نہیں کہ برائی دور ہو، بلکہ یہ ہے کہ برائی ہماری نگرانی اور انتظام میں ہو۔

☆اسلام ایک تغیر پزیر دنیا میں۔

نوٹ :۔ ان عنوانات کے تحت خطبات کے علاوہ دیگر بہت سے شاہکار خطبات اس حصہ میں شامل ہیں۔

ملنے کا پتہ :۔

مکتبہ ایوب کاکوری۔ لکھنئو ۲۲۶۰۱۷

خطبات مفکر اسلام کی جمع وترتیب اور اشاعت کے ساتھ ساتھ

ہمارا اگلا پروگرام۔

مقالاتِ مفکر اسلام

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

کی

کئی جلدوں میں اشاعت ہے، آپ اپنا تعاون پیش

کریں۔ اور ہم سے رابطہ قائم کریں۔ مقالات مفکرِ

اسلام کی کتابت کا کام تیزی سے جاری ہے۔

رابطہ اور خط وکتابت درج ذیل پتہ پر کریں۔

(۱) دارالقلم ڈھاکہ، کاکوری، لکھنئو ۲۲۷۱۰۷

(۲) مکتبہ ایوب کاکوری۔ لکھنئو ۲۲۷۱۰۷

ہماری مطبوعات

﴿از قلم حضرت مولانا محمد کاظم صاحب ندوی﴾

تقریر سیکھنے اور سکھانیوالی کتابیں

تقریر کیسے کریں؟ ۵ حصے ☆تبلیغی واصلاحی تقریریں
☆ آسان تقریریں ۳ حصے ☆ جدید معیاری تقریریں ۴ حصے
☆ بے نظیر تقریریں ☆ جدید دینی تقریریں ۳ حصے
☆الخطب الدینیۃ الجدیدۃ دو حصے (عربی) ☆ کیف تکون خطیباً دو حصے (عربی)
☆کن خطیباً ☆ مولینا محمد علی جوہر کی آخری فکر انگیز تقریر،
☆خطباتِ مفکر اسلام

☆ مصنف کی دیگر دینی واصلاحی کتب ☆

نماز کیسے پڑھیں ؟ اردو ہندی (یہ دونوں کتابیں پاکٹ سائز میں بھی دستیاب ہیں

عورت اسلام سے پہلے اور اسلام میں (ایک تقابلی مطالعہ)

سیرت حضرت مخدوم شاہ میناؒ لکھنوی (مجلد و غیر مجلد)

اسلام کے چار رکن	روزہ کی شرعی حیثیت	داڑھی کی حقیقت
تعارف کلمۂ طیبہ	حج کی شرعی حیثیت	حقوق والدین
نماز کی شرعی حیثیت	پڑوسی کے حقوق	حقوق زوجین
زکوٰۃ کی شرعی حیثیت	دس جنتی	آداب السلام
اسلامی مساوات	رسول اکرم ہجرت سے پہلے اور بعد، ہادیٔ اعظم	
مساجد اور اسلام	یہ تھیں امت مسلمہ کی مائیں	مقالات مفکر اسلام

(نعتیہ مجموعے) فردوس، زمزمۂ نعت، عقیدت کے پھول۔

مکتبہ ایوّب کاکوری لکھنؤ ۲۲۶۰۱۷